

پاکستان نمبر)

درآمد
۱۹۶۲

کراچی

قیمت فی کاپی پچاس روپے ۵۱

The Nigar Office,

شماره خصوصی

پاکستان

جو "نگار" کی کھپلی ۲۶ سال کی خدمات کی یاد میں

جوبلی نمبر

کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے

قیمت فی کاپی تین روپے

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

مرزا غائب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا گھر دنیا آجکل سے

نگار گلابی مسد

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشک، قوام، دانہ الایچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم

کے پان مسالوں کو مشرقی نفاس اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی فون: ”ہوڑہ ۵۵۵“

ٹیلی گرام: ”مشکی قوام ہوڑہ“

نگار گلابی برائے زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

نگار کا سالانہ چندہ اب چھ روپیہ ہو گیا ہے
ملاحظہ ہوا اعلان صفحہ ۸

نگار

مدیر خصوصی :- نیاز فتحپوری

شمارہ - ۲۰۱

جنوری و فروری ۱۹۴۸ء

جلد - ۵۳

۱۱۸	سلطان ابراہیم لودھی
۱۱۹	علوم اسلامی پر ایک مورخانہ نظر
۱۲۹	حکومت اسلام اور سنسکرت
۱۳۱	عجم کے کارنامے اسلام کے عہد زریں میں
۱۴۰	شاہجہاں اور اورنگ زیب کا ضبط اوقات
۱۴۶	انڈس کے آثار علمیہ
۱۵۲	فتون لطیفہ اور اسلام
۱۵۸	آلات اور تمدن
۱۶۳	یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر
۱۶۱	عہد وسطی کے فتون لطیفہ اور اسلام
۱۸۰	مسلمانوں کی اولین جمہوریت
۱۸۴	قدیم تمدن اسلام کی تازگی
۱۹۰	موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں
۱۹۴	فن رقص اور تاریخ اسلام
۲۰۸	تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل
۲۱۵	خواتین عرب کی فیشن طرزیاں
۲۲۲	عرب شعرا کا اثر جمہور پر
۲۲۵	عہد اسلام پر گنیزوں کا اثر و اقتدار
۲۳۳	پیغبروں کے لطایف
۲۴۰	اشترار

۴	سال نو کا پیغام
۵	پیش لفظ
۱۲	تاریخ سندھ کے اہم واقعات
۱۵	سندھ میں مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت
۳۵	سندھ کے مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام
۴۱	غزنوی عہد پر تبصرہ
۵۷	ہندوستان کے بعض مسلم بادشاہوں کے خصوصیات حکمرانی
۵۸	شہاب الدین محمد غوری
۵۹	قطب الدین ایبک
۶۲	شمس الدین التمش
۶۳	رضیہ سلطان
۶۴	ناصر الدین محمود شاہ
۶۵	غیاث الدین بلبن
۷۱	جلال الدین فیروز شاہ
۷۵	سلطان علاؤ الدین خلجی
۸۴	غیاث الدین تغلق
۸۵	محمد بن تغلق شاہ
۹۲	سلطان فیروز شاہ
۱۰۹	بہلول لودھی
۱۱۰	سکندر لودھی

پاکستان کے مسلمانوں کے نام

سالِ نو کا پیغام

آسائشیں دو گیتی تفسیر ہیں دو حرف ست

باد و ستاں تملط باد و شمنانِ مدارا

نگار کی پرانی جلدیں مکمل

۱۹۵۷ء جلد دوم جولائی تا دسمبر سے ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء
۱۹۴۵ء کی مکمل جلدیں پورے سال کی قیمت بارہ روپیہ فی فائین سالانہ علاوہ محصول - منیجر ”نگار“

پیش لفظ

نگار ۲۲ء میں جاری ہوا تھا اس لئے ۱۹۷۱ء کے اختتام پر اس کی عمر ۲ سال کی ہو چکی تھی اور شنگے کا پہلا پرچہ جولائی نمبر کی حیثیت سے شائع ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اب میں کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ شنگے میرے لئے کس درد و کرب کا سال تھا۔ جنوری ۱۹۷۲ء کی ۲۴ تاریخ تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میری رفیقہ حیات ایک ایسے مرض میں مبتلا ہیں جس کا علاج اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکا اور میرے لئے یہ بتانا بہت مشکل ہو گا کہ اس خبر کو منکر مجھ پر کیا گزر گئی۔ دُنیا میں موت تکلیف کی چیز نہیں بلکہ دراصل اس کا خیال تکلیف دہ ہوتا ہے، ایک قاتل کی سزا قطع سر نہیں ہوا کرتی بلکہ اصل سزا حکم قصاص ہے اور رات کی وہ چند گھنٹیاں جو اس خیال میں بسر کرنا پڑتی ہیں کہ صبح کو رشتہ حیات ہمیشہ کے لئے قطع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو حالت اس سے زیادہ سخت تھی، کیونکہ موت یقینی تھی اور انتظار موت کی کوئی میعاد معین نہ تھی، میں شب و روز کے ہر لمحہ میں موت کے جنگل کو آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا اس حال میں کہ نہ میں مریضہ کو اس سے بچا سکتا تھا اور نہ قضا اس کھیل کو جلد ختم کر دینے پر آمادہ تھی۔

امیدیں قطع ہوتی جا رہی تھیں، دُنیا کے تمام سہارے ختم ہو رہے تھے اور میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی طوفانی موج سامنے سے آ رہی ہو اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہو۔ پھر یہ موج آ کر رہی اور میری تنہا متاع حیات کو چھین کر لے ہی گئی۔

اس لئے اندازہ کیجئے کہ جس شخص کی رگیں مسلسل آٹھ ماہ اسی طرح آہستہ آہستہ ٹوٹتی رہی ہوں، اس کا کیا عالم ہو گا اور اس سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھ سکے گا۔ تاہم میں نے نگار کو جاری رکھا اور ایک بار بھی اپنا درد و دکھ قارئین نگار کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن میرے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ پورا شنگے اس عالم سکرات میں گزرنے کے بعد شنگے کے آفات میں جولائی نمبر شائع کر سکتا، پھر بھی اشاعت سالانہ کی رسم میں نے قائم رکھی اور ناچرواہین کا المٹاک اشیانہ خصوصیت کے ساتھ اسی لئے منتخب کیا گیا کہ وہ میری ماترزدگی کی صحیح تصویر تھا اور میں اپنے آنسوؤں کے ساتھ قارئین نگار کے بھی کچھ آنسوؤں کو ناپا ہوتا تھا۔ شنگے میں یقیناً میرے کرب و اضطراب کی نوعیت بدلی لیکن اس سے زیادہ کچھ فرق نہ ہوا کہ جو آنسو پہلے گرم ٹپکتے تھے،

۱۔ اس مرض کو طبی اصطلاح میں دم دبغ یا دماغی ناکارہت کہہ سکتے ہیں، جس میں غریب کے سرخ ذرات ختم ہونے لگتے

ہیں اور سفید ذرات بڑھتے بڑھتے انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔

اب وہ سر رہیں، جن زخموں سے پہلے خون جاری تھا وہ اب ناسور ہیں پہلے درد و کرب کسی کر دٹ چین نہ لینے دیتا تھا، اب یاس مجبوری میں کر دٹ لینے کی بھی ہمت نہیں۔ پہلے دل میں آگ تھی اور میں اس آگ سے اپنے آپ کو جلتے ہوئے محسوس کرتا تھا لیکن اب می سوزم و از سوختن خود خبرم نیست

دنیا میرے لئے اب محض "نقش و نگار طاق نسیاں" ہے اور زندگی کا مفہوم موت کے انتظار کے سوا کچھ نہیں — ظاہر ہے کہ ان حالات میں اب یا کبھی میں جو بلی نمبر کی اشاعت کا خیال دل میں نہ لاسکتا تھا جو تقریب مسرت کی چیز ہے، لیکن چونکہ مسلسل ۲ سال سے وقت مقررہ پر ایک کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اس لئے اس دوران میں بلا ارادہ نگار کے معمولی پرچے بھی شایع ہوتے رہے، کچھ نہ کچھ میں لکھتا بھی رہا اور اب سالنامہ بھی پیش کر رہا ہوں، جس کو آپ اس کا جو بلی نمبر کہہ سکتے ہیں۔

شعبہ ہندوستان کے لئے بڑا عجیب و غریب سال تھا، اور مشکل سے تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال مل سکے گی جس میں سعادت و خوشی دونوں ایک ہی وقت میں اس شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریباں دیکھنے میں آئی ہوں۔ خوش بختی و سعادت تو یہ کہ صدیوں کی پڑی ہوئی زنجیر غلامی قطع ہوئی اور بد بختی و نحوست یہ کہ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے اور خونریزی کے وہ مناظر سامنے آئے کہ ہلاکو و چنگیز کا عہد بھی فراموش ہو گیا۔

ہندوستان و پاکستان میں اکثر مقامات پر ہر فرد اپنی جگہ پریشاں حال و مضطرب ہو گیا، اور سماج کے وہ تمام روابط، جو ملک کی تمدنی زندگی کے لئے ضروری ہیں پارہ پارہ ہو گئے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں نگار کو بھی متاثر ہونا تھا اور وہ ہوا، لیکن پھر بھی مینے مناسب نہ سمجھا کہ جس شمارہ خصوصی کی اشاعت کا وعدہ کیا گیا تھا اسے کسی اور وقت پر ملتوی کیا جائے۔ اور مینے پاکستان نمبر کا اعلان کر دیا، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ اول تو میں یوں بھی دوسروں سے التجائے تحریر کرتے شرماتا ہوں اور اگر میں ایسا کرتا بھی تو اس پریشانی کے دور میں کون توجہ کرتا، اس لئے پورا پرچہ مجھ کو اپنے ہی مضامین سے پُر کرنا تھا اور یہ موضوع ایسا تھا جس پر میں آسانی کے ساتھ اپنے مقالات پیش کر سکتا تھا، دوسرے یہ کہ موجودہ دور ابتلا میں کسی ادبی موضوع کے لئے کسی اشاعت کو مخصوص کر دینا یوں بھی بے محل تھا، بنا برائ میں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی قائم کی ہوئی نئی حکومت "پاکستان" ہی کو مخاطب کیا جائے۔

پھر اس خطاب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ میں حصول پاکستان کی جدوجہد پر روشنی ڈالتا اور اس کے جواز یا عدم جواز پر بحث کرتا، دوسری یہ کہ میں پاکستان کے مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی چیز پیش کرتا، جو اس نوزائیدہ حکومت اسلامی کے لئے دلیل راہ ہو سکے اور اس کے سامنے دور ماضی کی اسلامی حکومتوں کے ان واقعات و حالات کو پیش کیا جائے جن سے مسلمانوں کا بلند نظری، کشادہ دلی، بے قصبی، علوئے اخلاق اور دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اگر دولت پاکستان ترقی کر سکتی ہے (جہاں رہی انتہائی تناسل) تو انھیں اصول کو سامنے رکھ کر جو پیشرو اسلامی حکومتوں نے متعین کئے تھے اور جن کو سامنے رکھ کر بادیہ نشینان عرب نے بھی سیاست و ملک گیری، علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت میں وہ غیر معمولی ترقی کی جس کے

نقوش ابھی تک محو نہیں ہو سکے۔

چونکہ حکومت پاکستان کا مرکز بھی سندھ ہے، جہاں سب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی، اس لئے ابتدا میں اسی سرزمین کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت کن رواداریوں پر قائم تھی اور غیر مسلم آبادی کے ساتھ انھوں نے کس بلند نظری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد غزنوی عہد کو لیا گیا ہے جس کا تعلق زیادہ تر پنجاب سے تھا اور بتایا گیا ہے کہ اس عہد کے مسلمان فرمانرواؤں کی سیاست ملکی کتنی بلند تھی اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ کتنی فیاضی سے کام لیا۔ اسی سلسلہ میں بہت سے ان مسلم بادشاہوں کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے جنہوں نے صدیوں تک ہندوستان میں حکومت کی اور جو اپنے عدل و انصاف، پاکیزہ نظم و نسق اور مذہبی رواداریوں کے غیر فانی نقوش اپنے بعد چھوڑ گئے۔

پھر چونکہ حکومت و سیاست کے ساتھ ساتھ حکومت اسلامی کے تمدنی و ثقافتی نقطہ نظر کو بھی پیش کرنا ضروری تھا اس لئے اس شمارہ میں وہ مقالات بھی نظر آئیں گے جن سے اسلامی حکومتوں کے آداب و معاشرت، علوم و فنون کی ترقی اور مختصر عائد ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح یہ شمارہ گویا ایک تاریخی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا مقصود تمدن اسلامی کی تاریخ کو پیش کر کے پاکستان دارکان دوست پاکستان سے اپیل کرنا ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی قدیم روایات اسلام کو فراموش نہ کریں اور بلا لحاظ اس کے کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے قلم و میں غیر مسلموں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ان کے اسلاف نے کیا تھا اور اپنے عدل و انصاف اور اپنی بلند نظری سے سرزمین پاکستان کو واقعی جنت ارضی بنادیں۔

چونکہ میں مذہبی اختلاف و نزاع کا ہمیشہ سے مخالفت رہا ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ مذہب اسلام سے زیادہ امن پسند مذہب کوئی نہیں، اس لئے میرا فرض تھا کہ موجودہ حالات میں جب کہ ہندو مسلم نزاع نے نہایت کمزور صورت اختیار کر لی ہے، جو بلی نمبر بھی خالص اصلاحی موضوع کے لئے وقف کردوں اور اگر میں ہندوؤں سے کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا تو اپنی آواز کم از کم اس جماعت تک تو ضرور پہنچا دوں جس کے ایک فرد ہونے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے۔

اس لئے میں یہ اشاعت، پاکستان کے ساتھ منسوب کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وہ ان کے رہنے والے، وہاں کے ارباب قلم اور ارکان حکومت موجودہ سیاسی و مذہبی اختلافات کی تنگ دنیا سے بلند ہو کر محض اخلاقی، تاریخی و علمی نقطہ نظر سے اس کا مطالعہ کریں گے اور اگر اس طرح میں کسی ایک دل میں بھی کوئی حقیقی جذبہ امن پسندی کا پیدا کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصود پورا ہو گیا اور میری محنت بیکار نہیں گئی۔

ہم جانتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں ہر سب جہاتوں کی جماعت مسلمانوں کی سخت دشمن ہے اور وہ چاہتی ہے کہ پاکستان کے تمام ہندو یہاں چلے آئیں اور ہندوستان کے تمام مسلمان پاکستان چلے جائیں، لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی تو یہ ایسی ذلت ہوگی جسے ہندوستان برداشت کر لے تو کرے لیکن پاکستان کو کبھی برداشت کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ طریق عمل نہ صرف یہ کہ اسلامی روایات کے منافی ہوگا بلکہ سیاسی و اقتصادی مصالح بھی اس کی اجازت نہ دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ دونوں حکومتوں کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور اب کشمیر کے مسئلہ نے تو اس کشیدگی کو زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز حد تک پہنچا دیا ہے، لیکن اس کشیدگی کو دور کرنے کی جو تدبیر اختیار کی گئی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے لئے باعث توہین ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ ”مجلس اقوام“ جس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جسکی دیانت غیر مشتبہ ہو۔ اس کو ایشیا و ہندوستان کسی سے ہمدردی نہیں ہے اور ان کے ہر فیصلہ کا رجحان زیادہ تر امریکہ و برطانیہ ہی کے مفاد کی طرف ہوتا ہے، اور چونکہ پاکستان و ہندوستان کا اتحاد ان کے اغراض کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا بیکار ہے کہ وہ کشمیر کے باب میں بھی کوئی ایسا فیصلہ کریں گے جو ہندوستان و پاکستان کی موجودہ کشیدگی کو دور کر سکے۔ برطانیہ، ہندوستان کے متعلق پہلے ہی سے پورا نقشہ طیار کر چکا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر وہ بساط سیاست پر اپنی فہروں کو حرکت دے رہا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اس کی پہلی چال تھی اور صوبوں کی حد بندی دوسری چال، اب کشمیر کے مسئلہ میں جو وہ تیسری چال چلے گا وہ بھی اس کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ اسی چال پر یہ بازی ختم ہو جائے، اور ہندوستان و پاکستان دونوں آپس میں لڑ کر تباہ ہو جائیں۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو پھر کیا ہوگا، یقیناً معاملہ اسی حد تک پہنچ کر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ دنیا میں ایک امد ہولناک جنگ شروع ہوگی جس میں ایک فریق روس ہوگا، دوسرا امریکہ و برطانیہ اور پھر انھیں میں سے کسی کا طوق غلامی ہندوستان کو اپنے گلے میں ڈالنا پڑے گا۔

یہ توہین وہ خطرات جنکے پیش آنے کا قوی امکان ہے، لیکن انھیں تاریک بادلوں میں ہمیں روشنی کی بھی ایک جھلک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان و پاکستان دونوں اپنی اپنی جگہ جنگ کے نتائج سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ ہر امکان کو کشش اس بات کی کریں گے کہ نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ تمام زمینی مسائل سلجھ جائیں اور لڑائی کی فوج نہ آئے۔ ”مجلس اقوام“ کی طرف سے اس وقت تک جتنے بیانات شائع ہوئے ہیں، ان کا رجحان بھی قریب قریب من و صلح پسندی کی طرف ہے، لیکن ہم کو ”مجلس اقوام“ کے اقوال پر زیادہ اعتماد نہ کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کی کوئی ایسی شرط قرار دے جس سے یہاں زیادہ الجھنیں پیدا ہو جائیں اور ان سے فائدہ اٹھا کر وہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات کو اور زیادہ خراب کر دے۔ اس لئے ہندوستان و پاکستان اگر اپنے جھگڑے کو مجلس اقوام کے ذریعہ سے طے کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی جگہ اس بات کا بھی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر اسکی طرف سے کوئی ایسی بات پیدا کی جائے جسے الجھنوں کے اور زیادہ بڑھنے کا اندیشہ ہو، تو وہ اس دام فریب میں نہ پھنسیں گے اور اس حقیقت کو فراموش نہ کریں گے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کے تعلقات دوستانہ رہیں اور ملکی سیاست کو وہ نہ ہی تفریق و نزاع سے متاثر نہ ہونے دیں۔

نیاز

ہم نے دوران جنگ میں بھی ”نگار“ کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن اب کافڈ کی گرانی و کمیابی، طباعت کی دشواری اور مصارف عملہ کی غیر معمولی زیادتی سے مجبور ہو کر نگار کے سالانہ چندہ میں ایک روپیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے اور آئندہ جو صاحب نگار کا وہی پی طلب فرمائیں گے ان کو چھ روپیہ چار آنے کا وہی پی بھیجا جائے گا۔ لیکن جو حضرات جو بلی نمبر سے اپنی خریداری شروع کریں گے ان سے چندہ صرف پانچ روپیہ لیا جائے گا، البتہ جو بلی نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ان کو زیادہ دینی پڑے گی۔

مینبر ”نگار“

تہذیب

تہذیب ہند کی قدامت | اگر تہذیب و مدنیت کی دنیا میں، افریقہ و ریاستے نیل کی وادیوں پر، اور مشرقی افریقہ و بحر و فرات سے سیراب ہونے والی زمین پر مقرر کر سکتا ہے، تو مشرقی بعید بھی، مقصد بابل کے دوش بدوش، ہندوستان کے اُن میدانوں اور کوہستانوں کو پیش کر سکتا ہے، جہاں (عہد قدیم کے) اُس دور میں، جب یونان و روم کی تہذیب، مستقبل بعید کی تاریکی میں معدوم تھی، جب طرائق اور مہتما کی بنیاد کو بھی زمین نے قبول نہ کیا تھا، جب داؤد کے نعروں سے دنیا نا آشنا تھی، جب ہومر کے گیتوں سے زمانہ آگاہ نہ تھا، جب کہ گرج کے پیدا ہونے کو پورے چار ہزار برس باقی تھے، جبکہ ابراہیم خلیل اللہ کسی تذکرہ کو توڑ کر دین حنیف کی بنیاد ڈالنے کے لئے دنیا میں آئے تھے) اگر آریہ قوم کے مز ایک لو ائے فتح و نصرت پلڑے ہوئے تھے تو دوسری طرف ان کی عورتیں اپنے بچوں کو وہ لوریاں سنایا کرتی تھیں، جو بعد کو روم و یونان کے عہد زریں میں اُن کے علم الاصلنام کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔

تاریخ ہند کے ساتھ اہل مغرب کا سلوک | ظاہر ہے کہ جو ملک اپنی تاریخی حیثیت سے اس قدر قدیم ہوگا جس کی آبادی اپنی تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اس درجہ پیش رفت ہوگی اس کی تاریخ کا سراغ آج جیکہ تقریباً چھ ہزار برس کا زمانہ گزر گیا ہے، کیا کچھ دلچسپ نہ ہوگا اور اُس کی داستان اپنے اند کیا کیا عجائبات و غرائب رکھتی ہوگی۔ لیکن دنیا کا ایسا افسوسناک واقعہ ہے کہ مغرب جسے عہد حاضر میں اپنی ترقی و علم و حکمت پر ہزاروں نائیں اور جو اپنی تحقیق و تنقید کے زعم پر سرخبر معلوم ہے، کو اساطیر علم میں لے آئے کا دعویٰ ہے، اس وقت تک ہندوستان کو اس سے زیادہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ”ایک مہم ہے ناقابل فہم“ اور ”ایک راز ہے سرست“۔

حقیقت یہ ہے کہ مسایل شرق میں مغرب کی تحقیق جستجو ہے، مادہ کی روحانیت کی دنیا میں، اور اس لئے اس دور مادہ پرستی میں یورپ شاید وہ نگاہ حقیقت شناس جس سے دنیا کے صحیح اخلاق دیکھے جاسکتے ہیں، پیدا نہیں کر سکتا اور اسی لئے مغرب کے نزدیک نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرق جہل و تاریکی کی دنیا ہے، اور اُسے یہاں ابھرتی پرستی کے

ہوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یورپ کے اکثر مورخین نے جو حالت و صورت مشرق اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی پیش کی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک خوشخوار ہستی جس کا دل جذباتِ سفاکی و بیرحمی سے لبریز ہے، سر پر آرائے سلطنت ہے چاروں طرف خوشامد کرنے والے اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، رعایا کو تباہ کر کے خزانہ بھرا جا رہا ہے، لہو و لعب، سیر و تفریح یا حرم کی اندرونی زندگی پر بے دریغ دولت صرف کی جا رہی ہے، درباریوں نے اپنی زمین بوسی اور جبہ سائیوں سے اس کے آستانہ کو بارگاہِ خداوندی سے ملا دیا ہے، اور وہ اگر کبھی شراب کے نشہ سے چونک پڑتا ہے تو سوائے جور و ظلم کے اُس سے اور کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ اُس کے پاس دماغ ہے نہ دل نہ وہ سوچ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے، روحانیت سے اسے سروکار نہیں، اتقانِ ذہنی سے اُسے واسطہ نہیں، نہ اُسے علوم و فنون کی ترقی کی طرف توجہ ہے نہ ملک کی فلاح و بہبودی کا خیال۔ الغرض وہ جہل و غرور بیدردی و بیرحمی، خوشخوابی و سفاکی کا ایسا زبردست مجسمہ ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا وہ شخص جس نے مشرق کی تاریخ کا غایر مطالعہ کیا ہے، اس بیان میں صداقت کا کوئی شائبہ پاسکتا ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ لحاظ تاریخ اس وقت تک ہندوستان پر تین دور گزر چکے ہیں۔ پہلا دور وہ جس میں دو قومیں بحیثیت قوم ہونے کے باہم متصادم ہوئیں۔ دوسرا دور وہ جب دو مذہب ایک دوسرے سے ٹکرائے اور تیسرا دور وہ جب ہندوستان نے اپنے کو ایک اجنبی قوم کی حکومت میں دیر پا۔ دورِ اول، جب آریہ قوم نے ہندوستان کی قدیم آبادی کو مفتوح کیا اور دو برٹانٹ، جب مغرب کا اقتدار قائم ہوا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ دو برٹانی یعنی مسلمانوں کا دور حکومت ہمارا موضوع ہے اور اسی عہد کی نمایاں خصوصیات اس وقت پیش کی جاتی ہیں۔

مسلمان فرمانرواؤں کا طرز حکومت | یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ نے نہ صرف یہاں کی معاشرتی و سیاسی فضا کو بدلدیا، بلکہ ذوقِ علم و تہذیب میں بھی زبردست انقلاب پیدا کر دیا جس کے نشانات سرزمینِ ہند پر ہر جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اسلام کی تعلیمات سے سرمو انحراف نہیں کیا، ہم اس کے بھی قائل نہیں کہ یہاں کا ہر مسلمان فرمانروا اپنے عہد کا جتید و شبلی تھا، اس نے کبھی کوئی ظلم و ستم نہیں کیا، مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ جو کچھ مسلمان فرمانرواؤں نے ہند اور اہل ہند کے ساتھ کیا، جس حد تک انھوں نے ہندوستان کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا اور جس قدر اسباب ترقی باشندگانِ ہند کے لئے انھوں نے فراہم کئے وہ دوسری حکمران قوموں کے لئے ہر طرح قابل تقلید ہیں۔

تسلط سے قبل مسلمانوں کی سختی ضروری تھی | یقیناً جب ہمالیہ کی طرف سے مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تو ہندوستان کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اور اہل ہند کے

جذبات کو بھی شدید سدھ پہنچا۔ ان کے قدیم مدارس و معابد تباہ ہوئے، ان کے اسلاف کی بہت سی یادگاریں خا ہویں، ان کا امن و سکون تباہ ہوا۔ لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ اُس وقت تک مسلمانوں کی مستقل حکومت ہندوستان میں قائم نہ ہوئی تھی ان وہ زمانہ جو حملہ اور قیام سلطنت کے درمیان بسر ہوتا ہے، ہمیشہ اسی نوع کی تکالیف و مصائب کا ہوا کرتا ہے۔

مسلمان ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اہل ہند مقابلہ کر رہے تھے۔ مسلمان جو ہندوؤں کے مذہب سے بالکل مختلف مذہب رکھتے تھے بالکل جدید خیالات و اعتقادات کو روشناس کرنا چاہتے تھے اور ہندو ان سے سخت نفرت تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ مختلف عناصر کے تصادم میں ہمیشہ شور و ہنگامہ ہی کرتا ہے اور اس کا علاج مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔

مرتبہ سرزمین ہمارا شتر سے خرچ کر کے صرف دکن تک پہنچتے ہیں اور وہ سب کچھ کھردکھاتے ہیں جو دنیا میں ایک ظالم ترین قوم کی طرف سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ لیکن محمد کی بڑی شگنی آج یورپ کی بدولت ہرجیہ کی زبان پر ہے اور مسلمان عورتوں کی وہ آبروریزیوں جن کی یاد تقریباً دکن کی ہر مقدس مسجد کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے کسی کو نہیں معلوم۔

وہ شخص جس نے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے سمجھ سکتا ہے کہ جب ڈیڑھ دو صدی کے بعد مسلمانوں کا تسلط اچھی طرح

قیام سلطنت کے بعد مسلمانوں کی رواداری

قائم ہو گیا، جب حقیقی معنی میں اسلامی سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو پھر کھچلا، امن و سکون عود کر آیا اور ہندو کو تمام وہ مراعات دی گئیں جو ایک غیر متعصب فرمانروا کی طرف سے دی جا سکتی ہیں۔ ان کے معابد محفوظ رکھے گئے۔ انکی جاگیریں بحال کی گئیں، ان کے مدارس کو سرکاری امداد دی گئی، نظام حکومت میں انھیں نمایاں حصہ دیا گیا، ان کے جذبات مذہبی کا خاص لحاظ رکھا گیا اور میدان ترقی میں فاتح و مفتوح، حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا گیا۔ جس کی متعدد مثالیں آپ آئندہ صفحات میں پائیں گے۔

شہوانیات کیا ہے؟

منجلہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں ۱۔

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا۔ شادی، طلاق و خلع۔ مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔

استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالنفس۔ استلذاذ بالوحوش۔ فحاشی عہد قدیم میں۔

فحاشی قرون وسطیٰ میں۔ عہد جدید اور فحاشی۔ اخلاق جنسی۔

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر مبنی جامع تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر آئے گا۔ حضرت نیازی

ساہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہ ہے۔

حجم ۱۶۶ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ۔ منیجر نگار ہیکل انجینی لکھنؤ

تاریخ سندھ کے اہم واقعات

(۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک)

سندھ نام اس قطعہ زمین کا ہے جو دریائے سندھ (قدیم سندھو) کے ڈلتا اور اس کی پختی وادی پر مشتمل ہے۔
 ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۰۰ قبل مسیح تک یہاں آریہ قوم آباد تھی اور انھیں کی حکومت تھی۔ لیکن جب دارا نے اس کو فتح کیا تو یہ
 فارس کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم نے ۳۲۵ قبل مسیح میں حملہ کر کے فارس کی حکومت کو ختم کر دیا۔ سکندر کی
 روانگی کے بعد سندھ پہلے سلطنت *Mauromyan* میں شامل ہو گیا اور پھر *Bactrian* یونانیوں کی حکومت میں۔
 پہلی صدی قبل مسیح سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک وسط ایشیاء کی مختلف جنگجو قوموں نے تاخت کی اور آخر کار انھیں میں سے
 ایک قوم جسے *Ephthalites* یا *Hephthalites* کہتے ہیں یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئی اور اس نے
 اپنی حکومت قائم کر لی جسے رائے خاندان کی حکومت کہتے ہیں۔

اس خاندان کو چچ برہمن نے ختم کیا جو رائے حکومت میں وزیر کی حیثیت رکھتا تھا اور جب محمد بن قاسم ثقفی نے (اموی خلیفہ ولید
 کے زمانہ میں) سندھ پر حملہ کیا تو چچ کا بیٹا داسر یہاں حکمران تھا۔

محمد بن قاسم نے دو سال کے اندر پھر گاہ بہ گاہ (کراچی)، ٹرانکوٹ (حیدر آباد)، آلور (پایہ تخت) اور ملتان کو تسخیر کر لیا۔
 لیکن وہ اس مفتوحہ علاقہ کا ٹھیک انتظام نہ کر چکا تھا کہ ولید کے بعد سلیمان خلیفہ ہوئے اور انھوں نے محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا۔
 کیونکہ وہ حجاج کے آدمی تھے اور حجاج سے سلیمان سخت ہریم تھے۔ اسکے بعد متعدد مسلمان گورنر یہاں رہے لیکن اموی خلافت کا اثر یہاں
 روز بروز ضعیف ہوتا گیا یہاں تک کہ ۷۵۵ء میں بالکل ختم ہو گیا اور دو عرب سرداروں نے ملتان اور منصورہ میں اپنی مستقل حکومتیں قائم کر لیں۔
 جب محمود غزنوی نے حملہ کیا تو انھوں نے فتح داؤد، سندھ اور ملتان کا گورنر تھا، لیکن چونکہ یہ قرامطہ کی جماعت سے تعلق

۱۰۰۰ء میں قرامطہ کی لڑائی کے بعد عربوں کی جن جماعتوں نے زیریں حصہ عراق میں مستبدانہ حکومت کے خلاف سر اٹھایا تھا انھیں قرامطہ کہتے ہیں
 ان کی تحریک ایک نوع کی اشتراکی تحریک تھی جو نویں صدی ہجری سے لیکر بارہویں صدی تک بغداد و خراسان وغیرہ تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی اور
 سلطنت اسلام کی بنیاد متزلزل کر گئی۔

رکھتا تھا، اس لئے محمود نے اسے معزول کر کے اپنا گورنر مقرر کیا۔

۱۵۳۰ء میں ایک راجپوت قوم سمرا نے زیریں وادی میں اپنی حکومت قائم کر لی لیکن بالائی حصہ بدستور غزنویوں کے پاس رہا۔ جسے بعد کو معز الدین بن سام نے فتح کر کے غوری حکومت میں شامل کر لیا۔ لیکن اس کے نائب ناصر الدین قباچہ نے قطب الدین ایبک فرار ہوئے دہلی کی اطاعت قبول کر لی۔ جب قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش تخت نشین ہوا تو قباچہ نے اطاعت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن التمش نے اس کو زیر کر لیا۔

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں علاؤ الدین خلجی کی فوجوں نے حملہ کر کے سمرا خاندان کو بھی ختم کر دیا لیکن ۱۳۳۳ء میں ایک اور راجپوت قوم سٹامپو مسلمان ہو گئی تھی یہاں کی حکمران بن گئی اور جام کا لقب دے کر اس نے اپنے سردار کو یہاں کا فرمان روا بنادیا۔

۱۳۵۱ء میں جب سندھ میں بغاوت ہوئی تو محمد بن تغلق نے چڑھائی کر دی لیکن اسکی عمر نے وفات کی اس کے بعد اس کے جانشین فیروز تغلق نے سٹامپو خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا۔

بعد کو جب دہلی کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا تو سٹامپو خاندان کو پھر عروج ہوا، جس میں جام نند یا نظام الدین نے ۱۵۰۹ء تک ۴۶ سال حکومت کی۔

۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے (جسے بابر نے قندھار سے نکال دیا تھا) سندھ پہنچ کر سٹامپو خاندان کے آخری فرمانروا جام فیروز کو گجرات کی طرف بھگا دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ ہمایوں نے دوبارہ سندھ کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

شاہ حسن کی وفات پر ۱۵۵۷ء حوالہ عون خاندان کا آخری بادشاہ تھا، ایک دوسرا خاندان ترخان یہاں کا حکمران ہو گیا، لیکن ۱۵۹۲ء میں آگرہ کے آخری حکمران مرزا جانی بیگ ترخان کو شکست دیکر اس حصہ زمین کو صوبہ ملتان میں شامل کر دیا۔

زیریں حصہ سندھ میں سترھویں صدی تک داؤد پتر خاندان برسر اقتدار رہا لیکن ۱۷۱۷ء میں کلہوڑا خاندان نے اس کو شکار پور سے نکال دیا اور اورنگ زیب سے بہت بڑی جاگیر معافی کی حاصل کر لی۔ اس کے بعد ۴۴ سال تک ان کی قوت بڑھتی رہی لیکن ۱۷۶۲ء میں نور محمد کلہوڑا سے نادر شاہ خفا ہو گیا اور دریائے سندھ کے مغربی ساحل کا علاقہ مع شکار پور اور سیٹی کے چھین لیا۔ ۱۷۷۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے نور محمد کو جیسلمیر کی طرف بھگا دیا۔ لیکن اس کے بیٹے محمد مراد پارخان نے احمد شاہ کو رافسی کر کے پھر اپنا کھو ہوا علاقہ واپس لے لیا۔

۱۷۶۵ء میں اس کے بھائی نظام شاہ نے نرنکوٹ کے گھنڈرہل پر حیدر آباد کی بنیاد قائم کی۔ ۱۷۷۵ء کے بعد بلوچوں کے ایک قبیلہ ٹاپپور نے بغاوت کی اور کلہوڑا خاندان کے فرمانروا نے اس قبیلہ کا ایک شخص اپنا حذر مقرر کر کے فتنہ کو دبا

دیا۔ لیکن ۱۸۴۱ء میں یہ قتل ہو گیا تو اس کے بیٹے عبداللہ خاں نے، عبداللہ بی کو جو کلہوڑا خاندان کا آخری فرمانروا تھا، قلات کی طرف بھگا دیا۔ اس کے بعد جب عبداللہ بی نے پھر اپنا کھویا ہوا تخت واپس لیا تو عبداللہ خاں کو قتل کرا دیا۔ لیکن اس کے ایک عزیز میر فتح علی نے عبداللہ بی کو شکست دیکر جو دھپور کی طرف بھگا دیا اور ۱۸۴۳ء میں اپنی حکومت قائم کر لی جو بعد کو خاندان کے مختلف افراد میں تقسیم ہو کر حیدر آباد۔ میرپور اور خیرپور تین جگہ بٹ گئی۔

۱۸۳۸ء میں جب پہلی افغان لڑائی ہوئی تو سندھ کی اول الذکر دو حکومتوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کر کے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا، لیکن ۱۸۴۳ء میں سرچارلس نیپرنے انھیں شکست دی اور انکا علاقہ انگریزی حکومت میں شامل کر لیا۔ میر علی مراد خیرپور کا فرمانروا انگریزوں کا وفادار رہا اس لئے اس کا علاقہ بحال رکھا گیا۔

اس کے بعد سے سندھ برطانوی حکومت میں شامل رہا اور اب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پورے ایک سو چار سال کے بعد پاکستان کی مسلم حکومت میں شامل ہو گیا۔

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

”من ویدواں“

چھاپنی انشاء عالیہ اور پر زور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزہ ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنی میں

انجیل انسانیت

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں براہمپ کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر، جسطرح تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔

جسم ۶۴۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دہیز۔ جلد خوشنما۔ قیمت علاوہ محصول سات روپے آٹھ آنے۔

مینجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

سندھ میں مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت

اہل عرب مغربی ہند کے سواحل سے بے خبر نہ تھے کیونکہ زمانہ قدیم سے عرب کے تاجروں کی آمد و رفت یہاں پائی جاتی تھی اور یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کر کے دریائے سندھ کے دہانہ تک اور وہاں سے تپہ اور کمبایت (Cambray) اور کبھی کبھی کالی کٹ (Calicut) و ساحل مالابار کی دیگر بندرگاہوں تک پہنچ جاتے تھے، لیکن فوجی مہم سب سے پہلے ۱۱۵۰ء میں ساحل ہند پر روانہ کی گئی جو دبئی کے قریب تھا۔ یہ قباض ہو کر پھر قریب تک پہنچ گئی اور اس کے بعد خلیج فارس کے عربوں نے متعدد بار ساحل ہند پر اپنی فوجیں بھیلا دیں، لیکن ان سب کا شمار ”فوجی تاخت“ میں تھا۔ باقاعدہ جنگ سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔

عربوں کا سب سے پہلا باقاعدہ حملہ ہندوستان پر مکران کی طرف سے ہوا جو انتہائے مشرق میں خلافت کا ایک دور دراز صوبہ تھا اور چونکہ سرحد ہند پر کوئی قدرتی مانع موجود نہ تھا، اس لئے مکران کے گورنروں نے متعدد بار حملے کئے لیکن ان حملوں نے بھی ہندوستان میں کسی سلطنت کی بنیاد نہیں ڈالی اور نہ عرب سپاہ اندرون ملک میں اقتدار حاصل کر سکی۔ آخر کار خلافت بنی امیہ میں حجاج نے اس جانب توجہ کی اور اس نے ایک طرف حدود و آثار میں قتیہ کو نامزد کیا اور دوسری طرف محمد قاسم کو ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔

محمد قاسم کے حملہ سندھ کا افسانہ حقیقتاً ایک تاریخی رومان (Romance) ہے۔ ہندوستان کی حالت تھی کہ اس وقت تک عربوں کا یہاں گزر نہیں ہوا تھا، آبادی سخت جنگجو تھی اور اس کے اخلاق و اطوار مذہبی عقائد اور معاشرتی خصایل عربوں کے عادات و معتقدات سے بالکل مختلف تھے۔ مرکز خلافت اور اس کے درمیان کوہستانوں، دریاؤں، اور صحراؤں کا غیر متناہی سلسلہ حائل تھا۔ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کی گئی اور ایک نوجوان عرب جس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور جس کو نبرد آزمانی کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا، اس اہم خدمت پر مامور کر دیا گیا اور وہ صرف چند ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔

جس وقت محمد قاسم، مکران ہوتا ہوا ساحل فارس پر پہنچا تو وہاں کا گورنر بھی اپنی سپاہ لیکر شریک ہو گیا اور حقیقتیں بھی محاصرہ کے لئے دریا کے راستہ سے دیبل پہنچ گئیں۔

۹۳ھ کے موسم بہار میں محمد قاسم نے خندقیں کھود کر منہجیقین نصب کیں اور دیپل کا محاصرہ کر لیا۔

فتح دیپل کے بعد محمد قاسم نے چار ہزار سپاہی دیپل میں چھوڑے اور خود بقیہ سپاہ کے ساتھ دریائے سندھ کے دائیں ساحل

بجہ پر دشمن کی مرکزی فوج کی فکر میں روانہ ہوا۔ آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ دشمن کی چوکیاں دوسری طرف ہیں۔ اس لئے اس نے بہت سی

کشتیاں ایک دوسرے سے پاندھ کر پل سا طیار کرایا اور ان میں تیر اندازوں کو بٹھا کر دوسری طرف پہنچایا۔ دشمن نے کوشش

کی کہ اسلامی فوج ساحل پر نہ اتر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور اسے مجبوراً اور تک پسپا ہو جانا پڑا، جہاں سب سے پہلے عربوں

نے ہندو سرداروں کی کثیر جماعت (جو آہن پوش ہاتھیوں پر سوار تھے) مقابلہ کے لئے آمادہ دیکھی، و آہر راجہ ان سب کا سردار تھا۔

محمد قاسم نے حکم دیا کہ پتھروں کے ذریعہ سے روغن نطف ہاتھیوں پر پھینکا جائے۔ اس ترکیب سے ہاتھی ڈر کر بھاگے، ہندو

میں آگ لگ گئی اور راجہ و آہر مارا گیا۔

اس کے بعد دوسری فتح برہمن آباد میں ہوئی اور اب ملتان کا راستہ صاف ہو گیا، جہاں محاصرہ کر کے اس کو بھی مفتوح

کر لیا۔ چونکہ ملتان فتح ہو جانے سے دریائے سندھ کی وادی پر پورا اقتدار مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا اور ہندو فرمانرواؤں نے

لے دیپل، کراچی، ٹھٹہ، لاہور، بندر، میر معصوم نے دیپل، ٹھٹہ اور لاہور میں ایک ہی مقام قرار دیا ہے۔ اسی طرح فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ قیام

دیپل موجودہ ٹھٹہ ہے۔ موجودہ عہد کے مؤرخین بھی اس طرف گئے ہیں۔ چنانچہ ایرانی بھی ٹھٹہ کے شمال کو ”شالی دیپلی“ کہتے ہیں۔ بلاذری نے بھی خلیج دیپل کا

ذکر کرتے ہوئے جہازوں کا یہاں آنا بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ دیپل سمندر کے ساحل پر ایک بڑا بندر ہے۔ صاحب مہاجر الاطراف نے

بھی تحریر کیا ہے کہ دیپل ساحل بحر ہند کا مشہور بندر اور بڑی تجارت گاہ ہے۔ اس سے یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ دیپل ساحل پر واقع تھا اور موجود

کراچی کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔

برہمن آباد، منصورہ، محفوظ۔ فتوحات عرب سے قبل زیریں حصہ سندھ کا دار الحکومت برہمن آباد تھا۔ اس مقام کا قیام نام حسب

روایت بیرونی، بہمنی، یا بہمنوا تھا۔ اشکال البلاد میں ”بامی دان“ لکھا ہے ابن حوقل ”تامی ران“ اور ”تامی ران“ لکھتا ہے۔

اور لیبی نے ”میران“ مصنف چچ نامہ نے ”بین داد“ اور مصنف تاریخ طابری نے ”بین دآہ“ تحریر کیا ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ برہمن آباد سے مراد کالا کوٹ ہے۔ سچے نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے مشرقی جانب آباد

تھا اس لئے حسب تحقیق مسٹر الیٹ، کالا کوٹ اور ٹھٹہ کا قیاس غلط ہے بلکہ برہمن آباد وہیں یا اس کے قریب کسی جگہ پر واقع تھا جہاں اب حیدر آباد ہے۔

بلاذری کا بیان ہے کہ منصورہ، برہمن آباد سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اور محمد قاسم کے عہد میں برہمن آباد میں کرجل

ہو گیا تھا، اس لئے گمان غالب ہے کہ منصورہ میں برہمن آباد کے کھنڈروں کا ایک حصہ ضرور شامل ہو گیا ہوگا چونکہ حیدر آباد وہ وقت مرتفع

سطح کی پہاڑی پر واقع ہے اور اس سے زیادہ نمایاں مقام تعمیر دار الحکومت کے لئے اور کوئی نہ ہو سکتا تھا، اس لئے یہ ظن یقین میں آتی ہے

ہو جاتا ہے کہ برہمن آباد، منصورہ اور موجودہ حیدر آباد (سندھ) ایک ہی چیز ہیں۔ یا یہ کہ ایک ہی قطعہ زمین میں تینوں شہر تعمیر ہوئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ ہو)

وہاں کے لوگوں پر بہت مظالم کر رکھے تھے اس لئے جاٹ، مہید اور دوسری قومیں اظہار اطاعت میں ڈھول اور گھنٹیاں بجاتی ہوئی حاضر آئیں اور مطیع ہو گئیں۔ محمد قاسم نے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور ان کے تمام معاہدے بکسر باقی رکھے کے علاوہ اس کے برہمنوں کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے۔

محمد قاسم نے اپنے تمام افسروں کو نہایت سختی سے حکم دیا کہ راہی و رعایا کے درمیان پوری ایمانداری کا طرز عمل اختیار کیا جائے جو جس کا حصہ ہے دیانت سے دیا جائے، محصول اتنا مقرر نہ کیا جائے جو لوگوں کے لئے بار ہو، اور نہ کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اسی زمانہ میں حجاج کا انتقال ہو گیا اور خلافت بھی بدل گئی جو حجاج کی مخالف تھی، اسی لئے محمد قاسم کو واپس جانا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ عربوں کا سندھ فتح کر لینا تاریخ ہند کے اہم واقعات میں سے ہے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا کیونکہ خود مرکز خلافت میں اختلاف باہمی کی وجہ سے صنعت پیدا ہو گیا تھا اور محمد قاسم کے بعد کوئی مہم اس طرف روانہ نہیں کی گئی، جو فتوحات کے سلسلہ کو سندھ کے ریگستانوں سے آگے بڑھا دیتی۔ بالآخر جو جماعت مسلمانوں کی یہاں رہ گئی تھی اس میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶) حال ہی حیدر آباد سے ۴ میل شمال مشرق کی طرف ایک کھنڈ زمین سے برآمد ہوا ہے جسکی نسبت آثار میں کا خیال ہے کہ یہ برہمن آباد کے کھنڈ ہیں، بہت سے سنگے بھی منصور، عبدالرحمن، محمد، عبداللہ اور عمر کے عہد کے دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ کوئی ہندوؤں کا سکہ برآمد نہیں ہوا ہے اس لئے اس کو برہمن آباد یقین کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔

محمود کا صحیح مقام نہیں معلوم ہو سکا سولے اس کے کہ ابن حوقل اور بیرونی اس کے جائے وقوع کو دیپائے سندھ کی مشرقی دلدل سے اور منصورہ کو مغربی دلدل سے متعلق کرتے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں امیر قاسم نے ایک شہر ناصر پور کے نام سے سندھ میں تعمیر کرایا تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ ناصر پور یا تو محفوظ ہی کا دوسرا نام ہے یا اسی جگہ دوسرا شہر تعمیر کر کے اس کا نام ناصر پور رکھ دیا گیا۔

۱۔ جب مسلمان اول اول سندھ میں آئے تو یہاں دو قومیں کثرت سے آباد تھیں، جاٹ اور مہید اور ان دونوں میں سخت اختلاف تھا۔ مہیدوں کا اصلی مسکن پنجاب تھا اور جاٹوں کا سندھ (مہر چند اپ جاٹ پنجاب کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں اور اور تقریباً اکثر مسلمان ہیں)

مہیدوں کا ذکر عرب مؤرخین نے اکثر جگہ کیا ہے۔ محل التواریخ میں جاٹ اور مہید قوموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ حام بن نوح کی اولاد میں سے شمار کئے جاتے تھے اور دریائے سندھ کے ساحل پر آباد تھے مہیدوں اور جاٹوں میں اکثر لڑائی رہا کرتی تھی مجبوراً رفع فساد کی غرض سے ان دونوں نے اتحاد کر کے دریودھن بادشاہ ہستنا پور کے پاس ایک وفد روانہ کیا کہ کوئی حکمران ان پر مقرر کرے چنانچہ اس نے اپنی بہن دھالا کو وہاں حکومت کرنے کے لئے متعین کیا۔ اسی سلسلہ میں تیس ہزار برہمن بھی ہندوستان سے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہو گئے۔

مسلمانوں کی رواداری

محمد قاسم کی دہلی

بھی اس قدر ضعف پیدا ہو گیا کہ بیس سال بعد انھیں خود اپنی حفاظت و پناہ کے لئے ایک خاص شہر محفوظ کے نام سے بنانا پڑا اور خلفاء بغداد نے مقدمہ کے قبضہ کو غیر مفید سمجھ کر اس طرف توجہ نہ کی۔

بعد کو مستعمرین عرب نے یہاں ملتان اور منصوریہ میں علاوہ علاوہ خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ اور جب چوتھی صدی ہجری کے ابتدا میں مسعودی یہاں آیا ہے تو قبیلہ قریش کا ایک خاندان اس جگہ حکمران تھا۔ اس کے چند دن بعد ایک اور سیاح ابن حوقل سندھ میں آیا اس نے لکھا ہے کہ ”اس وقت سندھ میں عربی اور سندھی زبان بولی جاتی تھی اور ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلق پایا جاتا تھا۔“

اس کے بعد جب مصر میں خلفاء کا عروج ہوا تو قرامطہ وہاں سے بھاگ کر یہاں آئے اور ملتان میں پناہ گزین ہوئے لیکن محمود غزنوی کے حملہ نے ان کی قوت کو بھی گھٹا دیا۔

یہ تھا اجمالی بیان مسلمانوں کے حملہ سندھ کا۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ حملہ کی ابتدا سے یہاں کون کون سے گورنر خلافت کی طرف سے متعین کئے گئے یہاں کی حکومت اسلام میں کیونکر آہستہ آہستہ زوال شروع ہوا اور اسکے اسباب کیا تھے۔

۱۔ مروج الذهب (مسعودی) کے مصنف کا نام ابوالحسن ہے اور مسعودی کے نام سے اس نے مشہور ہے کہ اسکے مورث اعلیٰ کا نام مسعود تھا (وہی مسعود بن کے لڑکے عبداللہ نے آنحضرت کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی ہجرت کی تھی) مسعودی کی زندگی زیادہ تر سیر و سیاحت میں بسر ہوئی۔ قریب قریب تمام وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اس نے جا کر دیکھے۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ اپنے مغرب (مراکش و ہسپانیہ) کا سفر اس قدر کیا کہ مشرق کو بھول گیا اور مشرق (چین) میں اتنی سیاحت کی کہ مغرب فراموش ہو گیا۔ یہ فطرتاً نہایت غایر مطالعہ کرنے والا سیاح تھا۔ اسی کی سیاحت کا نتیجہ ”مروج الذهب“ ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ ”مسعودی نے مشرق و مغرب کے ان اقوام و ممالک کے حالات لکھے ہیں جو اس کے زمانہ (یعنی ۳۳۳ھ) میں پائے جاتے تھے) اسنے اقوام کے مراسم، ممالک کا جغرافیہ، وہاں کے پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، سلطنتوں اور مشہور خاندانوں کے حالات لکھے ہیں۔ اور تمام مورخین مابعد اس کا تتبع کرتے ہیں۔“

۲۔ اشکال البلاد یا کتاب المسالک والممالک (ابن حوقل)۔ ابن حوقل کا اصلی نام محمد ابوالقاسم تھا۔ یہ بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس کے کم سنی ہی زمانہ میں خلافت بغداد ختم ہو کر ترکوں کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ جب یہ جوان ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ اسکی تمام جائداد ضائع ہو چکی ہے اس لئے اس نے سیاحت و تجارت کو اپنا کسب معاش کا ذریعہ قرار دیا۔ اس نے ۳۳۱ھ میں بغداد کو خیر باد کہا اور بہت سی مسلمان حکومتوں کی سیاحت کر کے ۳۵۹ھ میں اپنے وطن واپس گیا۔ اس کے دوسرے سال وہ افریقہ گیا اور ۳۶۶ھ میں اس نے اپنی تصنیف مکمل کی۔ اس نے بھی اپنی کتاب کا یہی نام رکھا جو اصطخری نے رکھا تھا، ابن حوقل لکھتا ہے کہ: ”اصطخری کی تصنیف ہر جگہ میرے ساتھ رہی ہے۔“

(۲)

جب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق (ؓ) نے عثمان ابن ابی العاص ثقفی کو بحرین و عمان کا حاکم مقرر کیا تو انھوں نے اپنے بھائی حکم (ثقفی) کو بحرین کی حکومت سپرد کر کے حکم دیا کہ ساحل ہند پر حملہ کرے چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت و صعب منزلیں طے کر کے سب سے پہلے ۱۵ھ میں تھانہ پر حملہ کیا اور اس کے بعد بھڑوچ پر جو اس زمانہ میں شیل احمد لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا سب سے پُر رونق بندر تھا۔ تاخت کے علاوہ اس نے اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل کی طرف روانہ کیا جو سندھ کا مشہور مقام تھا۔ یہ تینوں حملے ۱۵ھ اور ۱۶ھ کے درمیان ہوئے۔ صاحب ”فتوح البلدان“ کا بیان ہے کہ: ”ان حملوں میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔“

لے فتوح البلدان (بلاذری) میں اس کو تانہ لکھا ہے اب تھانہ ضافات مہنی کا مشہور مقام ہے لیکن اس وقت مہنی کا وجود کہیں نہ تھا۔ تھانہ (تانہ ہی بارونق و آباد بندر تھا۔ ۲۷ھ معجم البلدان (جمہوی) اور دوسری عربی کتابوں میں بھڑوچ کو بڑوچ اور بروقس لکھا ہے۔ ۲۷ھ فتوح البلدان کے مصنف کا نام احمد بن یحییٰ بن جابر تھا۔ اس کی عرفیت ابو جعفر اور ابو الحسن تھی لیکن عام طور سے بلاذری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری میں عباسی خلیفہ المتوکل کے دربار سے متعلق تھا اور شاہزادگان کی خدمت آتا تھی اس کے سپرد تھی۔ اس کا انتقال ۲۹۹ھ میں ہوا۔ ابوالحسن کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد خلیفہ المعتمد میں بھی بغداد میں رہتا تھا۔ اس کتاب میں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) عربوں کی وہ فتوحات درج ہیں جو شام و عراق، مصر و ایران، آرمینیا و اوارا، انہر، افریقیہ و ہسپانیہ و سندھ میں انھیں حاصل ہوئیں۔ یہ کتاب عربی کی قدیم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے، تاریخ طبری اس کے بعد بغداد ہی میں تحریر ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طبری اس سے واقف نہیں تھا کیونکہ بہت کچھ بلاذری میں درج ہے، تاریخ طبری میں نظر نہیں آتا۔ علاوہ بلاذری کے واقدی نے بھی ان فتوحات کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جو اب تاریخ واقدی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن واقدی کی فتوح السندھ البتہ کمیا ہے، بلاذری نے واقدی کا حوالہ کہیں نہیں دیا ہے۔

بلاذری خود سندھ نہیں آیا، بلکہ یہاں کے حالات اس نے دیگر معتبر مصنفین کی کتابوں سے حاصل کئے اور کچھ زبانی روایات سے انھیں لوگوں میں سے ایک شخص ابو الحسن علی بن محمد المدائنی تھا جس سے خود بلاذری نے مل کر گفتگو کی تھی۔ بلاذری نے منصور ابن حاتم اور اسکی تاریخ سند کا بھی ذکر کیا ہے اور ابن الکلبی کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ علاوہ فتوح البلدان کے بلاذری نے کتاب البلدان بھی لکھی اور اقوام عرب کے سلسلہ نسب پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور علاوہ ان کے متعدد کتابیں فارسی سے بھی ترجمہ کیں۔ بلاذری شاعر بھی تھا۔ ابن حوقل و مسعودی وغیرہ (قدیم ماہرین جغرافیہ عرب) نے بحیثیت شاعر ہونے کے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کی تاریخ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ البتہ ابن اثیر نے ۸۹ھ اور ۹۵ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے بلاذری کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ اس کو بلاذری اسلئے کہتے ہیں کہ وہ بلاذری (ایک منشی چیز) کا عادی تھا۔

خطا را از تاریخ محمد بن حاتم

چچ نامہ میں لکھا ہے کہ ”مغیرہ شہید ہوئے“ (یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی دوسری تاریخیں

۱۔ چچ نامہ عام طور سے اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں چچ برہمن کی حکومت اور عربوں کی فتوحات سندھ کا حال درج ہے۔ اصل کتاب کی ابتداء اخیر میں اس مجموعہ کو فتح نامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مسٹر آفٹنٹن نے اپنی تاریخ میں اس کا نام ”تاریخ ہندو سندھ رکھ لیا ہے اور نورالحق مصنف زبدۃ التواریخ اور نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری“ اسے منہاج المسالک کہتے ہیں۔

اصل کتاب عربی میں تھی جسے محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصر الدین قباچہ کے عہد میں فارسی زبان میں منتقل کیا۔

مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصائب زمانہ سے گھبرا کر اپنے وطن چھوڑنے اور اوج آنے پر مجبور ہوا۔ ۶۱۳ھ میں اس کی عمر ۵ سال کی تھی اور صرف چند کتابیں اس کی انیس تھیں۔ اسی غلوٹ نشینی کے زمانہ میں اسے محمد قاسم کی فتوحات سندھ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور آتور دیکھ کر گیا۔ یہاں پہونچ کر یہ اسماعیل بن علی سے ملا جو عثمان ثقفی کی اولاد میں سے تھے۔ یہ اپنے عہد کے بڑے فاضل شخص تھے انھوں نے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب فتوحات عرب کے متعلق عربی زبان میں موجود ہے جو میرے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب معلومات سے لبریز تھی اس لئے محمد بن حامد بہت خوش ہوا اور اس کا ترجمہ فارسی میں کر کے قباچہ کے وزیر کے نام منسوب کیا جس کا نام وہ پورے خطابات اور مناقب کے ساتھ ”صدر جہاں، دستو صاحب قرآن، عین الملک حسین ابن ابوبکر بن محمد الاشعری“ لکھتا ہے چونکہ اسی وزیر کے اجداد میں ابو موسیٰ اشعری فاتح خراسان و عجم بھی تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ عین الملک سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص اس انتساب کے لئے نہ ہو سکتا تھا۔ محمد عوفی نے اپنی کتاب لباب الالباب کو بھی اسی وزیر (عین الملک) نام سے منسوب کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمہ میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان کی کوئی تشریح نہیں کی جس سے ان کا جائے وقوع معلوم ہو سکے اس نے اوج، آتور، اور بھکر وغیرہ میں اپنا جانا بیان کیا ہے جو غالباً دریائے سندھ کے دیریں حصہ کے شہر تھے لیکن اب ان کی جگہ متعین کرنا بہت دشوار ہے۔

اصل عربی کتاب کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس زمانہ میں مرتب کی گئی تھی لیکن تاریخ کے لحاظ سے اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کتاب قاضی اسماعیل کے پاس سے دستیاب ہوئی تھی جن کا سلسلہ نسب عثمان ثقفی سے ملتا ہے اور فاتح سندھ بھی اسی قبیلہ سے متعلق تھا (قبیلہ ثقیف، طایف کا نہایت مشہور قبیلہ تھا) چونکہ اس کتاب میں شہر منصورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جو خلیفہ منصور کے عہد میں (۱۳۶ھ) میں تعمیر کیا گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف ۱۳۶ھ سے قبل ہوئی ہوگی۔

اس کتاب میں فتوحات محمد قاسم کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کثرت سے اس عہد کے مختلف شہروں کے نام دیئے گئے ہیں جو ماہرین جغرافیہ کے لئے کافی اسباب جستجو رکھتے ہیں۔

نظام الدین احمد، نورالحق، فرشتہ، میر معصوم وغیرہ نے فتوحات سندھ کے متعلق اس سے بہت مدد لی ہے۔

مثلاً تحفۃ الکرام، تاریخ معصومی، تاریخ طاہری، بیگ لڑنامہ، ترخان نامہ (ارغون نامہ) چونکہ اکثر و بیشتر جوچ نامہ سے

۱۔ تحفۃ الکرام (مصنفہ علی شیر قانع) کی تین جلدیں ہیں۔ اول جلد کے پہلے حصہ میں انبیاء و ملوک کے علاوہ عہد نبوی کے علماء و حکماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں عہد نبوی و خلفاء راشدین کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کا بیان ہے۔ دوسری جلد میں ایک عمومی بحث تمام امراء و ملوک، وزراء و علماء وغیرہ سے کی ہے تیسری جلد میں سندھ کی تاریخ لکھی ہے۔

ہر چند ابتدائی تاریخ سندھ کے متعلق اس میں میر معصوم کی تاریخ سندھ کی طرح مفصل طور سے بحث نہیں کی گئی ہے لیکن پھر بھی بہت سی ایسی باتیں اس میں ملتی ہیں جو تاریخ معصومی میں نہیں ہیں۔

تحفۃ الکرام میں تاریخ سندھ کی ابتداء ان برہمنوں کے حالات سے کی گئی ہے جو قبل فتوحات عرب وہاں پائے جاتے تھے اس کے بعد فتوحات کا ذکر کیا ہے جو بالکل چچ نامہ سے ماخوذ ہے، اس کے بعد ان سحر اور سنا خاندان کے گورنروں کا حال ہے جو فرما نروایان دہلی کو طرف سے یہاں مامور تھے، پھر قبائل ترخان اور ارغون کی تاریخ درج کی ہے اور اس کے بعد گورنران تیموریہ و خاندان کچھواہ کا حال لکھ کر نصف جلد میں تاریخ سندھ کو ختم کر دیا ہے۔ باقی نصف حصہ میں اس عہد کے مشایخ و سادات، اولیاء و علماء کا ذکر ہے۔

تاریخ اقصیٰ تصنیف ایک جگہ ۱۱۸۰ھ درج کی گئی ہے اور دوسری جگہ ۱۱۸۵ھ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس سند کے حالات اس میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف تحفۃ الکرام نے جو اسیر الاولیاء، مدلیقۃ الاولیاء، معلومات القحاق، کا حوالہ دیا ہے، ایک کتاب اسی نام کی جلال الدین سیوطی کی بھی ہے جو اس سے بالکل جدا تصنیف ہے۔

۲۔ (تاریخ معصومی)۔ سندھ کی تمام تاریخوں میں تاریخ معصومی سب سے زیادہ مفصل تاریخ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف فتوحات اہل عرب کا حال درج ہے بلکہ عہد اکبری تک کی تاریخ سندھ اس میں پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے چار طبقے ہیں۔ طبقہ اول میں راجہ داسر کی وفات تک کا حال درج ہے دوسرے طبقہ میں سندھ کی تاریخ زیر حکومت شاہان دہلی لکھی ہے۔ ہارون الرشید اور محمود غزنوی کے درمیان جو دو صدی کا زمانہ گزرا ہے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا سندھ کا کیا حال تھا۔ اسی طبقہ میں حملہ تیمور کے بعد سحر اور سنا خاندانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تیسرے طبقہ میں ارغون خاندان کی تاریخ درج ہے اور چوتھے جب آگرہ سے بھاگ کر سندھ پہنچا تھا، اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ چوتھے طبقہ میں وہ حالات لکھے ہیں جن کی بنا پر سندھ، آگرہ کے قبضہ میں آیا۔ اسی طبقہ میں اُس نے اپنی اور آگرہ کی ملاقات اور ضلع بکر میں عطائے جاگیر کا بھی ذکر کیا ہے۔

ماخوذ ہیں اس لئے ان سب کا بیان وہی سمجھنا چاہئے جو پہلے نام (کاسے) یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱)

محمد مصوم المتخلص بہ نامی، بھکر میں پیدا ہوا جو سندھ کا ایک شہر تھا۔ اس کا باپ صفائی حسینی باشندہ کرمان تھا۔ یہ نہایت قابل شخص تھا اور عہد اکبر و جہانگیر میں اس نے کچھ امتیاز بھی حاصل کر لیا تھا یہ اپنے عہد کا اچھا تاریخ داں اور مشہور خوش نویس تھا۔ محمد مصوم نے تاریخ سندھ ۱۶۵۰ء میں مرتب کی اور فتوحات اعراب کے متعلق صرف چھ نامہ کو اپنا مآخذ قرار دیا۔ بعد کو مؤرخین (مثلاً بڑیونی، حیدر رازی، صاحب اثر الامراء، تحفۃ الکرام، باغ مانی و مرآۃ دولت عباسی نے) تاریخ مصوم سے استفادہ کیا ہے۔

یہ تاریخ طاہری کا مصنف میر طاہر محمد نیانی ابن حسین ساکن ٹھٹھا تھا، مصنف کا خاندان ارغون اور ترخان خاندانوں سے سلسلہ طائفت رکھتا تھا۔ چنانچہ طاہر محمد نے اپنی کتاب کو شاہ محمد بیگ عادل خاں کے نام سے منسوب کیا ہے جو شاہ بیگ عادل خاں ارغون گنہ گز قندھار کا بیٹا تھا (صاحب تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ شاہ بیگ ارغون نہیں تھا بلکہ ترخانی تھا اور اُسی کے نام سے تاریخ طاہری منسوب کی گئی تھی)۔

مصنف نے جو دیر باپ میں اپنے اور اپنے خاندانوں کے حالات لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۰ھ میں جب قندھار پر فاسیوں نے حملہ کیا تو طاہر محمد اپنی تعلیم پوری کرنے کے لئے ٹھٹھا آیا (اس وقت اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی) اور مولانا اسحاق کا شاگرد ہو گیا جو اس وقت کے مشہور عالم و صوفی تھے۔

جب ہمایوں، شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگا تو اُس کے نانا عمر شاہ اور ماموں داؤد سہٹانے جو دہریلا میں رہتے تھے، ہمایوں کو بہت مدد دی اور ہمایوں نے خوش ہو کر ایک پروانہ لکھا کہ اگر میں کامیاب ہو کر پھر تخت نشین ہوا تو دو ربیلا ان کی جاگیر میں دیدا جائیگا لیکن افسوس ہے کہ محمود خاں گورنر بھکر کے اشارہ سے عمر شاہ ایک کھال کے اندر بند کر کے دریائے ڈال دیا گیا اور داؤد بھی قتل کیا گیا۔ اس خاندان کے بقیہ افراد ڈک کے مارے احمد آباد بھاگ گئے اور یہ پروانہ ضایع ہو گیا۔

طاہر محمد نے شکایت کی ہے کہ جس عہد کی وہ تاریخ لکھنا چاہتا تھا اس کے ابتدائی حالات کے متعلق اُسے کوئی کتاب باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن بعد کے حالات اُس نے تفصیل سے لکھے ہیں جو اُسے اپنے باپ کے ذریعہ سے معلوم ہوئے۔

تاریخ طاہری ۱۱۶۰ھ میں ختم ہوئی جبکہ مصنف کی عمر چالیس سال کی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دس طبقات میں تمام ہوئی ہے۔ لیکن صرف سات طبقات کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ طبقہ اول جو صرف ۱۶ صفحات کا ہے سمر خاندان سے متعلق ہے۔ دوسرا دس صفحات کا سمر خاندان سے، تیسرا تیس صفحات کا ارغون خاندان سے اور باقی طبقات میں ترخان خاندان کے حالات اس وقت تک کے درج ہیں جبکہ لغائی بیگ کو سندھ میں بہ تمام قندھار زبردیکر مار ڈالا گیا اور ترخانیوں کی حیثیت صرف جاگیرداروں کی سی رہ گئی۔ سندھ میں عرب حکومت کا کوئی حال اس کتاب میں درج نہیں ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵-۵ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمائے)

چچ برہمن حکمران تھا اس کے چند دن بعد ابو موسیٰ اشعری جو صحابہ رسول میں سے تھے، گورنر عراق (بصرہ) مقرر ہوئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴ - ۵ - صفحہ ۲۱-۲۲)

۴ (بیگ لڑنامہ) شاہ قاسم خاں ولد امیر سید قاسم بیگ کے نام سے منسوب ہے اسی لئے اس کو بیگ لڑنامہ کہتے ہیں۔ یہ بالکل نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا مصنف کون تھا، سوائے اس کے کہ وہ اپنے مرنے والے بیگ لڑ کا ملازم تھا۔ بیگ لڑ شاہ قاسم خاں کے خاندان کا موروثی لقب تھا۔ اس لئے ترکی اور فارس کا وہ خاندان بیگ لڑ بیگ جس کے اکثر افراد اس وقت گورنری کے عہدوں پر ممتاز تھے، دوسرا تھا۔ خاندان بیگ لڑ کئی پشتوں تک ترمز میں رہا، وہاں سے سمرقند آیا اور پھر یہاں سے سندھ آگیا۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے چونکہ بیگ لڑ خاندان کے بعض افراد کا قیام اتفاق سے ایک ہی جگہ ہو گیا تھا۔ اس لئے ان دونوں خاندانوں میں ارتباط قائم ہو گیا۔

ایرشد قاسم بیگ، شاہ حسین ارغون کے عہد میں، سمرقند سے سندھ آیا اور رانا امر کوٹ کی کھیتی سے شادی کر لی۔ اس موصلیت سے شاہ قاسم پیدا ہوا اور اسی کے نام پر کتاب منسوب کی گئی۔

بیگ لڑ نامہ میں پہلے مختصر بیان عربوں کی فتوحات سندھ کا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارغون خاندان کے حالات مختصر بیان کئے گئے ہیں اور پھر امیر قاسم بیگ کے مفصل حالات سے بحث کی ہے۔ عہد امیر قاسم میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں اور جو واقعات پیش آئے ان کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، صحیح تاریخ تصنیف کی کوئی معلوم نہیں ہو سکی۔

۵ ترخان نامہ کو ارغون نامہ بھی کہتے ہیں اس کا مصنف سید جمال ابن میر جلال الدین مین شیرازی تھا یہ کتاب ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اس تصنیف میں ارغون اور ترخان (مغل خاندانوں) کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور مرزا محمد صالح کے نام سے منسوب ہے جو ترخان خاندان سے متعلق تھا۔

مرزا محمد صالح چاہتا تھا کہ مغل خاندانوں سے واقف ہو جائے اور خصوصیت کے ساتھ اپنے خاندان کے حالات معلوم کرے، اس لئے اس نے سید جمال سے کہا کہ ترخان نامہ دیکھ کر ناچاہئے (معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل اس نام کی کوئی کتاب مرتب ہو چکی تھی) لیکن باوجود تلاش کے ایسی کوئی کتاب نہیں ملی اور سید جمال نے یہ کتاب مرتب کی جس میں طبری، روضۃ الصفا، طغر نامہ، تاریخ ہمایوں، اکبر نامہ، نگارستان، تاریخ طاہری، فتوحات بے بدل، یوسفی، تاریخ گزیدہ اور مجمع الانساب وغیرہ سے مدد لی گئی ہے اور تاریخ معصومی کو خاص طور سے ملاحظہ بنایا گیا ہے۔

مرزا محمد صالح، مرزا عیسیٰ ترخان کا بیٹا تھا (مرزا عیسیٰ ترخان کا پوتا تھا اس کا جو ترخان خاندان سندھ کا مورث اعلیٰ تھا) مرزا عیسیٰ سندھ میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی بہت عزت کی گئی۔ جب شاہجہاں کا عہد آیا تو اس کو ایک لاکھ روپیہ کی رقم معہ نوبت کے جو نشان اعزاز ہے مرحمت ہوئی۔ بعد کو گجرات کا صوبہ دار بنادیا گیا اور ۱۰۶۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ و نمبر ۶ صفحہ ۲۲ پر دیکھیے)

اور خلیفہ دوم نے ان سے ہندوستان کے حالات دریافت کئے اُنہوں نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا۔ اور

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ و نمبر ۱ صفحہ ۲۳)

مرزا محمد صالح کو بھی اس کے بعد اپنے باپ کی عزت کا کچھ حصہ ملا اور اس خاندان کے اور لوگوں کی بھی جاگیر مقرر ہو گئی۔

ترخان نامہ میں سب سے پہلے محمد صالح کا شجرہ نسب درج ہے جو نوح تک پہنچتا ہے اس کے بعد خواتین ترکستان اور چنگیز خاں کے مختصر تاریخ درج کر کے ارغون اور ترخان خاندان کے حالات مرزا عیسیٰ ترخان کی وفات تک درج کئے گئے ہیں۔

۱۷۰۰ء چچ ایک معمولی برہمن تھا جو ساہسی فرمانروائے سندھ کے دربار میں ملازم ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا اقتدار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ساہسی کے مرنے پر اس نے ساہسی کی بیوی سے شادی کر لی اور سندھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چونکہ فرمانروائے بے پور (یا چتور) ساہسی کا عزیز تھا اس لئے اس نے چچ کے خلاف لشکر کشی کی۔ مگر چچ نے گرو قریب سے کام لیکر کامیابی حاصل کر لی اور بدستور سندھ کا حکمران رہا۔

تحقیق طلب ہے کہ چچ کس زمانہ میں تھا۔ ایک جگہ چچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۰۰ء کے قریب (چچ کی تخت نشینی کے چوتھے سال) چچ نے یہ معلوم کر کے کہ فارس میں ایک عورت حکمران ہے کہ ان کی طرف فوج کشی کی تھی۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب مغروے ۱۱۰۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان حملہ کیا تو چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے اور جب چچ ۴۰ سال تک حکومت کر چکا تو اس کا بھائی چندر حکمران ہوا جو صرف آٹھ سال کے بعد مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا داتر تخت نشین ہوا جو ۹۳ء میں محمد قاسم (مشہور فاتح سندھ) کے مقابلہ میں مارا گیا۔

سندھ انکرام لکھا ہے کہ (۱) چچ، راجہ چتور کو قتل کرنے کے بعد ۱۱۰۰ء میں تخت نشین ہوا اور کل چالیس سال تک اس نے حکومت کی (۲) ۶۷ء کے بعد چندر حکمران ہوا اور اپنی حکومت کے آٹھویں سال مر گیا۔ (۳) اس کے بعد داتر حکمران ہوا جو ۳۳ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۳ء میں مارا گیا۔ (۴) اس پر برہمن خاندان نے سندھ میں ۹۲ سال تک حکومت کی۔ اس بیان کی غلطی ظاہر ہے کیونکہ حساب سے صرف ۱۸ سال ہوتے ہیں۔

اس غلطی کا ازالہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ چچ نامہ میں جو یہ لکھا ہے کہ ”مغروے کے حملہ کے وقت چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے“ اس میں بجائے ۳۵ کے ۳ یا ۴ پڑھا جائے اور چچ کے حملہ کران کے وقت جو سندھ درج کیا گیا ہے وہ بجائے دو کے ۱۰ (۱۰) قرار دیا جائے اس امر کا ثبوت کہ یہاں ۱۱۰۰ء کے بجائے ۱۱۰۰ء صحیح ہے اس سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۱۰۰ء میں تخت ایران پر کوئی عورت حکمران نہ تھی خود چچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ ملک کسرلہ میں ہر (یعنی خسرو پرویز) کی جانشین تھی اور یہ صحیح ہے کہ خسرو کے بعد اس کی دو بیٹیوں (دخت خواتین) دوران دخت) نے دو تین سال تک حکومت کی۔ لیکن طبری نے دخت زمان کا عہد حکومت ۱۱۰۰ء اور صاحب روضۃ الصفا نے تواریخ دخت کا زمانہ حکمرانی ۱۱۰۰ء لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ ہو)

حضرت عمرؓ نے نہ صرف ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی ممانعت کر دی بلکہ تمام بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا۔

جب حضرت عثمانؓ (۶۴۴-۶۵۵ء) خلیفہ ہوئے اور بجائے ابو موسیٰ اشعری کے عبداللہ بن عامرؓ کو نہ بصرہ مقرر کئے گئے تو انھوں نے خلیفہ سے اجازت لے کر حاکم بن جبکہ کو مالک ہندوستان کا حال دریافت کرنے کے لئے مامور کیا لیکن انھوں نے بھی واپسی میں مایوس کن حالات بیان کئے اور اس طرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

خلافت حضرت علیؓ (۶۵۵-۶۶۱ء) میں اہل بیتؑ و اعر کی سرکردگی میں ایک مہم (آخر ۳۳ھ میں) روانہ کی گئی جو پہرہ اور کوہ پایہ کوہ قیقان یا قیقانان پہنچی دشمنوں نے بیس ہزار کی جمعیت سے مقابلہ کیا لیکن عارث بن مرہ نے جو لشکر اسلام کا ایک بڑا جوانمرد افسر تھا، دشمنوں کو شکست دی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴)

اس لئے ظاہر ہے کہ جب چچ نے کرمان پر حملہ کیا ہوگا تو ان دونوں عورتوں میں سے کسی کا زمانہ حکومت رہا ہوگا۔ اس لئے تاریخ و احساب ذیل نقشہ کو صحیح سمجھنا چاہئے:-

چچ کی وفات (۴۰ سال حکومت کرنے کے بعد) ۱۵۰ھ	۱۰۰ھ	چچ کی تخت نشینی سندھ میں
چندر کی وفات (تخت نشینی کے آٹھویں سال) ۱۵۹ھ	۱۰۹ھ	کرمان پر حملہ
نہاہر کی وفات (۳۳ سال حکومت کرنے کے بعد) ۱۹۳ھ	۱۴۵ھ	مغیرہ کا حملہ

۱۔ چچ نامہ صفحہ ۷۰۔ ۲۔ تحفۃ الکرام صفحہ ۹ و بلاذری ۱ - ۱۱۶ -

۳۔ بلاذری نے بھی اسی مہم کا ذکر کیا ہے لیکن افسر فوج عارث بن مرہ کو قرار دیا ہے۔

۴۔ قیقانان، قیقانی، کیکانان۔ چچ نامہ میں درج ہے کہ راستے خاندان کی حکومت چچ بڑھیں سے پہلے، سندھ میں قرآن اور قیقانان کے پہاڑوں تک وسیع تھی۔ اس کے بعد ۳۹ھ میں پہرہ چچ اور کوہ پایہ پہنچے ہوئے عروج قیقانان تک پہنچنا ظاہر کیا گیا ہے جہاں انھیں شکست ہوئی۔ بلاذری لکھتا ہے کہ قیقان، خراسان کی طرف سندھ کا ایک حصہ ہے دوسرے جگہ قیقان کو ترکوں کا مستقر ظاہر کرتے ہوئے متان اور کابل کے درمیان واقع ہونا ظاہر کرتا ہے۔ ابن حوقل وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان ضلع توران کا ایک شہر تھا، جس میں قصدان کا گورنر رہا کرتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان شہر بھی تھا اور ایک صوبہ کا بھی نام تھا۔ بعض چینی سیاحوں کے بیان سے واضح ہے کہ قیقان، کابل کے جنوب میں واقع تھا۔ ان تمام بیانات سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ مشرق میں حدود متان تک وسیع تھا اور دوسری طرف اس کا سرسبز کوہ سیلان تک پہنچتا تھا۔

۵۔ بلاذری نے بھی اس فتح کا حال لکھا ہے لیکن آخر میں لکھتا ہے کہ سندھ میں تمام مسلح افواج کوہ قیقان کے قریب کام آئی۔

اسی وقت حضرت علی کی شہادت وقوع میں آئی اور امیر معاویہ کا دور حکومت شروع ہوا۔

ہو امیہ میں سب سے پہلے حکمران امیر معاویہ ہوئے ہیں (۴۰-۶۰ھ) ان کے زمانہ میں سلطنت اسلام بہت وسیع ہوئی اور سندھ پر زیادہ اثر قائم ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے (۶۴-۶۴ھ) میں مہلب نے سندھ پر حملہ کیا اور بتا اور اہورا تک بڑھتے چلے گئے جو متان و کابل کے درمیان واقع تھے لیکن یہ قتل ہوئے، اس کے بعد ۶۶ھ میں عبداللہ بن سوار اور بعض روایت کے مطابق عبداللہ ابن عامر مامور کئے گئے۔ یقیناً ان کو فتح حاصل ہوئی اور حیب پھر واپس آئے تو ان کو قتل کر دیا اس کے بعد متعدد فوجیں مختلف اوقات میں اس طرف روانہ کی گئیں اور مکران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

عہد بنی امیہ کی تعلقات (۶۰-۶۱۰ھ)

یزید اول (۶۰-۶۴ھ) اور معاویہ ثانی (۶۴-۶۶۱ھ) کے عہد میں بھی مسلسل کئی بار حدود ہند پر تاخت کی گئی، مروان اول کے زمانہ میں (۶۶۱-۶۸۳ھ) مسلمانوں نے راجپوتانہ پر سندھ کے راستہ سے حملہ کیا اور مانک رائے راجہ اجمیر مع اپنے اکلوتے بیٹے کے مارا گیا۔ جب مروان کے بعد عہد ملک (۶۸۳-۶۸۵ھ) تخت نشین ہوا تو عراق کی گورنری اس نے حجاج ابن یوسف کے سپرد کی۔ حجاج نے مکران کی حکومت سعید بن اسلم کلبی کو تفویض کی۔ لیکن علاقہ یوں نے اُسے مار ڈالا۔ حجاج نے عبدالرحمن بن اشعث کو مامور کیا مگر یہ بھی علاقہ یوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد مجاہد بن سعید مامور ہوا اس نے سرحدی اضلاع پر کامیابی سے تاخت کی۔ لیکن یہ اسی سال مر گیا اور محمد بن ہارون متعین کیا گیا۔

جب ولید اول (۶۸۵-۶۹۶ھ) میں تخت نشین ہوا تو محمد بن ہارون کو حکم دیا گیا کہ وہ علاقہ یوں کو تلاش کر کے قتل کرے۔ چنانچہ وہ پانچ سال تک مسلسل مختلف شہروں پر تاخت کرتا رہا اور ایک علاقہ کا سر بھی اس نے حجاج کے بھیجا۔ حجاج بڑے عزم و جرات کا گورنر تھا وہ چاہتا تھا کہ مشرق میں فتوحات اسلامی کو بہت وسیع کرے، چنانچہ اس نے ایک لشکر قتیہ کی سرکردگی میں روانہ کر کے خوارزم، بخارا، خجند، سمرقند، فرغانہ کو فتح کیا اور ایک لشکر کابل کے راجہ سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا اتفاق سے اس زمانہ میں راجہ سراندیپ (لنگا) نے حجاج کے پاس آٹھ جہازوں میں بہت سے تحائف روانہ کئے ان میں لوہڑی غلام

لے کر لے کر اپنے کتاب راجستھان میں یہی لکھا ہے کہ خلافت علی میں مسلمانوں کا سلسلہ فتوحات سندھ میں شروع ہو گیا تھا، جو وفات حضرت علی کے بعد منقطع ہو گیا۔ ۵۲ بلاذری ۱-۱۱۶ و ۱۱۷-تحفة الکرام - ۹-چچ نامہ ۴۲-۸۰۔ ۵۳ راجستھان کرنل ٹاڈ - جلد دوم صفحہ ۴۴۴-۴۴۵ یہ بیان فتوح البلدان، چچ نامہ اور فرشتہ کا ہے لیکن میر معصوم نے اپنی تاریخ سندھ میں اس سے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک نے کچھ لوگ یہاں لوٹیاں و دیگر اشیاء خریدنے کے لئے روانہ کئے تھے یہی لوگ جہازوں میں واپس آ رہے تھے کہ ساحل دیبل پر قزاقوں نے لوٹ لیا۔ ان جہازوں پر چند شامی تجارت بھی بیٹھے ہوئے تھے جو لنگا سے اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے۔

بھی تھے اور کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو حج کے ارادہ سے سوار ہو گئے تھے۔ راستہ میں باد مخالف نے ان جہازوں کو مناہل دیل پر پہنچا دیا اور یہاں بحری قزاقوں نے ان کو لوٹ لیا۔

حجاج نے داسر کو لکھا کہ ”وہ گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو فوراً آزاد کر دے۔“ داسر نے جواب دیا کہ ”یہ حرکت قزاقوں کی ہے اور مجھ کو ان پر مطلق اقتدار حاصل نہیں۔“

حجاج نے خلیفہ سے بدقت تمام اجادت حاصل کر کے عبید اللہ کو ایک فوج لے کر دیبل روانہ کیا لیکن یہ کامیاب نہیں ہوا اور مارا گیا۔

اس کے بعد حجاج نے حاکم عمان کو ہدایت کی کہ مکہ آن کے راستہ سے سندھ پر حملہ کرے اور عبداللہ بن قحطان کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی عمان جا کر شامل ہو جائے چنانچہ نیرون کے مقام پر دونوں مل گئے اور راجہ داسر کی فوج سے مقابلہ ہوا مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔

تحفۃ الکرام اور فتوح البلدان کا بیان ہے کہ یہ جنگ نیرون میں نہیں بلکہ دیبل میں ہوئی تھی۔ میر حال جہاں کہیں ہوئی ہو مسلمان ناکامیاب رہے۔ جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو اہل نیرون ڈرے کہ کہیں حجاج ہم سے بدلہ نہ لے، چنانچہ یہاں کے حاکم نے جو بودہ مذہب کا تھا داسر سے چھپا کر اپنے معتدوں کو حجاج کے پاس روانہ کیا اور اپنی بے قصوری ظاہر کرتے ہوئے آئندہ سے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ حجاج نے نیرون والوں کے لئے نامہ امان لکھ دیا اور اب سندھ پر حملہ کرنے کیلئے محمد قاسم کا انتخاب عمل میں آیا۔ جو حجاج کا بھتیجا تھا۔

تمام فارسی مورخین اسے محمد قاسم لکھتے ہیں۔ بلاذری، ”محمد بن قاسم ثقفی“ اور ابوالفداء ”محمد بن القاسم“ تحریر کرتا ہے اس وقت محمد قاسم کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔

۱۔ یہ قزاق کس قوم کے تھے اس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے فتوح البلدان میں ان کا نام مید لکھا ہے چچ نامہ میں شکامرا، تحفۃ الکرام میں کہیں شکامرا اور کہیں ناگامرا تحریر ہے عبداللہ بن عباسی شارح دیوان جریر نے انھیں کرک کے نام سے تحریر کیا ہے، ابن اثیر نے بھی ۱۵۱ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے کرک قوم کا ذکر کیا ہے جن کی نسبت خیال کیا ہے کہ شاید وہ کرک (مشرقی ہنگوڑ) کی رہنے والی ہو۔

۲۔ نیرون۔ جب رائے خاندان کی حکومت تھی تو یہ مقام سلطنت ہرمیہ آباد میں شامل تھا۔ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے امن چاہی تھی اور دیبل فتح کرنے کے بعد محمد قاسم نے اپنے حملہ کا رخ اسی طرف کیا تھا اور دیبل سے چل کر ساتویں دن یہاں پہنچا تھا۔ اصطخری اور ابن حوقل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیرون ماہین دیبل و منصورہ واقع تھا لیکن منصورہ سے قریب تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے دریائے سندھ کا عبور کرنا ضروری تھا۔ ابوالفداء نے اس کا فاصلہ منصورہ سے ۵۰ فرسنگ قرار دیا ہے اور نیرون کی شہور کتاب قانون مسعودی کی سند سے اس کا عرض جلد و طول البلد ۲۶ - اور ۴۰ - تحریر کیا ہے۔

محمد قاسم نے جس عزم و حسن انتظام کے ساتھ سندھ کی تمام وادی کو فتح کیا، وہ محمد قاسم کی کسی کو دیکھتے ہوئے حقیقتاً تاریخ کا عجیب و غریب افسانہ ہے۔ فتوح البلدان، چچ نامہ، اور تحفۃ الکرام وغیرہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اسکے جزئیات درج کئے گئے ہیں اور مختصر ابتدائی صفحات میں ہم نے بھی اس کا حال درج کر دیا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد قاسم نے نہایت غیر معمولی طریقہ سے اپنی ہمت و شجاعت اور اپنے عزم و فراست کا سکہ ایک ایک کے دل میں قائم کر دیا، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت محمد قاسم، سندھ کی فادریوں کو اپنی نہرو آزمائیوں اور فتوحات کا مرکز بنائے ہوئے تھا اسی وقت طابق اسپین فتح کرتا ہوا قرآن کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف ایشیاء میں خوارزم اسلام زیر نگین آنے والا تھا۔

فرشتہ کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے عام طور سے یہی یقین کیا جاتا ہے کہ صرف چھ ہزار سپاہیوں کی مدد سے سندھ فتح کیا گیا۔ لیکن مورخین عرب کا بیان اس باب میں زیادہ قابل وثوق ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ علاوہ اس فوج کے جو بطور مقدمہ الجیش کے ابوالاسود کی سرکردگی میں حدود سندھ پر محمد قاسم سے مل گئی تھی ۶ ہزار سوار شام و عراق کے اور ۶ ہزار مسلح شتر سوار بھی تھے علاوہ ان کے تین ہزار اونٹ بارہ ہادی کے تھے جن کے پیچھے تین ہزار پیادہ فوج ظاہر کرتا ہے۔

مگر ان میں محمد بارون بھی اپنی لمبی فوج کے ساتھ شریک ہو گیا تھا اور پانچ منجنیق مع دیگر ضروری سامان کے جہازوں کے ذریعہ سے دیہل تک پہنچائی گئی تھیں۔ ایک ایک منجنیق اتنی بڑی تھی کہ اس کے چلانے کے لئے ۵۰ آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ کم از کم ڈھائی ہزار سپاہی جہازوں کے ذریعہ سے منجنیقوں کے ہمراہ آئے ہوں گے اس طرح کل جمعیت تقریباً ۱۵ ہزار تھی جس کی مدد سے محمد قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔

جب محمد قاسم کی کامیابی کی خبر دمشق میں پہنچی تو اور تازہ فوج روانہ کی گئی اس لئے جب وہ ملتان سے دیہل پور کی طرف چلا ہے تو پچاس ہزار سپاہ اس کے پرچم کے ساتھ تھی اور وہ جمعیت اس کے علاوہ تھی جو سندھ کے مفتوحہ قلعوں میں چھوڑ دی گئی تھی تاریخ فتح سندھ ابن قتیبہ ۹۳ھ ظاہر کرتا ہے۔ طبری کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ۹۳ھ (غالباً کتابت کی غلطی ہے) میں محمد قاسم نے سندھ کے بادشاہ دس ابن سسا کو قتل کیا ۹۳ھ میں سندھ فتح کیا اور ۹۵ھ میں ہندوستان کا اور زیادہ مشرقی حصہ مسخر کر لیا۔

اگرچہ محمد قاسم نے شیراز ۹۲ھ میں چھوڑ دیا تھا لیکن دیہل پہنچنا ۹۳ھ کی ابتداء میں معلوم ہوتا ہے فتح دیہل کی کوئی صحیح تاریخ معین نہیں ہو سکتی، لیکن حجاج نے اس فتح کا اعلان ۲۰ رجب ۹۳ھ (یکم مئی ۷۱۲ء) کو کیا تھا۔ اور سندھ سے پائے خلافت تک سات دن میں خبر پہنچتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ دیہل شروع رجب ۹۳ھ میں فتح ہوا ہوگا۔

اس کے بعد رمضان میں انور فتح ہوا یہاں سے پھر مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ: محمد قاسم، طاقان سے آگے نہ بڑھا تھا کہ حجاج کی موت کی خبر پہنچی اور وہ واپس چلا گیا، لیکن چچ نامہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد قاسم

حدود کشمیر میں اس جگہ تک پہنچ گیا تھا جہاں دریائے جہلم پہاڑوں سے نکل کر زمین کو بہت سے چھوٹے چھوٹے جزائر میں تقسیم کرتا ہوا متعدد ڈشمنوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چچ نامہ میں اس خطہ زمین کا نام ”پنج مائیات“ یعنی (پنجاب) بتایا ہے اور یہی چچ کی سلطنت کی آخری حد تھی۔

حجاج کے چھ ماہ بعد خلیفہ ولید کا بھی انتقال ہو گیا (جمادی الاول ۹۶ھ - جنوری ۷۱۷ء) اور محمد قاسم واپس بلا لیا گیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محمد قاسم، سندھ و پنجاب میں سوا تین سال سے نائز رہ سکا۔

محمد قاسم کے اسباب قتل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ چچ نامہ اور اس کے تمام متبع مورخین کا بیان ہے کہ ولید ہی نے اس کو قتل کرایا تھا۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ خلیفہ سلیمان کے حکم سے محمد قاسم قتل کیا گیا اور اس کی داستان اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ خلیفہ ولید کے بعد خلافت سلیمان میں تمام پچھلے انتظامات منسوخ کئے جا رہے تھے اور خلیفہ سلیمان، حجاج کے تمام ساتھیوں کو چن چن کر قتل کر رہا تھا اس لئے اس نے محمد قاسم کو بھی طلب کیا اور ہلاک کر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد قاسم ہندوستان میں ایسا ہردلعزیز تھا کہ جب وہ واپس بلایا گیا ہے تو یہاں کے لوگ روتے تھے اور یہ محبت و عظمت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ آج میں سکابت طیار کر کے لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

خلیفہ سلیمان کے عہد میں (۹۶-۹۹ھ) محمد قاسم کے بعد نرید، حاکم سندھ مقرر کیا گیا۔ لیکن یہاں پہنچنے پر ۱۸ دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حبیب بن مہلب متعین کیا گیا، تاکہ جن راجاؤں نے محمد قاسم کے قتل سے فائدہ اٹھا کر سرکشی اختیار کی تھی ان کو زیر کرے۔ حبیب نے ساحل دریائے سندھ پر دشمنوں کی ایک جماعت کو شکست دی اور ان کے

لے ”کونٹش کریش“ نے اس جگہ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں سکندر نے راجہ پورس کے مقابلہ میں فتح حاصل کی تھی بالکل یہی نقشہ کھینچا ہے۔ اس قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب دہلی کی دو لڑکیاں خلیفہ ولید کے پاس پہنچیں اور خلیفہ نے ان کو خلوت میں بلایا تو انھوں نے محمد قاسم کی شکایت کی کہ وہ ان کی عصمت خراب کر چکا ہے۔ خلیفہ بہت برہم ہوا کہ محمد قاسم جہاں ہو تو فوراً ایک گائے کے چمڑے میں بند کر کے سی دیا جائے اور اسی حال میں یہاں لایا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی جب محمد قاسم کی لاش لوگوں کے سامنے پہنچی جن میں سے ایک کا نام سرج دیو اور دوسری کا پرمل دیوی تھا تو انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے تو صرف محمد قاسم سے اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لئے ایسا کہا تھا، تو یہ سن کر ولید بہت برہم ہوا اور لوگوں کو گھوڑے کی دم سے بندھوا کر ہلاک کر دیا اور لاشیں وچلہ میں پھلکا دیں۔ میر معصوم نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن چچ نامہ اور میر معصوم کا یہ بیان بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ کھالی کے اٹھ بند کر کے ہلاک کرنے کا طریقہ صرف تاتاریوں میں رائج تھا اور عرب اس سے واقف نہ تھے علاوہ اس کے یوں بھی خلیفہ ولید اپنے اخلاق کے لحاظ سے ایسا نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے جبریل کو ایسی معمولی سی بات پر ایسی سخت سزا دیکر فتوحات اسلام کے سلسلہ کو دھتکار دیتا۔ سے مورخین سندھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد دو سال کے اندر ہندوستان کے راجاؤں نے بغاوت کر کے اپنا ملک بہت کچھ واپس لے لیا۔ چنانچہ جیسا دہلی کے بیٹے بھی ہمیں آباد پور قبضہ کر لیا تھا۔

محمد قاسم کی واپسی اور قتل

محمد قاسم کے بعد نرید کی اس میں ہندوستان کے حالات

باشندگان کو مطیع کر لیا۔ عہد سلیمان میں ایک گورنر عامر بن عبد اللہ کا بھی یہاں آنا بیان کیا جاتا ہے، خلیفہ سلیمان کے بعد عمرو بن عبد العزیز کا عہد شروع ہوا (۹۰-۱۱۱ھ) انھوں نے ہندوستان کے تمام سلاطین و امراء کو خطوط لکھے کہ اسلام لے آؤ تاکہ تم کو بھی وہی حقوق ملیں جو اور مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ تم ہمارے ساتھ متحد ہو جاؤ تاکہ ہم بھی تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہو جائیں۔ چنانچہ داسر کا بیٹا جیسیا مع دیگر امراء کے مسلمان ہو گیا۔ عمرو بن مسلم یہاں کی سرحد پر نائب خلیفہ تھا اس نے بھی ہندوؤں کے متعدد صوبوں پر مختلف حملے کئے اور فتح حاصل کی۔ لیکن خلیفہ یزید (۱۰۱-۱۰۵ھ) کے عہد میں جنید بن عبد الرحمن المری سرحد ہند کا حاکم مقرر ہوا۔ اور خلیفہ ہشام بن عبد الملک (۱۰۵-۱۲۵ھ) کے عہد میں بھی بحال رہا۔ جنید نے تمام باغی سلاطین ہند کے خلاف فوج روانہ کی اور مختلف مقامات فتح کئے (مثلاً کیراج، مراد، مندل، وٹج، بروٹس، پھڑوچ) اُزین (اُجین) ماتیا (مالوہ) وغیرہ ان فتوحات کا ثبوت ہندو اور چینی تاریخوں سے بھی ملتا ہے۔

۱۱۵ھ میں جنید کے بعد تمیم بن زید العننی یہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ یہ ایک کمزور دل و دماغ کا شخص تھا لیکن بے انتہا سخی تھا۔ اس نے ایک کروڑ اسی لاکھ تاتاری درہم جو خزانہ سندھ میں جمع تھے لوگوں کو تقسیم کر دیے۔ تمیم کے بعد خالد گورنر عراق نے سندھ کی حکومت حکم الکلہبی کے سپرد کی اب اہل ہند نے پھر بت پرستی شروع کر دی تھی حکم نے محفوظ شہر تعمیر کرایا اور عمرو بن قاسم کی سرکردگی میں متعدد فتوحات حاصل ہوئیں۔ جب حکم کے بعد عمرو یہاں کا حاکم ہوا تو اس نے منصورہ تعمیر کرایا۔

اس کے بعد اور بھی چند گورنر آئے لیکن بلاذری نے ان کا نام نہیں بتایا۔ تحفۃ الکرام میں اس آخری عہد کی بابت لکھا ہے کہ ”سلیمان ابن خلیفہ ہشام بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، جس نے یہاں نہ صرف بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان (۱۲۶-۱۳۲ھ) کے عہد تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی، بلکہ عباسیہ خاندان کے خلیفہ اول (ابو العباس سفاح)

۱۷ تاریخ سندھ ۳۷ - تحفۃ الکرام ۱۸ - ۱۹ تحفۃ الکرام ۱۸ - ۳۷ ”سرحد ہند“ کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد عربیہ کا تسلط اندرون ملک برقرار نہ ہو سکا تھا۔ وہ امراء جو مسلمان ہو چکے تھے عربوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ جب جنید دیبل کی طرف بڑھا تو داسر کے بیٹے نے جو وہاں حکمران تھا اور مسلمان ہو چکا تھا کہلا بھیجا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور خلیفہ عمرو بن عبد العزیز نے ہمیں یہاں کا فرمانروا تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن جنید نہیں مانا اور جنگ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اس کے بعد اس کا بھائی سس، عراق کی طرف چلا کہ اس بے عنوانی کی شکایت وہاں کے حاکم سے کرے لیکن یہ بھی جنید کے اشارہ سے راستہ میں قتل کر دیا گیا۔

۱۷۷ راجستھان (کرنل ٹاڈ) جلد اول صفحہ ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۵۰، ۲۵۱ - ۱۷۷ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے زمانہ میں گورنران سندھ کا صدر مقام یہی تھا۔

کے عہد میں بھی کچھ زمانہ تک یہاں کا فرمانروا رہا۔ تحفۃ الکرام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مروان نے ایک شخص ابوالخطاب کو بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ آخری گورنر (بنو امیہ کی طرف سے) یہاں منصور تھا۔

جب ابوالعباس سفاح خلیفہ مقرر ہوا (۱۳۶-۱۳۷ھ) تو ابومسلم خراسانی نے سندھ کی حکومت پر عبدالرحمن کو مامور کیا عبدالرحمن اور منصور (آخری گورنر عہد بنی امیہ) سے لڑائی ہوئی جس میں عبدالرحمن کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد ابومسلم نے موسیٰ بن کعب التیمی کو مامور کیا۔ منصور نے اس سے بھی مقابلہ کیا لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی اس کا ایک بھائی مارا گیا اور وہ خود بھی صحرائیں شدت تشنگی سے مرگیا۔

موسیٰ نے فتح حاصل کرنے کے بعد منصورہ کی مرمت کرائی، مسجد کو وسیع کیا اور ہندوؤں کے مقابلہ میں کئی بار فتح حاصل کی۔ تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ عہد بنی امیہ کے آخری گورنر کو داؤد ابن علی کے لشکر نے شکست دی تھی۔

سفاح کے بعد خلیفہ منصور کے عہد میں (۱۳۶-۱۳۷ھ) ہشام، سندھ کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے تمام ان شہروں کو فتح کیا جو اس وقت تک مسلمانوں کے اقدام میں حائل تھے اس نے عمرو بن جل کو ایک بیڑہ بوارج (جنگی جہازوں) کا سپرد کر کے پردہ روانہ کیا اور ایک فوج ملک ہند کی طرف روانہ کی جو کشمیر تک پہنچ گئی اور بہت سے قیدی اس کے ہاتھ آئے اور تمام صوبہ ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور قندھار سے ایک جماعت کو (جن پر علویہ ہونے کا شبہ تھا) باہر نکال دیا۔ اس زمانہ میں سندھی اعراب نے قندھار کو بھی فتح کیا اور بت خانہ سمار کر کے ایک مسجد تعمیر کرائی ہشام کے

۱۔ ممکن ہے یہ وہی ابوالخطاب ہو جو عبدالرحمن میں اس میں کا گورنر تھا۔ ۲۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منصور کو سفاح نے مقرر کیا تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے برعکس آباد کے کھنڈر میں سے جو کچھ برآمد ہوئے ہیں ان میں بعض کے منصور کے بھی ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان کی طرف سے وہاں مامور تھا۔ ۳۔ جمع ہے بارجہ کی، بلاذری نے اس لفظ کا استعمال جنگی جہازوں کے لئے کیا ہے وہ جہاز جو جزیرہ سراندیب سے حجاج کے پاس روانہ ہوئے تھے اور ساحل دیبل پر لوٹے گئے تھے ان کو بھی بلاذری نے بوارج لکھا ہے اس کی ایک صدی بعد بیرونی نے بھی کچھ اور سو محلات میں بوارج کے لنگر انداز ہونے کا حال بیان کیا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ بارجہ ایک بڑے جنگی جہاز کو کہتے ہیں۔ انگریزی کا لفظ (Barque) اسی سے ماخوذ ہے۔ ۴۔ بارجو، بارید بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ غالباً اس سے مراد عیسوی دار ہے جو ساحل گجرات پر واقع ہے۔ یہ قریب قریب دیبل سے ۱۰۰ میل دور ہے۔ ابن اثیر اور طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰ میل میں خلیفہ ہندی نے بھی ایک فوج اس جگہ روانہ کی تھی یہ شہر فتح تو ہو گیا لیکن فوج میں بیماری پھیل جانے سے بہت نقصان ہوا اور جو فوج بچ رہی تھی وہ واپسی میں ساحل فارس کے قریب غرق ہو گئی۔ ۵۔ اس سے مراد شہر کشمیر نہیں ہے بلکہ پہاڑ

پنجاب بھی سلطنت کشمیر میں شامل تھا اس لئے سلطنت کشمیر کی حدود میں کسی جگہ یہ فتح حاصل ہوئی ہوگی۔ ۶۔ ابوالفداء - ۲ - ۲۰ - ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴ - ۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ - ۳۳ - ۳۴ - ۳۵ - ۳۶ - ۳۷ - ۳۸ - ۳۹ - ۴۰ - ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ - ۴۴ - ۴۵ - ۴۶ - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۰ - ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۴ - ۵۵ - ۵۶ - ۵۷ - ۵۸ - ۵۹ - ۶۰ - ۶۱ - ۶۲ - ۶۳ - ۶۴ - ۶۵ - ۶۶ - ۶۷ - ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ - ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ - ۷۵ - ۷۶ - ۷۷ - ۷۸ - ۷۹ - ۸۰ - ۸۱ - ۸۲ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - ۸۷ - ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ - ۹۶ - ۹۷ - ۹۸ - ۹۹ - ۱۰۰ - ۱۰۱ - ۱۰۲ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - ۱۰۵ - ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۰۸ - ۱۰۹ - ۱۱۰ - ۱۱۱ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۱۴ - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۱۷ - ۱۱۸ - ۱۱۹ - ۱۲۰ - ۱۲۱ - ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۲۸ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۳۲ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۱۳۵ - ۱۳۶ - ۱۳۷ - ۱۳۸ - ۱۳۹ - ۱۴۰ - ۱۴۱ - ۱۴۲ - ۱۴۳ - ۱۴۴ - ۱۴۵ - ۱۴۶ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۴۹ - ۱۵۰ - ۱۵۱ - ۱۵۲ - ۱۵۳ - ۱۵۴ - ۱۵۵ - ۱۵۶ - ۱۵۷ - ۱۵۸ - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۶۱ - ۱۶۲ - ۱۶۳ - ۱۶۴ - ۱۶۵ - ۱۶۶ - ۱۶۷ - ۱۶۸ - ۱۶۹ - ۱۷۰ - ۱۷۱ - ۱۷۲ - ۱۷۳ - ۱۷۴ - ۱۷۵ - ۱۷۶ - ۱۷۷ - ۱۷۸ - ۱۷۹ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۲ - ۱۸۳ - ۱۸۴ - ۱۸۵ - ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۸ - ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۳ - ۱۹۴ - ۱۹۵ - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۰۰ - ۲۰۱ - ۲۰۲ - ۲۰۳ - ۲۰۴ - ۲۰۵ - ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۰۹ - ۲۱۰ - ۲۱۱ - ۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۴ - ۲۱۵ - ۲۱۶ - ۲۱۷ - ۲۱۸ - ۲۱۹ - ۲۲۰ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸ - ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۱ - ۲۳۲ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ - ۲۵۵ - ۲۵۶ - ۲۵۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۳ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۷۶ - ۲۷۷ - ۲۷۸ - ۲۷۹ - ۲۸۰ - ۲۸۱ - ۲۸۲ - ۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۲۹۵ - ۲۹۶ - ۲۹۷ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۰۰ - ۳۰۱ - ۳۰۲ - ۳۰۳ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ - ۳۰۷ - ۳۰۸ - ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۱ - ۳۱۲ - ۳۱۳ - ۳۱۴ - ۳۱۵ - ۳۱۶ - ۳۱۷ - ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۲۲ - ۳۲۳ - ۳۲۴ - ۳۲۵ - ۳۲۶ - ۳۲۷ - ۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۲ - ۳۳۳ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۰ - ۳۴۱ - ۳۴۲ - ۳۴۳ - ۳۴۴ - ۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷ - ۳۴۸ - ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۲ - ۳۵۳ - ۳۵۴ - ۳۵۵ - ۳۵۶ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۵۹ - ۳۶۰ - ۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۶۴ - ۳۶۵ - ۳۶۶ - ۳۶۷ - ۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۳۷۱ - ۳۷۲ - ۳۷۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹ - ۳۸۰ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۳ - ۳۸۴ - ۳۸۵ - ۳۸۶ - ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۲ - ۳۹۳ - ۳۹۴ - ۳۹۵ - ۳۹۶ - ۳۹۷ - ۳۹۸ - ۳۹۹ - ۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۷ - ۴۰۸ - ۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۱۱ - ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۶ - ۴۱۷ - ۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۱ - ۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۲۴ - ۴۲۵ - ۴۲۶ - ۴۲۷ - ۴۲۸ - ۴۲۹ - ۴۳۰ - ۴۳۱ - ۴۳۲ - ۴۳۳ - ۴۳۴ - ۴۳۵ - ۴۳۶ - ۴۳۷ - ۴۳۸ - ۴۳۹ - ۴۴۰ - ۴۴۱ - ۴۴۲ - ۴۴۳ - ۴۴۴ - ۴۴۵ - ۴۴۶ - ۴۴۷ - ۴۴۸ - ۴۴۹ - ۴۵۰ - ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۴۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۵۷ - ۴۵۸ - ۴۵۹ - ۴۶۰ - ۴۶۱ - ۴۶۲ - ۴۶۳ - ۴۶۴ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۶۷ - ۴۶۸ - ۴۶۹ - ۴۷۰ - ۴۷۱ - ۴۷۲ - ۴۷۳ - ۴۷۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ - ۴۷۷ - ۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۰ - ۴۸۱ - ۴۸۲ - ۴۸۳ - ۴۸۴ - ۴۸۵ - ۴۸۶ - ۴۸۷ - ۴۸۸ - ۴۸۹ - ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۴۹۳ - ۴۹۴ - ۴۹۵ - ۴۹۶ - ۴۹۷ - ۴۹۸ - ۴۹۹ - ۵۰۰ - ۵۰۱ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۰۴ - ۵۰۵ - ۵۰۶ - ۵۰۷ - ۵۰۸ - ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۱ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۱۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۵۱۷ - ۵۱۸ - ۵۱۹ - ۵۲۰ - ۵۲۱ - ۵۲۲ - ۵۲۳ - ۵۲۴ - ۵۲۵ - ۵۲۶ - ۵۲۷ - ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ - ۵۳۱ - ۵۳۲ - ۵۳۳ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - ۵۳۶ - ۵۳۷ - ۵۳۸ - ۵۳۹ - ۵۴۰ - ۵۴۱ - ۵۴۲ - ۵۴۳ - ۵۴۴ - ۵۴۵ - ۵۴۶ - ۵۴۷ - ۵۴۸ - ۵۴۹ - ۵۵۰ - ۵۵۱ - ۵۵۲ - ۵۵۳ - ۵۵۴ - ۵۵۵ - ۵۵۶ - ۵۵۷ - ۵۵۸ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۲ - ۵۶۳ - ۵۶۴ - ۵۶۵ - ۵۶۶ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۶۹ - ۵۷۰ - ۵۷۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳ - ۵۷۴ - ۵۷۵ - ۵۷۶ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۷۹ - ۵۸۰ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - ۵۸۳ - ۵۸۴ - ۵۸۵ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۵۹۱ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۴ - ۵۹۵ - ۵۹۶ - ۵۹۷ - ۵۹۸ - ۵۹۹ - ۶۰۰ - ۶۰۱ - ۶۰۲ - ۶۰۳ - ۶۰۴ - ۶۰۵ - ۶۰۶ - ۶۰۷ - ۶۰۸ - ۶۰۹ - ۶۱۰ - ۶۱۱ - ۶۱۲ - ۶۱۳ - ۶۱۴ - ۶۱۵ - ۶۱۶ - ۶۱۷ - ۶۱۸ - ۶۱۹ - ۶۲۰ - ۶۲۱ - ۶۲۲ - ۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۵ - ۶۲۶ - ۶۲۷ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۳۰ - ۶۳۱ - ۶۳۲ - ۶۳۳ - ۶۳۴ - ۶۳۵ - ۶۳۶ - ۶۳۷ - ۶۳۸ - ۶۳۹ - ۶۴۰ - ۶۴۱ - ۶۴۲ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۴۷ - ۶۴۸ - ۶۴۹ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۵۲ - ۶۵۳ - ۶۵۴ - ۶۵۵ - ۶۵۶ - ۶۵۷ - ۶۵۸ - ۶۵۹ - ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲ - ۶۶۳ - ۶۶۴ - ۶۶۵ - ۶۶۶ - ۶۶۷ - ۶۶۸ - ۶۶۹ - ۶۷۰ - ۶۷۱ - ۶۷۲ - ۶۷۳ - ۶۷۴ - ۶۷۵ - ۶۷۶ - ۶۷۷ - ۶۷۸ - ۶۷۹ - ۶۸۰ - ۶۸۱ - ۶۸۲ - ۶۸۳ - ۶۸۴ - ۶۸۵ - ۶۸۶ - ۶۸۷ - ۶۸۸ - ۶۸۹ - ۶۹۰ - ۶۹۱ - ۶۹۲ - ۶۹۳ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۶۹۶ - ۶۹۷ - ۶۹۸ - ۶۹۹ - ۷۰۰ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - ۷۰۳ - ۷۰۴ - ۷۰۵ - ۷۰۶ - ۷۰۷ - ۷۰۸ - ۷۰۹ - ۷۱۰ - ۷۱۱ - ۷۱۲ - ۷۱۳ - ۷۱۴ - ۷۱۵ - ۷۱۶ - ۷۱۷ - ۷۱۸ - ۷۱۹ - ۷۲۰ - ۷۲۱ - ۷۲۲ - ۷۲۳ - ۷۲۴ - ۷۲۵ - ۷۲۶ - ۷۲۷ - ۷۲۸ - ۷۲۹ - ۷۳۰ - ۷۳۱ - ۷۳۲ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۵ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۳۹ - ۷۴۰ - ۷۴۱ - ۷۴۲ - ۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۵ - ۷۴۶ - ۷۴۷ - ۷۴۸ - ۷۴۹ - ۷۵۰ - ۷۵۱ - ۷۵۲ - ۷۵۳ - ۷۵۴ - ۷۵۵ - ۷۵۶ - ۷۵۷ - ۷۵۸ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۱ - ۷۶۲ - ۷۶۳ - ۷۶۴ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۶۷ - ۷۶۸ - ۷۶۹ - ۷۷۰ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۳ - ۷۷۴ - ۷۷۵ - ۷۷۶ - ۷۷۷ - ۷۷۸ - ۷۷۹ - ۷۸۰ - ۷۸۱ - ۷۸۲ - ۷۸۳ - ۷۸۴ - ۷۸۵ - ۷۸۶ - ۷۸۷ - ۷۸۸ - ۷۸۹ - ۷۹۰ - ۷۹۱ - ۷۹۲ - ۷۹۳ - ۷۹۴ - ۷۹۵ - ۷۹۶ - ۷۹۷ - ۷۹۸ - ۷۹۹ - ۸۰۰ - ۸۰۱ - ۸۰۲ - ۸۰۳ - ۸۰۴ - ۸۰۵ - ۸۰۶ - ۸۰۷ - ۸۰۸ - ۸۰۹ - ۸۱۰ - ۸۱۱ - ۸۱۲ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۵ - ۸۱۶ - ۸۱۷ - ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۰ - ۸۲۱ - ۸۲۲ - ۸۲۳ - ۸۲۴ - ۸۲۵ - ۸۲۶ - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۲۹ - ۸۳۰ - ۸۳۱ - ۸۳۲ - ۸۳۳ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۶ - ۸۳۷ - ۸۳۸ - ۸۳۹ - ۸۴۰ - ۸۴۱ - ۸۴۲ - ۸۴۳ - ۸۴۴ - ۸۴۵ - ۸۴۶ - ۸۴۷ - ۸۴۸ - ۸۴۹ - ۸۵۰ - ۸۵۱ - ۸۵۲ - ۸۵۳ - ۸۵۴ - ۸۵۵ - ۸۵۶ - ۸۵۷ - ۸۵۸ - ۸۵۹ - ۸۶۰ - ۸۶۱ - ۸۶۲ - ۸۶۳ - ۸۶۴ - ۸۶۵ - ۸۶۶ - ۸۶۷ - ۸۶۸ - ۸۶۹ - ۸۷۰ - ۸۷۱ - ۸۷۲ - ۸۷۳ - ۸۷۴ - ۸۷۵ - ۸۷۶ - ۸۷۷ - ۸۷۸ - ۸۷۹ - ۸۸۰ - ۸۸۱ - ۸۸۲ - ۸۸۳ - ۸۸۴ - ۸۸۵ - ۸۸۶ - ۸۸۷ - ۸۸۸ - ۸۸۹ - ۸۹۰ - ۸۹۱ - ۸۹۲ - ۸۹۳ - ۸۹۴ - ۸۹۵ - ۸۹۶ - ۸۹۷ - ۸۹۸ - ۸۹۹ - ۹۰۰ - ۹۰۱ - ۹۰۲ - ۹۰۳ - ۹۰۴ - ۹۰۵ - ۹۰۶ - ۹۰۷ - ۹۰۸ - ۹۰۹ - ۹۱۰ - ۹۱۱ - ۹۱۲ - ۹۱۳ - ۹۱۴ - ۹۱۵ - ۹۱۶ - ۹۱۷ - ۹۱۸ - ۹۱۹ - ۹۲۰ - ۹۲۱ - ۹۲۲ - ۹۲۳ - ۹۲۴ - ۹۲۵ - ۹۲۶ - ۹۲۷ - ۹۲۸ - ۹۲۹ - ۹۳۰ - ۹۳۱ - ۹۳۲ - ۹۳۳ - ۹۳۴ - ۹۳۵ - ۹۳۶ - ۹۳۷ - ۹۳۸ - ۹۳۹ - ۹۴۰ - ۹۴۱ - ۹۴۲ - ۹۴۳ - ۹۴۴ - ۹۴۵ - ۹۴۶ - ۹۴۷ - ۹۴۸ - ۹۴۹ - ۹۵۰ - ۹۵۱ - ۹۵۲ - ۹۵۳ - ۹۵۴ - ۹۵۵ - ۹۵۶ - ۹۵۷ - ۹۵۸ - ۹۵۹ - ۹۶۰ - ۹۶۱ - ۹۶۲ - ۹۶۳ - ۹۶۴ - ۹۶۵ - ۹۶۶ - ۹۶۷ - ۹۶۸ - ۹۶۹ - ۹۷۰ - ۹۷۱ - ۹۷۲ - ۹۷۳ - ۹۷۴ - ۹۷۵ - ۹۷۶ - ۹۷۷ - ۹۷۸ - ۹۷۹ - ۹۸۰ - ۹۸۱ - ۹۸۲ - ۹۸۳ - ۹۸۴ - ۹۸۵ - ۹۸۶ - ۹۸۷ - ۹۸۸ - ۹۸۹ - ۹۹۰ - ۹۹۱ - ۹۹۲ - ۹۹۳ - ۹۹۴ - ۹۹۵ - ۹۹۶ - ۹۹۷ - ۹۹۸ - ۹۹۹ - ۱۰۰۰

بعد عمر و بن جحش بن عثمان گورنر مقرر ہوا یہ تقرری ۱۵۱ھ سے پہلے ہوئی۔ کیونکہ ۱۵۱ھ میں عمر و بن جحش حکومت افریقہ پر تبدیل کیا گیا اور ۱۵۲ھ میں وہیں وہ مارا گیا۔

عمر و بن جحش کے بعد افریقہ کا حاکم یزید بن حاتم مقرر ہوا اور سندھ میں یزید کا بھائی روح متعین کیا گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں (۱۹۳-۱۹۴ھ) افریقہ سندھ کے گورنروں میں بہت تبدیلی و قوع میں آئی اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ وہ ایک جگہ زیادہ دن رہنے سے خود سر ہو جائیں گے اور ملک پر ان کا اقتدار قائم ہو کر خلافت کا اثر ضعیف ہو جائے گا۔ ہارون کے زمانے میں داؤد بن یزید پہلی ۱۸۴ھ کے قریب سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن وہ جلد مر گیا۔ سندھ کی مقامی تاجروں سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد سے قبل حاجی ترابی یا ابو تراب گورنر مقرر کیا گیا تھا اس نے ضلع ساکورہ میں قلعہ تعمیر کیا اور مغربی سندھ میں بلاد بکر اور بھم پور کو فتح کیا اس کا مقبرہ جس پر ۱۸۱ھ منقوش ہے، ٹھٹھہ سے آٹھ میل شمال مغرب کی طرف ماہین گوجا و گوری زیارت گاہ عوام ہے۔ ہارون الرشید کے عہد میں ایک گورنر ابو العباس بھی ہوا ہے جو سندھ تک سندھ پر حکومت کرتا رہا۔

ہارون الرشید کے زمانہ میں (۱۹۳-۲۱۸ھ) بشر بن داؤد سندھ کے حاکم اعلیٰ نے بغاوت اختیار کی اور خراج بھیجنا بند کر دیا۔ غسان بن عباد کو فی جو خلیفہ کا عزیز بھی تھا۔ ۲۱۳ھ میں اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ بشر نے ہتھیار ڈال دیے اور غسان اسے بغداد لے گیا لیکن خلیفہ نے اس کا قصور معاف کر دیا۔

غسان بغداد جاتے وقت موسیٰ بن یحییٰ برکی کو جو فضل اور جعفر برکی کا چھوٹا بھائی تھا، سندھ کی حکومت سپرد کر گیا۔ تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ موسیٰ بن یحییٰ برکی ہارون الرشید کے زمانہ میں سندھ کا حاکم مقرر ہوا تھا لیکن اس نے زخرج صرف کر ڈالا اس لئے محکومہ کر دیا گیا اور اس کے بعد علی بن عیسیٰ ہارون مقرر ہوا۔ موسیٰ عرصہ دراز تک سندھ کا حاکم رہا جب ۲۲۱ھ میں اس کا انتقال ہوا تو عہد ”مستقیم باللہ“ میں اس کا بیٹا عمران گورنر مقرر ہوا اس نے قیقان کو فتح کیا جو جاٹوں کے قبضہ میں تھا اور شہر ”الینما“ کی بنیاد ڈال کر اسے ایک فوجی مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد وہ منصورہ واپس آیا اور پھر قندھار میں پہنچا۔

۱۔ تقریبی واپس آئے کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام عمر بن جحش کے بعد گورنر سندھ مقرر ہوا۔ ۲۲۴ھ - ۲۲۵ھ - ۲۲۶ھ - ۲۲۷ھ - ۲۲۸ھ - ۲۲۹ھ - ۲۳۰ھ - ۲۳۱ھ - ۲۳۲ھ - ۲۳۳ھ - ۲۳۴ھ - ۲۳۵ھ - ۲۳۶ھ - ۲۳۷ھ - ۲۳۸ھ - ۲۳۹ھ - ۲۴۰ھ - ۲۴۱ھ - ۲۴۲ھ - ۲۴۳ھ - ۲۴۴ھ - ۲۴۵ھ - ۲۴۶ھ - ۲۴۷ھ - ۲۴۸ھ - ۲۴۹ھ - ۲۵۰ھ - ۲۵۱ھ - ۲۵۲ھ - ۲۵۳ھ - ۲۵۴ھ - ۲۵۵ھ - ۲۵۶ھ - ۲۵۷ھ - ۲۵۸ھ - ۲۵۹ھ - ۲۶۰ھ - ۲۶۱ھ - ۲۶۲ھ - ۲۶۳ھ - ۲۶۴ھ - ۲۶۵ھ - ۲۶۶ھ - ۲۶۷ھ - ۲۶۸ھ - ۲۶۹ھ - ۲۷۰ھ - ۲۷۱ھ - ۲۷۲ھ - ۲۷۳ھ - ۲۷۴ھ - ۲۷۵ھ - ۲۷۶ھ - ۲۷۷ھ - ۲۷۸ھ - ۲۷۹ھ - ۲۸۰ھ - ۲۸۱ھ - ۲۸۲ھ - ۲۸۳ھ - ۲۸۴ھ - ۲۸۵ھ - ۲۸۶ھ - ۲۸۷ھ - ۲۸۸ھ - ۲۸۹ھ - ۲۹۰ھ - ۲۹۱ھ - ۲۹۲ھ - ۲۹۳ھ - ۲۹۴ھ - ۲۹۵ھ - ۲۹۶ھ - ۲۹۷ھ - ۲۹۸ھ - ۲۹۹ھ - ۳۰۰ھ - ۳۰۱ھ - ۳۰۲ھ - ۳۰۳ھ - ۳۰۴ھ - ۳۰۵ھ - ۳۰۶ھ - ۳۰۷ھ - ۳۰۸ھ - ۳۰۹ھ - ۳۱۰ھ - ۳۱۱ھ - ۳۱۲ھ - ۳۱۳ھ - ۳۱۴ھ - ۳۱۵ھ - ۳۱۶ھ - ۳۱۷ھ - ۳۱۸ھ - ۳۱۹ھ - ۳۲۰ھ - ۳۲۱ھ - ۳۲۲ھ - ۳۲۳ھ - ۳۲۴ھ - ۳۲۵ھ - ۳۲۶ھ - ۳۲۷ھ - ۳۲۸ھ - ۳۲۹ھ - ۳۳۰ھ - ۳۳۱ھ - ۳۳۲ھ - ۳۳۳ھ - ۳۳۴ھ - ۳۳۵ھ - ۳۳۶ھ - ۳۳۷ھ - ۳۳۸ھ - ۳۳۹ھ - ۳۴۰ھ - ۳۴۱ھ - ۳۴۲ھ - ۳۴۳ھ - ۳۴۴ھ - ۳۴۵ھ - ۳۴۶ھ - ۳۴۷ھ - ۳۴۸ھ - ۳۴۹ھ - ۳۵۰ھ - ۳۵۱ھ - ۳۵۲ھ - ۳۵۳ھ - ۳۵۴ھ - ۳۵۵ھ - ۳۵۶ھ - ۳۵۷ھ - ۳۵۸ھ - ۳۵۹ھ - ۳۶۰ھ - ۳۶۱ھ - ۳۶۲ھ - ۳۶۳ھ - ۳۶۴ھ - ۳۶۵ھ - ۳۶۶ھ - ۳۶۷ھ - ۳۶۸ھ - ۳۶۹ھ - ۳۷۰ھ - ۳۷۱ھ - ۳۷۲ھ - ۳۷۳ھ - ۳۷۴ھ - ۳۷۵ھ - ۳۷۶ھ - ۳۷۷ھ - ۳۷۸ھ - ۳۷۹ھ - ۳۸۰ھ - ۳۸۱ھ - ۳۸۲ھ - ۳۸۳ھ - ۳۸۴ھ - ۳۸۵ھ - ۳۸۶ھ - ۳۸۷ھ - ۳۸۸ھ - ۳۸۹ھ - ۳۹۰ھ - ۳۹۱ھ - ۳۹۲ھ - ۳۹۳ھ - ۳۹۴ھ - ۳۹۵ھ - ۳۹۶ھ - ۳۹۷ھ - ۳۹۸ھ - ۳۹۹ھ - ۴۰۰ھ - ۴۰۱ھ - ۴۰۲ھ - ۴۰۳ھ - ۴۰۴ھ - ۴۰۵ھ - ۴۰۶ھ - ۴۰۷ھ - ۴۰۸ھ - ۴۰۹ھ - ۴۱۰ھ - ۴۱۱ھ - ۴۱۲ھ - ۴۱۳ھ - ۴۱۴ھ - ۴۱۵ھ - ۴۱۶ھ - ۴۱۷ھ - ۴۱۸ھ - ۴۱۹ھ - ۴۲۰ھ - ۴۲۱ھ - ۴۲۲ھ - ۴۲۳ھ - ۴۲۴ھ - ۴۲۵ھ - ۴۲۶ھ - ۴۲۷ھ - ۴۲۸ھ - ۴۲۹ھ - ۴۳۰ھ - ۴۳۱ھ - ۴۳۲ھ - ۴۳۳ھ - ۴۳۴ھ - ۴۳۵ھ - ۴۳۶ھ - ۴۳۷ھ - ۴۳۸ھ - ۴۳۹ھ - ۴۴۰ھ - ۴۴۱ھ - ۴۴۲ھ - ۴۴۳ھ - ۴۴۴ھ - ۴۴۵ھ - ۴۴۶ھ - ۴۴۷ھ - ۴۴۸ھ - ۴۴۹ھ - ۴۵۰ھ - ۴۵۱ھ - ۴۵۲ھ - ۴۵۳ھ - ۴۵۴ھ - ۴۵۵ھ - ۴۵۶ھ - ۴۵۷ھ - ۴۵۸ھ - ۴۵۹ھ - ۴۶۰ھ - ۴۶۱ھ - ۴۶۲ھ - ۴۶۳ھ - ۴۶۴ھ - ۴۶۵ھ - ۴۶۶ھ - ۴۶۷ھ - ۴۶۸ھ - ۴۶۹ھ - ۴۷۰ھ - ۴۷۱ھ - ۴۷۲ھ - ۴۷۳ھ - ۴۷۴ھ - ۴۷۵ھ - ۴۷۶ھ - ۴۷۷ھ - ۴۷۸ھ - ۴۷۹ھ - ۴۸۰ھ - ۴۸۱ھ - ۴۸۲ھ - ۴۸۳ھ - ۴۸۴ھ - ۴۸۵ھ - ۴۸۶ھ - ۴۸۷ھ - ۴۸۸ھ - ۴۸۹ھ - ۴۹۰ھ - ۴۹۱ھ - ۴۹۲ھ - ۴۹۳ھ - ۴۹۴ھ - ۴۹۵ھ - ۴۹۶ھ - ۴۹۷ھ - ۴۹۸ھ - ۴۹۹ھ - ۵۰۰ھ - ۵۰۱ھ - ۵۰۲ھ - ۵۰۳ھ - ۵۰۴ھ - ۵۰۵ھ - ۵۰۶ھ - ۵۰۷ھ - ۵۰۸ھ - ۵۰۹ھ - ۵۱۰ھ - ۵۱۱ھ - ۵۱۲ھ - ۵۱۳ھ - ۵۱۴ھ - ۵۱۵ھ - ۵۱۶ھ - ۵۱۷ھ - ۵۱۸ھ - ۵۱۹ھ - ۵۲۰ھ - ۵۲۱ھ - ۵۲۲ھ - ۵۲۳ھ - ۵۲۴ھ - ۵۲۵ھ - ۵۲۶ھ - ۵۲۷ھ - ۵۲۸ھ - ۵۲۹ھ - ۵۳۰ھ - ۵۳۱ھ - ۵۳۲ھ - ۵۳۳ھ - ۵۳۴ھ - ۵۳۵ھ - ۵۳۶ھ - ۵۳۷ھ - ۵۳۸ھ - ۵۳۹ھ - ۵۴۰ھ - ۵۴۱ھ - ۵۴۲ھ - ۵۴۳ھ - ۵۴۴ھ - ۵۴۵ھ - ۵۴۶ھ - ۵۴۷ھ - ۵۴۸ھ - ۵۴۹ھ - ۵۵۰ھ - ۵۵۱ھ - ۵۵۲ھ - ۵۵۳ھ - ۵۵۴ھ - ۵۵۵ھ - ۵۵۶ھ - ۵۵۷ھ - ۵۵۸ھ - ۵۵۹ھ - ۵۶۰ھ - ۵۶۱ھ - ۵۶۲ھ - ۵۶۳ھ - ۵۶۴ھ - ۵۶۵ھ - ۵۶۶ھ - ۵۶۷ھ - ۵۶۸ھ - ۵۶۹ھ - ۵۷۰ھ - ۵۷۱ھ - ۵۷۲ھ - ۵۷۳ھ - ۵۷۴ھ - ۵۷۵ھ - ۵۷۶ھ - ۵۷۷ھ - ۵۷۸ھ - ۵۷۹ھ - ۵۸۰ھ - ۵۸۱ھ - ۵۸۲ھ - ۵۸۳ھ - ۵۸۴ھ - ۵۸۵ھ - ۵۸۶ھ - ۵۸۷ھ - ۵۸۸ھ - ۵۸۹ھ - ۵۹۰ھ - ۵۹۱ھ - ۵۹۲ھ - ۵۹۳ھ - ۵۹۴ھ - ۵۹۵ھ - ۵۹۶ھ - ۵۹۷ھ - ۵۹۸ھ - ۵۹۹ھ - ۶۰۰ھ - ۶۰۱ھ - ۶۰۲ھ - ۶۰۳ھ - ۶۰۴ھ - ۶۰۵ھ - ۶۰۶ھ - ۶۰۷ھ - ۶۰۸ھ - ۶۰۹ھ - ۶۱۰ھ - ۶۱۱ھ - ۶۱۲ھ - ۶۱۳ھ - ۶۱۴ھ - ۶۱۵ھ - ۶۱۶ھ - ۶۱۷ھ - ۶۱۸ھ - ۶۱۹ھ - ۶۲۰ھ - ۶۲۱ھ - ۶۲۲ھ - ۶۲۳ھ - ۶۲۴ھ - ۶۲۵ھ - ۶۲۶ھ - ۶۲۷ھ - ۶۲۸ھ - ۶۲۹ھ - ۶۳۰ھ - ۶۳۱ھ - ۶۳۲ھ - ۶۳۳ھ - ۶۳۴ھ - ۶۳۵ھ - ۶۳۶ھ - ۶۳۷ھ - ۶۳۸ھ - ۶۳۹ھ - ۶۴۰ھ - ۶۴۱ھ - ۶۴۲ھ - ۶۴۳ھ - ۶۴۴ھ - ۶۴۵ھ - ۶۴۶ھ - ۶۴۷ھ - ۶۴۸ھ - ۶۴۹ھ - ۶۵۰ھ - ۶۵۱ھ - ۶۵۲ھ - ۶۵۳ھ - ۶۵۴ھ - ۶۵۵ھ - ۶۵۶ھ - ۶۵۷ھ - ۶۵۸ھ - ۶۵۹ھ - ۶۶۰ھ - ۶۶۱ھ - ۶۶۲ھ - ۶۶۳ھ - ۶۶۴ھ - ۶۶۵ھ - ۶۶۶ھ - ۶۶۷ھ - ۶۶۸ھ - ۶۶۹ھ - ۶۷۰ھ - ۶۷۱ھ - ۶۷۲ھ - ۶۷۳ھ - ۶۷۴ھ - ۶۷۵ھ - ۶۷۶ھ - ۶۷۷ھ - ۶۷۸ھ - ۶۷۹ھ - ۶۸۰ھ - ۶۸۱ھ - ۶۸۲ھ - ۶۸۳ھ - ۶۸۴ھ - ۶۸۵ھ - ۶۸۶ھ - ۶۸۷ھ - ۶۸۸ھ - ۶۸۹ھ - ۶۹۰ھ - ۶۹۱ھ - ۶۹۲ھ - ۶۹۳ھ - ۶۹۴ھ - ۶۹۵ھ - ۶۹۶ھ - ۶۹۷ھ - ۶۹۸ھ - ۶۹۹ھ - ۷۰۰ھ - ۷۰۱ھ - ۷۰۲ھ - ۷۰۳ھ - ۷۰۴ھ - ۷۰۵ھ - ۷۰۶ھ - ۷۰۷ھ - ۷۰۸ھ - ۷۰۹ھ - ۷۱۰ھ - ۷۱۱ھ - ۷۱۲ھ - ۷۱۳ھ - ۷۱۴ھ - ۷۱۵ھ - ۷۱۶ھ - ۷۱۷ھ - ۷۱۸ھ - ۷۱۹ھ - ۷۲۰ھ - ۷۲۱ھ - ۷۲۲ھ - ۷۲۳ھ - ۷۲۴ھ - ۷۲۵ھ - ۷۲۶ھ - ۷۲۷ھ - ۷۲۸ھ - ۷۲۹ھ - ۷۳۰ھ - ۷۳۱ھ - ۷۳۲ھ - ۷۳۳ھ - ۷۳۴ھ - ۷۳۵ھ - ۷۳۶ھ - ۷۳۷ھ - ۷۳۸ھ - ۷۳۹ھ - ۷۴۰ھ - ۷۴۱ھ - ۷۴۲ھ - ۷۴۳ھ - ۷۴۴ھ - ۷۴۵ھ - ۷۴۶ھ - ۷۴۷ھ - ۷۴۸ھ - ۷۴۹ھ - ۷۵۰ھ - ۷۵۱ھ - ۷۵۲ھ - ۷۵۳ھ - ۷۵۴ھ - ۷۵۵ھ - ۷۵۶ھ - ۷۵۷ھ - ۷۵۸ھ - ۷۵۹ھ - ۷۶۰ھ - ۷۶۱ھ - ۷۶۲ھ - ۷۶۳ھ - ۷۶۴ھ - ۷۶۵ھ - ۷۶۶ھ - ۷۶۷ھ - ۷۶۸ھ - ۷۶۹ھ - ۷۷۰ھ - ۷۷۱ھ - ۷۷۲ھ - ۷۷۳ھ - ۷۷۴ھ - ۷۷۵ھ - ۷۷۶ھ - ۷۷۷ھ - ۷۷۸ھ - ۷۷۹ھ - ۷۸۰ھ - ۷۸۱ھ - ۷۸۲ھ - ۷۸۳ھ - ۷۸۴ھ - ۷۸۵ھ - ۷۸۶ھ - ۷۸۷ھ - ۷۸۸ھ - ۷۸۹ھ - ۷۹۰ھ - ۷۹۱ھ - ۷۹۲ھ - ۷۹۳ھ - ۷۹۴ھ - ۷۹۵ھ - ۷۹۶ھ - ۷۹۷ھ - ۷۹۸ھ - ۷۹۹ھ - ۸۰۰ھ - ۸۰۱ھ - ۸۰۲ھ - ۸۰۳ھ - ۸۰۴ھ - ۸۰۵ھ - ۸۰۶ھ - ۸۰۷ھ - ۸۰۸ھ - ۸۰۹ھ - ۸۱۰ھ - ۸۱۱ھ - ۸۱۲ھ - ۸۱۳ھ - ۸۱۴ھ - ۸۱۵ھ - ۸۱۶ھ - ۸۱۷ھ - ۸۱۸ھ - ۸۱۹ھ - ۸۲۰ھ - ۸۲۱ھ - ۸۲۲ھ - ۸۲۳ھ - ۸۲۴ھ - ۸۲۵ھ - ۸۲۶ھ - ۸۲۷ھ - ۸۲۸ھ - ۸۲۹ھ - ۸۳۰ھ - ۸۳۱ھ - ۸۳۲ھ - ۸۳۳ھ - ۸۳۴ھ - ۸۳۵ھ - ۸۳۶ھ - ۸۳۷ھ - ۸۳۸ھ - ۸۳۹ھ - ۸۴۰ھ - ۸۴۱ھ - ۸۴۲ھ - ۸۴۳ھ - ۸۴۴ھ - ۸۴۵ھ - ۸۴۶ھ - ۸۴۷ھ - ۸۴۸ھ - ۸۴۹ھ - ۸۵۰ھ - ۸۵۱ھ - ۸۵۲ھ - ۸۵۳ھ - ۸۵۴ھ - ۸۵۵ھ - ۸۵۶ھ - ۸۵۷ھ - ۸۵۸ھ - ۸۵۹ھ - ۸۶۰ھ - ۸۶۱ھ - ۸۶۲ھ - ۸۶۳ھ - ۸۶۴ھ - ۸۶۵ھ - ۸۶۶ھ - ۸۶۷ھ - ۸۶۸ھ - ۸۶۹ھ - ۸۷۰ھ - ۸۷۱ھ - ۸۷۲ھ - ۸۷۳ھ - ۸۷۴ھ - ۸۷۵ھ - ۸۷۶ھ - ۸۷۷ھ - ۸۷۸ھ - ۸۷۹ھ - ۸۸۰ھ - ۸۸۱ھ - ۸۸۲ھ - ۸۸۳ھ - ۸۸۴ھ - ۸۸۵ھ - ۸۸۶ھ - ۸۸۷ھ - ۸۸۸ھ - ۸۸۹ھ - ۸۹۰ھ - ۸۹۱ھ - ۸۹۲ھ - ۸۹۳ھ - ۸۹۴ھ - ۸۹۵ھ - ۸۹۶ھ - ۸۹۷ھ - ۸۹۸ھ - ۸۹۹ھ - ۹۰۰ھ - ۹۰۱ھ - ۹۰۲ھ - ۹۰۳ھ - ۹۰۴ھ - ۹۰۵ھ - ۹۰۶ھ - ۹۰۷ھ - ۹۰۸ھ - ۹۰۹ھ - ۹۱۰ھ - ۹۱۱ھ - ۹۱۲ھ - ۹۱۳ھ - ۹۱۴ھ - ۹۱۵ھ - ۹۱۶ھ - ۹۱۷ھ - ۹۱۸ھ - ۹۱۹ھ - ۹۲۰ھ - ۹۲۱ھ - ۹۲۲ھ - ۹۲۳ھ - ۹۲۴ھ - ۹۲۵ھ - ۹۲۶ھ - ۹۲۷ھ - ۹۲۸ھ - ۹۲۹ھ - ۹۳۰ھ - ۹۳۱ھ - ۹۳۲ھ - ۹۳۳ھ - ۹۳۴ھ - ۹۳۵ھ - ۹۳۶ھ - ۹۳۷ھ - ۹۳۸ھ - ۹۳۹ھ - ۹۴۰ھ - ۹۴۱ھ - ۹۴۲ھ - ۹۴۳ھ - ۹۴۴ھ - ۹۴۵ھ - ۹۴۶ھ - ۹۴۷ھ - ۹۴۸ھ - ۹۴۹ھ - ۹۵۰ھ - ۹۵۱ھ - ۹۵۲ھ - ۹۵۳ھ - ۹۵۴ھ - ۹۵۵ھ - ۹۵۶ھ - ۹۵۷ھ - ۹۵۸ھ - ۹۵۹ھ - ۹۶۰ھ - ۹۶۱ھ - ۹۶۲ھ - ۹۶۳ھ - ۹۶۴ھ - ۹۶۵ھ - ۹۶۶ھ - ۹۶۷ھ - ۹۶۸ھ - ۹۶۹ھ - ۹۷۰ھ - ۹۷۱ھ - ۹۷۲ھ - ۹۷۳ھ - ۹۷۴ھ - ۹۷۵ھ - ۹۷۶ھ - ۹۷۷ھ - ۹۷۸ھ - ۹۷۹ھ - ۹۸۰ھ - ۹۸۱ھ - ۹۸۲ھ - ۹۸۳ھ - ۹۸۴ھ - ۹۸۵ھ - ۹۸۶ھ - ۹۸۷ھ - ۹۸۸ھ - ۹۸۹ھ - ۹۹۰ھ - ۹۹۱ھ - ۹۹۲ھ - ۹۹۳ھ - ۹۹۴ھ - ۹۹۵ھ - ۹۹۶ھ - ۹۹۷ھ - ۹۹۸ھ - ۹۹۹ھ - ۱۰۰۰ھ - ۱۰۰۱ھ - ۱۰۰۲ھ - ۱۰۰۳ھ - ۱۰۰۴ھ - ۱۰۰۵ھ - ۱۰۰۶ھ - ۱۰۰۷ھ - ۱۰۰۸ھ - ۱۰۰۹ھ - ۱۰۱۰ھ - ۱۰۱۱ھ - ۱۰۱۲ھ - ۱۰۱۳ھ - ۱۰۱۴ھ - ۱۰۱۵ھ - ۱۰۱۶ھ - ۱۰۱۷ھ - ۱۰۱۸ھ - ۱۰۱۹ھ - ۱۰۲۰ھ - ۱۰۲۱ھ - ۱۰۲۲ھ - ۱۰۲۳ھ - ۱۰۲۴ھ - ۱۰۲۵ھ - ۱۰۲۶ھ - ۱۰۲۷ھ - ۱۰۲۸ھ - ۱۰۲۹ھ - ۱۰۳۰ھ - ۱۰۳۱ھ - ۱۰۳۲ھ - ۱۰۳۳ھ - ۱۰۳۴ھ - ۱۰۳۵ھ - ۱۰۳۶ھ - ۱۰۳۷ھ - ۱۰۳۸ھ - ۱۰۳۹ھ - ۱۰۴۰ھ - ۱۰۴۱ھ - ۱۰۴۲ھ - ۱۰۴۳ھ - ۱۰۴۴ھ - ۱۰۴۵ھ - ۱۰۴۶ھ - ۱۰۴۷ھ - ۱۰۴۸ھ - ۱۰۴۹ھ - ۱۰۵۰ھ - ۱۰۵۱ھ - ۱۰۵۲ھ - ۱۰۵۳ھ - ۱۰۵۴ھ - ۱۰۵۵ھ - ۱۰۵۶ھ - ۱۰۵۷ھ - ۱۰۵۸ھ - ۱۰۵۹ھ - ۱۰۶۰ھ - ۱۰۶۱ھ - ۱۰۶۲ھ - ۱۰۶۳ھ - ۱۰۶۴ھ - ۱۰۶۵ھ - ۱۰۶۶ھ - ۱۰۶۷ھ - ۱۰۶۸ھ - ۱۰۶۹ھ - ۱۰۷۰ھ - ۱۰۷۱ھ - ۱۰۷۲ھ - ۱۰۷۳ھ - ۱۰۷۴ھ - ۱۰۷۵ھ - ۱۰۷۶ھ - ۱۰۷۷ھ - ۱۰۷۸ھ - ۱۰۷۹ھ - ۱۰۸۰ھ - ۱۰۸۱ھ - ۱۰۸۲ھ - ۱۰۸۳ھ - ۱۰۸۴ھ - ۱۰۸۵ھ - ۱۰۸۶ھ - ۱۰۸۷ھ - ۱۰۸۸ھ - ۱۰۸۹ھ - ۱۰۹۰ھ - ۱۰۹۱ھ - ۱۰۹۲ھ - ۱۰۹۳ھ - ۱۰۹۴ھ - ۱۰۹۵ھ - ۱۰۹۶ھ - ۱۰۹۷ھ - ۱۰۹۸ھ - ۱۰۹۹ھ - ۱۱۰۰ھ - ۱۱۰۱ھ - ۱۱۰۲ھ - ۱۱۰۳ھ - ۱۱۰۴ھ - ۱۱۰۵ھ - ۱۱۰۶ھ - ۱۱۰۷ھ - ۱۱۰۸ھ - ۱۱۰۹ھ - ۱۱۱۰ھ - ۱۱۱۱ھ - ۱۱۱۲ھ - ۱۱۱۳ھ - ۱۱۱۴ھ - ۱۱۱۵ھ - ۱۱۱۶ھ - ۱۱۱۷ھ - ۱۱۱۸ھ - ۱۱۱۹ھ - ۱۱۲۰ھ - ۱۱۲۱ھ - ۱۱۲۲ھ - ۱۱۲۳ھ - ۱۱۲۴ھ - ۱۱۲۵ھ - ۱۱۲۶ھ - ۱۱۲۷ھ - ۱۱۲۸ھ - ۱۱۲۹ھ - ۱۱۳۰ھ - ۱۱۳۱ھ - ۱۱۳۲ھ - ۱۱۳۳ھ - ۱۱۳۴ھ - ۱۱۳۵ھ - ۱۱۳۶ھ - ۱۱۳۷ھ - ۱۱۳۸ھ - ۱۱۳۹ھ - ۱۱۴۰ھ - ۱۱۴۱ھ - ۱۱۴۲ھ - ۱۱۴۳ھ - ۱۱۴۴ھ - ۱۱۴۵ھ - ۱۱۴۶ھ - ۱۱۴۷ھ - ۱۱۴۸ھ - ۱۱۴۹ھ - ۱۱۵۰ھ - ۱۱۵۱ھ - ۱۱۵۲ھ - ۱۱۵۳ھ - ۱۱۵۴ھ - ۱۱۵۵ھ - ۱۱۵۶ھ - ۱۱۵۷ھ - ۱۱۵۸ھ - ۱۱۵۹ھ - ۱۱۶۰ھ - ۱۱۶۱ھ - ۱۱۶۲ھ - ۱۱۶۳ھ - ۱۱۶۴ھ - ۱۱۶۵ھ - ۱۱۶۶ھ - ۱۱۶۷ھ - ۱۱۶۸ھ - ۱۱۶۹ھ - ۱۱۷۰ھ - ۱۱۷۱ھ - ۱۱۷۲ھ - ۱۱۷۳ھ - ۱۱۷۴ھ - ۱۱۷۵ھ - ۱۱۷۶ھ - ۱۱۷۷ھ - ۱۱۷۸ھ - ۱۱۷۹ھ - ۱۱۸۰ھ - ۱۱۸۱ھ - ۱۱۸۲ھ - ۱۱۸۳ھ - ۱۱۸۴ھ - ۱۱۸۵ھ - ۱۱۸۶ھ - ۱۱۸۷ھ - ۱۱۸۸ھ - ۱۱۸۹ھ - ۱۱۹۰ھ - ۱۱۹۱ھ - ۱۱۹۲ھ - ۱۱۹۳ھ - ۱۱۹۴ھ - ۱۱۹۵ھ - ۱۱۹۶ھ - ۱۱۹۷ھ - ۱۱۹۸ھ - ۱۱۹۹ھ - ۱۲۰۰ھ - ۱۲۰۱ھ - ۱۲۰۲ھ - ۱۲۰۳ھ - ۱۲۰۴ھ - ۱۲۰۵ھ - ۱۲۰۶ھ - ۱۲۰۷ھ - ۱۲۰۸ھ - ۱۲۰۹ھ - ۱۲۱۰ھ - ۱۲۱۱ھ - ۱۲۱۲ھ - ۱۲۱۳ھ - ۱۲۱۴ھ - ۱۲۱۵ھ - ۱۲۱۶ھ - ۱۲۱۷ھ - ۱۲۱۸ھ - ۱۲۱۹ھ - ۱۲۲۰ھ - ۱۲۲۱ھ - ۱۲۲۲ھ - ۱۲۲۳ھ - ۱۲۲۴ھ - ۱۲۲۵ھ - ۱۲۲۶ھ - ۱۲۲۷ھ - ۱۲۲۸ھ - ۱۲۲۹ھ - ۱۲۳۰ھ - ۱۲۳۱ھ - ۱۲۳۲ھ - ۱۲۳۳ھ - ۱۲۳۴ھ - ۱۲۳۵ھ - ۱۲۳۶ھ - ۱۲۳۷ھ - ۱۲۳۸ھ - ۱۲۳۹ھ - ۱۲۴۰ھ - ۱۲۴۱ھ - ۱۲۴۲ھ - ۱۲۴۳ھ - ۱۲۴۴ھ - ۱۲۴۵ھ - ۱۲۴۶ھ - ۱۲۴۷ھ - ۱۲۴۸ھ - ۱۲۴۹ھ - ۱۲۵۰ھ - ۱۲۵۱ھ - ۱۲۵۲ھ - ۱۲۵۳ھ - ۱۲۵۴ھ - ۱۲۵۵ھ - ۱۲۵۶ھ - ۱۲۵۷ھ - ۱۲۵۸ھ - ۱۲۵۹ھ - ۱۲۶۰ھ - ۱۲۶۱ھ - ۱۲۶۲ھ - ۱۲۶۳ھ - ۱۲۶۴ھ - ۱۲۶۵ھ - ۱۲۶۶ھ - ۱۲۶۷ھ - ۱۲۶۸ھ - ۱۲۶۹ھ - ۱۲۷۰ھ - ۱۲۷۱ھ - ۱۲۷۲ھ - ۱۲۷۳ھ - ۱۲۷۴ھ - ۱۲۷۵ھ - ۱۲۷۶ھ - ۱۲۷۷ھ - ۱۲۷۸ھ - ۱۲۷۹ھ - ۱۲۸۰ھ - ۱۲۸۱ھ - ۱۲۸۲ھ - ۱۲۸۳ھ - ۱۲۸۴ھ - ۱۲۸۵ھ - ۱۲۸۶ھ - ۱۲۸۷ھ - ۱۲۸۸ھ - ۱۲۸۹ھ - ۱۲۹۰ھ - ۱۲۹۱ھ - ۱۲۹۲ھ - ۱۲۹۳ھ - ۱۲۹۴ھ - ۱۲۹۵ھ - ۱۲۹۶ھ - ۱۲۹۷ھ - ۱۲۹۸ھ - ۱۲۹۹ھ - ۱۳۰۰ھ - ۱۳۰۱ھ - ۱۳۰۲ھ - ۱۳۰۳ھ - ۱۳۰۴ھ - ۱۳۰۵ھ - ۱۳۰۶ھ - ۱۳۰۷ھ - ۱۳۰۸ھ - ۱۳۰۹ھ - ۱۳۱۰ھ - ۱۳۱۱ھ - ۱۳۱۲ھ - ۱۳۱۳ھ - ۱۳۱۴ھ - ۱۳۱۵ھ - ۱۳۱۶ھ - ۱۳۱۷ھ - ۱۳۱۸ھ - ۱۳۱۹ھ - ۱۳۲۰ھ - ۱۳۲۱ھ - ۱۳۲۲ھ - ۱۳۲۳ھ - ۱۳۲۴ھ - ۱۳۲۵ھ - ۱۳۲۶ھ - ۱۳۲۷ھ - ۱۳۲۸ھ - ۱۳۲۹ھ - ۱۳۳۰ھ - ۱۳۳۱ھ - ۱۳۳۲ھ - ۱۳۳۳ھ - ۱۳۳۴ھ - ۱۳۳۵ھ - ۱۳۳۶ھ - ۱۳۳۷ھ - ۱۳۳۸ھ - ۱۳۳۹ھ - ۱۳۴۰ھ - ۱۳۴۱ھ - ۱۳۴۲ھ - ۱۳۴۳ھ - ۱۳۴۴ھ - ۱۳۴۵ھ - ۱۳۴۶ھ - ۱۳۴۷ھ - ۱۳۴۸ھ - ۱۳۴۹ھ - ۱۳۵۰ھ - ۱۳۵۱ھ - ۱۳۵۲ھ - ۱۳۵۳ھ - ۱۳۵۴ھ - ۱۳۵۵ھ - ۱۳۵۶ھ - ۱۳۵۷ھ - ۱۳۵۸ھ - ۱۳۵۹ھ - ۱۳۶۰ھ - ۱۳۶۱ھ - ۱۳۶۲ھ - ۱۳۶۳ھ - ۱۳۶۴ھ - ۱۳۶۵ھ - ۱۳۶۶ھ - ۱۳۶۷ھ - ۱۳۶۸ھ - ۱۳۶۹ھ - ۱۳۷۰ھ - ۱۳۷۱ھ - ۱۳۷۲ھ - ۱۳۷۳ھ - ۱۳۷۴ھ - ۱۳۷۵ھ - ۱۳۷۶ھ - ۱۳۷۷ھ - ۱۳۷۸ھ - ۱۳۷۹ھ - ۱۳۸۰ھ - ۱۳۸۱ھ - ۱۳۸۲ھ - ۱۳۸۳

ریاست قصدار اس کا حاکم ایک عرب نژاد معین بن احمد ہے، تیسری ریاست مکران ہے اور اس کا دارالریاست قنبر ہے جو آبادی میں ملتان سے نصف ہے۔ اس کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہے۔ چوتھی ریاست مشکلی، مکران کی سرحد پر ہے۔ منصورہ، ملتان اور دیگر اضلاع میں عربی و سندھی زبانیں بولی جاتی ہیں، مکران میں مکرانی اور فارسی زبان۔

ابن حوقل نے قرامطہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر سندھ میں بعد کو قائم ہوا۔ ابوالفداء کا بیان ہے کہ قرامطہ کو ۳۶۰ھ و ۳۶۳ھ میں مصر کے اندر سخت شکست حاصل ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ اس شکست کے بعد ہی انھوں نے سندھ کی طرف قسمت آزمائی کی ہوگی اور چونکہ سارا سندھ منتشر حالت میں تھا اس لئے انھوں نے منصورہ و ملتان پر قبضہ کر لیا ہوگا جہاں سے ان کو محمود غزنوی نے نکالا۔

ابن اثیر اور دیگر تواریخ سندھ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود نے بھی سندھ میں سلسلہ فتوحات قائم کیا تھا۔ اگرچہ عام طور سے مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے لیکن ایسا ہونا یقینی ہے کیونکہ جب قصدار اور ملتان اس کے قبضہ میں آگیا تھا تو پھر کوئی چیز اس کی پیش قدمی کے لئے مانع نہ تھی۔ چونکہ یہ امر بالکل یقینی ہے کہ سومنات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد چند روز تک اس نے دریائے سندھ کے کنارے کنارے کوچ کیا اس لئے ابن اثیر کا یہ بیان کہ ”۲۱۶ھ میں محمود نے منصورہ پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مسلمان شہزادہ کو تخت نشین کیا“ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو فرارند اوہاں کا تھا مسلمان نہ تھا بلکہ قرامطہ میں سے تھا جنھوں نے تین صدی کی حکومت کو سندھ سے بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔

”نگار“ کے پرانے پرچے

۲۶۱ھ جنوری = ۱۲ — ۳۵۰ھ مئی = ۸ — ۳۱۰ھ جولائی، اگست فی پرچہ ۸ — اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ —
۳۲۰ھ فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ — مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ — ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ — ۳۳۴ھ فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۸ — ۳۳۶ھ دسمبر — ۳۳۷ھ فروری تا جولائی فی پرچہ ۸، اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲ —
۳۴۰ھ فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸ — ۳۴۱ھ مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) — للہ —
۳۴۲ھ مارچ تا مئی فی پرچہ ۸، اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر — ۳۴۳ھ مئی ۱۲، ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ —
۳۴۴ھ مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ فی پرچہ — ۳۴۵ھ اپریل ۸ — مئی ۸، جون، جولائی ۱۴ فی پرچہ — اگست تا دسمبر فی پرچہ ۸ — ۳۴۶ھ اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ — ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ (مکمل فائل ۳۴۶ھ = ۸ —)

منتخب نگار لکھنؤ

مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام

اوران کی رواداریاں

بجز اس امر کے کہ صحراء و ریگستان ہونے کے لحاظ سے سندھ و عرب میں ایک اشتراک آب و ہوا تو فی الجملہ ضرور پایا جاتا ہے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان دونوں جگہ کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتی۔ اگر اور کوئی اختلاف نہ ہوتا تو بھی اختلاف مذہب ایک ایسا زبردست پردہ تھا جو سندھیوں اور عربوں کے درمیان پڑا ہوا تھا لیکن باوجود اس اختلاف مذہب و طبائع، اس تباہین تہذیب و اخلاق کے فاتحین عرب نے سندھ والوں کے اہم حقوق کا بہت لحاظ کیا جو فطری طور سے حاکم و محکوم، راعی و رعایا کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ ممکن تھا کہ عربوں کی فتنہ جاعت سندھیوں کو بالکل بے دست و پا کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتی۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ملک کا سارا انتظام جو ان کے حملہ سے قبل پایا جاتا تھا اعلیٰ حالہ قائم رہنے دیا اور ایک سندھی کو بھی اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا۔

جب واپس قتل ہوا تو محمد قاسم نے اس کے وزیر کو بدستور بحال رکھا تا کہ جو حقوق رعایا کے پہلے سے قائم تھے ان کی حفاظت کرے اور ٹیکس وصول کرنے کے لئے صرف سندھ کے ہر ہمنوں کو مامور کیا اور ایک عرب کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی۔

مسلمان جب کسی شہر پر حملہ کرنے والے ہوتے تھے تو پہلے وہاں کے باشندوں کے سامنے اسلام پیش کرتے اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو خیر ورنہ پھر جزیہ طلب کرتے۔ اگر اس سے بھی انکار ہوتا تو پھر حملہ کرتے۔ اسلام لانے کی صورت میں سارے امتیازات اٹھ جاتے اور مساوات قائم ہو جاتی۔ اگر وہ جزیہ ادا کرتے تو ملک انھیں کے قبضہ میں رہتا۔ حملہ کے وقت بھی اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا کہ صرف مسلح سپاہیوں سے مقابلہ کیا جائے، کاشتکاروں اور تاجروں سے مطلق کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔

مفتوحہ ممالک میں مالگزار ہی پیداوار پر قائم کی گئی، اُس زمین میں جہاں نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی تھی، جو اور گہیوں پر حق متعین کیا گیا اور اُس زمین میں جس کا ذریعہ آبپاشی نہ تھا (بلکہ کنوئیں یا جھیل وغیرہ سے چرخی لگا کر پانی دیا جاتا) پر حق مقرر کیا گیا۔ ایسی زمین پر جس کی پیداوار صرف بارش پر منحصر تھی حق مالگزار ہی میں لیا جاتا اگر قابل کاشت زمین نہ ہو

غیر منور و غہ رہتی تو قابض سے فی جریب ایک درہم معاوضہ وصول کیا جاتا۔ باغوں کی پیداوار میں $\frac{1}{10}$ حصہ سلطنت کا مقرر تھا اور دیگر ذرائع آمدنی پر (مثلاً مچھلی کا شکار، موتیوں کا نکالنا) عام طور سے ایک خمس لیا جاتا۔ پیشہ و حرفہ پر بھی اسی طرح کچھ ٹیکس قائم تھا۔ پھر زمین کے رقبہ کا اندازہ مسلمان خود نہیں کرتے، بلکہ مالکان دیہ کے بیان پر اعتماد کر لیتے تھے۔ اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ اندازہ کتنا صحیح ہوتا ہوگا اور مسلمانوں کو کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔

سندھ کی تجارت کی ترقی تجارت کے متعلق بھی عربوں نے بہت وسعت نظر سے کام لیا۔ سندھ اس سے قبل بھی تجارتی ملک تھا لیکن عربوں کی حکومت نے تجارت کو بہت ترقی دی۔ خراسان اور سندھ کے درمیان کابل کے راستہ سے تجارتی قافلوں کی آمد رفت شروع ہو گئی اور غزنی اور قندھار کی راہ سے زابلستان و بھتان تک سندھی تجارت پہنچنے لگے۔ یہ راستہ خشکی کا تھا لیکن بحری راستہ سے بھی تجارت جاری تھی اور چین و سرانڈیپ وغیرہ کا اسباب تجارت سندھ ہو کر اسی ذریعہ سے قسطنطنیہ تک جاتا تھا۔ عرب سے گھوڑے وغیرہ بھی سندھ تک دریا کے راستہ سے آتے تھے۔

سندھ کی تجارت کی ترقی سندھ کی معاملات میں بھی عربوں نے سندھیوں کے ساتھ حد درجہ نرمی کا طرز عمل اختیار کیا۔ یہاں کے لوگوں کو عام اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مندروں کی مرمت کرائیں۔ آزادی سے پرستش کریں اور ملک کی آمدنی میں سے $\frac{1}{3}$ فی صدی کے حساب سے جو حقوق بجا دیوں کے مقرر تھے وہ بھی بجال رکھے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ دیبل، نیرون، ملتان وغیرہ میں بعض مندر مسمار بھی کئے گئے۔ مساجد بھی تعمیر ہوئیں لیکن یہ اس وقت ہوا جب حملہ جاری تھا اور پوری طرح تسلط قائم نہ ہوا تھا۔ قیام سلطنت و حکومت کے بعد کوئی زیادتی نہیں کی گئی اور تمام رعایا کے ساتھ اُسی رواداری کا اظہار کیا گیا جو اسلام کا مخصوص شیوہ رہا ہے۔ ملتان میں سورج دیوتا کا ایک طلائی بت تھا۔ محمد قاسم کو اس کے سرداروں نے بہت مجبور کیا کہ اسے توڑ ڈالے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور جب تک عربوں کی حکومت ملتان میں قائم رہی یہ بت بھی بدستور اپنی جگہ نصب رہا۔ مسلمانوں کے حملہ سے قبل سندھ میں بعض ایسے قوانین جاری تھے کہ انھوں نے قوموں میں امتیاز پیدا کر دیا تھا بعض جاغیتوں کے لئے گھوڑے کی سواری، نفیس کپڑوں کا استعمال ممنوع تھا اور ان کے لئے لازم تھا کہ جب قافلے ان آبادیوں کی طرف گزریں تو رہنمائی کے لئے اپنے آدمی مقرر کریں۔ مسلمانوں نے ان قوانین کو بدستور قائم رکھا اور کوئی تغیر نہیں کیا۔

1310g Dictionary L. N. K. V Almanac

مسعودی، زابلستان کا حال بیان کرتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے قلعے پائے جاتے تھے۔ یہاں آبادی مختلف قوموں کی تھی۔ بھتان کے متعلق لکھتا ہے کہ وہاں دریائے ہند مند کے دونوں طرف ساحل پر کثرت سے باغات اور کھیت پائے جاتے تھے اور دریا کے اندر کثرت سے کشتیاں پائی جاتی تھیں اور آب پاشی زیادہ تر ہوائی چرخوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

جب کوئی جماعت کسی ملک میں فاتحانہ طریقہ سے داخل ہوتی ہے، تو فطرتاً اس میں جذباتِ تفوق و برتری پیدا ہو جاتا ہے اور ان جذبات کے زیر اثر وہ مفتوح جماعتوں کے ساتھ ضرورتاً سختی کرنے لگتی ہے۔ چونکہ اسلام میں یہ طرزِ عمل ممنوع ہے، اس لئے سردارانِ عرب نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان فوجیں شہروں کے اندر رہیں کیونکہ اس صورت میں ضرور رعایا کو تکلیف پہنچتی، بلکہ ان کے قیام کے لئے الگ نوآبادیاں بنائیں جن کو جنود و امصار کہتے تھے اور سخت تاکید تھی کہ وہ عام رعایا سے تعلقات قائم نہ کریں (منصورہ، قنذابیل، بیضا، محفوظہ اور ملتان وغیرہ انھیں امصارِ عسکری میں سے تھے)۔ ہر چند سندھ میں بھی اسلامی قانون رائج کیا گیا اور قاضی مقرر کئے گئے کہ وہ شرع کے مطابق معاملات کو طے کریں مگر ہندو مجبوراً نہیں کئے گئے کہ وہ بھی اس قانون کو تسلیم کریں چنانچہ وہ اپنے تمام معاملات و نزاعات جن کا تعلق حکومت سے نہ ہوتا پنچایت کے ذریعہ طے کرنے کے مجاز تھے۔

فوج میں اہل سندھ کو بھی آزادی کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ یہاں کا جنگ آزمودہ عنصر غالب ان کا طرفدار ہو گیا اور دوسرے یہ کہ جب کبھی عربوں نے سرکشی کی تو ان سے کام لے کر ان کو دبا یا گیا۔ علاوہ اس کے سندھی افواج کو ملک سے باہر بھی دور دراز مقامات میں روانہ کیا گیا، چنانچہ جب شاہیہ میں سلطنت باز نظام پر مسلمانوں نے حملہ کیا تو افواجِ شام میں سندھی دستے بھی موجود تھے۔

عربوں نے جس شان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور عیسائی نمایاں کامیابی حاصل کی، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی پیشقدمی اور زیادہ جاری رہتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف سندھ کے اندر ان کی حکومت قائم ہوئی اور وہ بھی تین صدی کے اندر ہی اندر رفتہ رفتہ کمزور ہو کر نیست و نابود ہو گئی اس کے اسباب پر جس قدر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکا بڑا سبب وہ اتفاق تھا جو قبائلِ عرب میں باہم پیدا ہو گیا تھا۔ اگر خلیفہ اول یا دوم کے زمانہ میں سندھ فتح ہو گیا ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ آج ہندوستان کی تاریخ کسی اور نہج سے مرتب کی جاتی، لیکن افسوس ہے کہ سندھ بنو امیہ کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، جب عرب دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تمام وہ اندرونی سازشیں جو ایک ملک کو تباہ کر دیتی ہیں آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر محمد قاسم اس قبیلہ پرستی کی بنا پر سندھ سے بلا کر قتل نہ کر دیا جاتا تو یہ بالکل یقینی ہے کہ اس کا سلسلہ فتوحات چین تک پہنچ جاتا جیسا کہ حجاج ابن یوسف کا خیال تھا۔ پھر وقت یہ تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے اصول حکومت اپنے پیش رو سے بالکل جدا ہوتے تھے، اور ہر عہدید حکمران کے ساتھ ساری دنیا نئی ہو جاتی تھی اس لئے کبھی کوئی گورنر اطمینان و سکون کے ساتھ نہ سندھ میں حکومت کر سکا اور نہ سلسلہ فتوحات کو بڑھا سکا۔ اگر کسی نے اصلاحات شروع کیں اور آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کئے تو بد قسمتی سے خلافت بدل گئی اور اس غریب کو بھی معزول ہو جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ گورنران سندھ کا مرکز خیال بدل گیا اور پایہ تخت سے ہمدردی اٹھ جانے کی وجہ سے خود مختاری و خود سری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ پھر چونکہ سندھ میں عرب کے مختلف قبائل کے لوگ آباد ہو گئے تھے، اس لئے جب عرب میں قبائل کے درمیان

سندھ کی عسکری خدمات - ہندوؤں کے ساتھ قانونی معاملات - مسلح و غیر مسلح جرائم کے عدول

سندھ میں عرب حکومت کا زوال اور اس کے اسباب

کوئی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو یہاں کے قبائل بھی ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے تھے۔

عہد بنی عباس میں بعض خلفاء ایسے ہوئے کہ یہ اختلاف قبائل چند دن کے لئے انھوں نے مٹا دیا اور ان کے زمانہ میں سندھ کی حالت بھی بہتر ہو گئی لیکن خلیفہ معتصم کے زمانہ میں یعنی و نزاری نزاع شروع ہو گئی اور سندھ بھی اسی اختلاف کا شکار ہوا۔ چونکہ عہد عباسیہ میں ہارون الرشید کے وقت سے عجمیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اس لئے تمام ان مقامات میں جہاں خالص عرب حکومتوں کا تعلق تھا، ضعف پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا، جب خوارج و قرامطہ ملاحدہ اور روافض وغیرہ نے ساری سلطنت کے شیرازہ کو درہم و برہم کر دیا، اور ہر جگہ حکومت کی عمارت متزلزل ہو گئی چونکہ سندھ پایۂ تخت سے بہت دور واقع تھا اور تمام شورش پسند جماعتوں کے لئے ایک اچھی جائے پناہ بن سکتا تھا۔ اس لئے یہاں خوارج و زنداقتہ، ملاحدہ و علویہ نے کافی قوت حاصل کر لی اور تمام مکران و سندھ میں پھیل کر سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ اب تک بہت سے خاندان سیدوں کے سندھ میں ایسے باقی ہیں جو انھیں علویہ کی اولاد میں سے ہیں انھوں نے نہ صرف سندھ کے اندر اپنے مستقل شہر قائم کئے بلکہ مشرقی ہندوستان تک بڑھ آئے۔ چنانچہ اکثر موجودہ خاندان سادات انھیں علویہ کی ذریات میں سے ہیں جو کسی وقت وادی سندھ میں آکر ٹھہرے اور بھکر پر مستولی ہو گئے تھے۔

یہ بالکل یقینی ہے کہ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا، اس وقت یہاں بودھ مذہب عام طور سے رائج تھا۔ بلاذری نے ملتان میں سورج کے مندر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام بد لکھا ہے جس سے مراد ثابت نہیں بلکہ بودھ ہے دیہل میں جو مندر تھا وہ بھی بودھ ہی کا تھا۔ اس کے متعلق تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ تھی اور اس کے اوپر ایک قبة یا گنبد بنا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ بودھ کا ٹوٹ رہا ہو۔ جیسا کہ ساچھی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

اگرچہ چچ جس نے دیہل میں قبضہ کر لیا تھا برہمن تھا، لیکن بت پرستی کے لحاظ سے برہمن قوم ایسی نہیں ہے جو بودھ کی پرستش کو منع کرتی یا خود اس طرف مائل نہ ہو جاتی، اس لئے بالکل ممکن ہے کہ چچ اور دائرہ بودھ کے اسی مندر کو عظمت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں اور فی الجملہ بودھ ہو گئے ہوں۔

اس امر کا ثبوت کہ اس وقت بودھ مذہب کا رواج تھا، نہ صرف چینی سیاحوں اور ابن خرداد بہ کے بیانات سے

لے کتاب المسالک والممالک، کا مصنف ابوالقاسم عبید اللہ بن عبد اللہ بن خرداد بہ، تھا جو عام طور سے ”ابن خرداد بہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ ”خرداد بہ“ کا جید اعلیٰ مذہب آتش پرست تھا جو بعد کو مسلمان ہو گیا۔ ابن خرداد بہ (ابوالقاسم) نے خلفائے عباسیہ کے وقت میں بہت عزت حاصل کی اور مختلف ممالک کی جغرافیہ تحقیقات کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف کی۔ ۳۹۱ھ میں اس نے انتقال کیا۔

کچھ زمانہ قبل ابن خرداد بہ کا تشخص ماہ النزاع امر تھا بعض کہتے تھے کہ ابواسحاق اسطخری اور یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں لیکن چچ اسطخری کی کتاب جداگانہ شایع ہو گئی ہے، اس وقت سے یہ امر صاف ہو گیا ہے کہ یہ دونوں ہستیاں الگ الگ تھیں۔

ملتان میں سورج کے مندر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام بد لکھا ہے جس سے مراد ثابت نہیں بلکہ بودھ ہے دیہل میں جو مندر تھا وہ بھی بودھ ہی کا تھا۔ اس کے متعلق تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ تھی اور اس کے اوپر ایک قبة یا گنبد بنا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ بودھ کا ٹوٹ رہا ہو۔ جیسا کہ ساچھی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے بلکہ خود عربوں کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً بلا ذری کا بیان ہے کہ ”سندھ کے پجاریوں کو سمنی کہتے تھے“ سمنی سنسکرت لفظ سمرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مذہبی بھکاری، اور مذہبی بھکاری خصوصیت کے ساتھ بودھ مذہب ہی میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح چچ نامہ میں لکھا ہے کہ جب محمد قاسم نے دیہل فتح کیا تو وہاں کے ایک ہزار برہمنوں نے استدعا کی کہ انھیں اپنے مراسم قدیم پر قائم رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی یہ استدعا قبول کی گئی اور وہ بدستور ہر صبح اٹھ کر ہاتھوں میں کاسہ گدائی لئے ہوئے بھیک مانگا کرتے تھے اور یہ طریقہ بودھ مذہب والوں ہی کا ہے۔ اسکے ساتھ اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ اس وقت تاریخوں میں کہیں گائے کی پوجا یاستی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے (جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہے) تو یہ امر اور زیادہ محقق ہو جاتا ہے کہ اس وقت سندھ میں بودھ مذہب ہی رائج تھا۔

خلافت عباسیہ کے آخری زمانہ میں سندھ، غزنی حکومت سے متعلق ہو گیا اور محمود جب حملہ سومات کے بعد منصورہ میں اپنا نائب مقرر کر کے غزنی واپس گیا ہے، تو علی الترتیب سمر، سنا، ارغون و ترخان خاندانوں کی حکومتیں مختلف اقطار سندھ

۱۔ سمر خاندان کے ابتدائی حالات بہت کچھ پردہ خفا میں ہیں۔ میر معصوم کا بیان ہے کہ عبدالرشید سلطان مسعود کے عہد میں (۱۰۵۱ھ/۱۶۴۳ء) سمر قوم نے غزنوی حکومت سے بغاوت کی اور سندھ کے تخت پر ایک شخص سمر نامی کو بٹھا دیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ سمر خاندان کے ۳۶ فرمانرواؤں نے ۵۰۰ سال تک حکومت کی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد قاسم کی وفات کے بعد ایک قبیلہ عرب نے جبکہ تعلق انصاریوں سے تھا اپنی حکومت سندھ میں قائم کی اور اس کے بعد ۵۰۰ سال تک سمر زمینداروں نے سلطنت کی (جبکہ حال معلوم نہیں کہ یہ حال اس کے بعد سمر خاندان آیا جس نے جام کا لقب اختیار کیا۔ ان خاندانوں کے زمانہ میں شاہان غزنی و غور و سلاطین دہلی، سندھ پر حملہ کرتے رہے اور بہت سے شہروں پر قبضہ کر کے اپنے گورنر مقرر کر دیئے۔

تاریخ طاسری میں لکھا ہے کہ سمر ایک ہندو خاندان تھا جس نے ۱۰۵۱ھ سے ۱۶۴۳ھ تک حکومت کی۔ بیگ کرنامہ نے بھی وہی لکھا ہے جو فرشتہ نے بیان کیا ہے۔ محمد یوسف نے منتخب التواریخ میں میر معصوم کے بیان کا تتبع کرتے ہوئے سمر خاندان کے ۱۹ بادشاہوں کا نام لکھا ہے جن میں سے اول سمر اور آخری بھونگر ثالث ہے۔ ان میں بعض نام ایسے ہیں جن سے ان کے مسلمان ہونے کا قیاس ہوتا ہے مثلاً محمد طور، عمر سمر، تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ سمر قوم اعرابِ سامرہ سے پیدا ہوئی جو دوسری صدی ہجری میں سندھ آئے تھے جب خاندان غزنی و غور کا اثر حکومت سندھ میں قائم ہونے لگا اور ان خاندانوں کے گورنر بھی متعین ہوئے اس وقت سمر خاندان کے افراد سندھ کے بعض حصوں میں خود مختار فرمانروا تھے۔ دوسری جگہ سمر خاندان کا ذکر کرتے ہوئے صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ جب غازی ملک ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں ملتان اور سندھ کی افواج مجتمع کر کے دہلی روانہ ہوا اور خسرو خاں کو شکست دیکر غیاث الدین تغلق شاہ کا لقب اختیار کیا تو سمر قوم نے سندھ میں ایک شخص سمر نامی کو اپنی ہی قوم میں سے منتخب کر کے اپنا حکمران بنایا اور پھر اس کی اولاد عرصہ تک حکمران رہی، حتیٰ کہ ۱۵۲۶ھ/۱۶۱۳ء میں سمر قوم نے خروج کیا اور سمر خاندان کے آخری فرمانروا اربیل کو ہلاک کر کے حکومت سندھ چھین لی۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ ہو)

میں قائم ہوئیں۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر نے اس طوائف الملوکی کو مٹا کر سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۹)

الغرض سمر خاندان کے صحیح حالات پردہ خفایں ہیں اور اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ لوگ کس خاندان سے تھے اور کب سے کب تک انہوں نے سندھ میں حکومت کی۔ یورپین محققین میں بھی سخت اختلاف ہے۔ مسٹر الفنسٹن انھیں مسلمان راجپوت بتاتے ہیں اور ڈاکٹر برڈ، ابولہب کی اولاد ظاہر کرتے ہیں۔

سما خاندان کی حکومت سندھ میں سمر کے بعد قائم ہوئی۔ اس کا زمانہ حکومت ۹۲ھ تک رہا یہاں تک کہ ارغون خاندان نے اس کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ بیگ نزام، سما خاندان کی حکومت کا اختتام ۹۳۲ھ میں ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ طاہری میں ۸۲۳ھ درج ہے اور تحفۃ الکرام میں ۹۲۷ھ تحریر ہے۔ اس لئے اس خاندان کی حکومت کم از کم ۸۴ سال اور زیادہ سے زیادہ ۱۹۳ سال تک قائم رہی، لیکن تحفۃ الکرام کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جس کی تصدیق سراجہ عصفیہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

اس خاندان کے فرمانروا جام کے لقب سے مشہور ہیں اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ جمشید کی اولاد میں سے تھے۔ بعض کا بیان ہے کہ ان کا سلسلہ اپوچیل سے ملتا تھا اور بعض سام بن نوح سے متعلق کرتے ہیں۔ چچ نامہ میں درج ہے کہ جس وقت محمد قاسم نے حملہ کیا ہے تو دریائے سندھ کے ساحل زریں کے باشندوں نے اطاعت اختیار کی۔ اس جماعت کا سردار ایک شخص سمبا تھا چچ کی طرف سے دیبل کا گورنر بھی تھا۔ یہ لوگ ہندو تھے اور کرشن جی کے بیٹے سمبا سے ان کا سلسلہ نسب ملتا تھا اور ساحل دریائے سندھ پر سمانگر، ان کا دارالحکومت تھا۔ یہ لوگ غالباً ۹۳۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ چچ نامہ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ سما خاندان یہی تھا جو پہلے راجپوت تھا اور بعد کو مسلمان ہو گیا۔

خاندان ارغون - ہلاکو (چنگیز خاں کا پوتا) کے پوتے کا نام ارغون خاں ترخان تھا۔ اور یہ خاندان اس کی نسل سے ہے۔ اس خاندان کی حکومت ۳۵ یا ۴۱ سال تک قائم رہی اور ۹۶۲ھ میں ختم ہو گئی۔ آخری حکمران شاہ حسین تھا جس نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

خاندان ترخان - اس خاندان کے متعلق بعض کا بیان ہے کہ چنگیز خاں نے ایک نوجوان شخص کو اس کی بعض خدمات کے معاوضہ میں ترخان کا لقب دیا تھا اور یہ خاندان اُسی کی اولاد میں سے تھا بعض اس واقعہ کو تیمور سے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ یہ ارغون خاں کی اولاد میں سے تھے۔ یہ خاندان صرف ۳۸ سال تک سندھ کا حکمران رہا۔ اس کے آخری فرمانروا مرزا جانی بیگ نے سنہ ۱۰۱۷ھ میں اپنی خود مختاری، اکبر کے جنرل خاں خانان کے سپرد کر دی۔ تاریخ طاہری نے سنہ ۱۰۲۲ھ تک اس خاندان کا زمانہ حکومت تحریر کیا ہے، کیونکہ غازی بیگ ترخان اسی سال قندھار میں مرا تھا، لیکن چونکہ غازی بیگ کی حیثیت صرف ایک جاگیردار کی سی تھی، اس لئے اس خاندان کی حکومت کا اختتام تو حقیقتاً سنہ ۱۰۱۷ھ ہی میں ہو گیا تھا اور سندھ اسی وقت تیموریہ سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔

غزنوی عہد پر تبصرہ

جنہوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے پوشیدہ نہیں کہ محمود کے زمانہ میں غزنوی (پایہ تخت) کا کیا عالم تھا، اسوقت غزنوی، علوم و فنون کا مخزن بنا ہوا تھا اور ہر چار طرف سے علماء و فضلاء اُنڈے چلے آ رہے تھے۔

مصنف تاریخ گزیدہ کا بیان ہے کہ ہر سال چار لاکھ دینار وہ شعراء اور علماء پر صرف کیا کرتا تھا پھر اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ متعدد مدارس بھی جاری کئے اور (حسب بیان فرشتہ) غزنوی کی اس مشہور مسجد کے جوار میں جو سنگ مرمر اور سنگ خام کی حسین ساخت اور بے مثل آرائش کی وجہ سے ”عروس ملک“ کہی جاتی تھی، ایک یونیورسٹی قائم کی اور اسی کے ساتھ اس نے

۱۔ تاریخ گزیدہ، ۳۰۷ھ (۹۲۹ء) میں مرتب ہوئی اس کا مؤلف حمد اللہ بن ابوبکر بن حمد بن نصر مستوفی قزوینی تھا۔ حمد اللہ رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین (وزیر) کا سکریٹری تھا اور اسی کے نام یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔

تاریخ گزیدہ، مشرق کی بہترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یورپ کے مشہور مصنف و مورخ ہیمبرگسٹال (Hammer) نے اس تاریخ کو اس عہد کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔

جب حمد اللہ اس تاریخ کو مرتب کر چکا تو اس کے گیارہ سال بعد اس نے جغرافیہ اور تاریخ طبعی میں ایک بے مثل کتاب نزہت القلوب لکھی۔ تاریخ گزیدہ کے خاص خاص ماخذ حسب ذیل ہیں :- تاریخ طبری - تاریخ کامل ابن اثیر - نظام التواریخ بیضاوی - زبدۃ التواریخ جمال الدین کاشی - جہاں کشا جوینی -

۲۔ تاریخ فرشتہ عام طور سے ہندوستان کی بہترین تاریخ تسلیم کی جاتی ہے اس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ (فرشتہ) بمقام استر آباد ۱۱۵۱ء میں اور بعض موصوفین کی تحقیق سے ۱۱۵۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ (غلام علی ہندو شاہ) نے ہندوستان کا سفر اسوقت اختیار کیا جب کہ اس کا بیٹا محمد قاسم بہت کم سن تھا وہ مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر (دکن) پہنچا اور میران حسین دلی عہد کی تعلیم کے لئے مامور ہوا۔ اتفاق سے غلام علی ہندو شاہ جلد مر گیا۔ اور محمد قاسم یتیم ہو گیا۔ لیکن چونکہ غلام علی کا اقتدار دربار دکن میں بہت قائم ہو چکا تھا اس لئے وہی عنایات محمد قاسم پر بھی مبذول ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ بادشاہ کا مشیر خاص ہو گیا۔ جب شہزادہ میران حسین نے اپنے باپ مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت سے علیحدہ کیا، اسوقت محمد قاسم کی عمر ۱۷، ۱۸ سال کی تھی۔

(بقیہ فط نوٹ صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ کیجئے)

مختلف زبانوں کی کتابوں کا بے نظیر اور بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور ایک عجائب خانہ بھی تعمیر کرایا جس میں بہت سے نوادر پائے جاتے تھے۔

محمود نے اس یونیورسٹی کی تکمیل میں جس قدر روپیہ صرف کیا وہ اُس مستقل امداد سے علیحدہ تھا، جو اُس نے جاگیروں کی صورت میں یونیورسٹی کے سالانہ مصارف اور طلباء و مدرسین کے وظائف و مشاہرہ کے لئے وقف کر دی تھیں۔

اس یونیورسٹی کے قیام اور محمود کی عام علم پروری کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں شعراء، ادباء اور حکماء مختلف مقامات سے کھینکے آنے لگے اور غزنی بے نظیر عمارات و محلات و باغات اور بے شمار چشموں، حوضوں اور فواروں کی وجہ سے عروس البلاد بنا ہوا تھا، علم و حکمت کا مرکز بھی بن گیا اور اس طرح حسن صورت و سیرت کا امتزاج تکمیل کے ساتھ وہاں نظر آنے لگا۔ اُن مشاہیر میں سے جو محمود کی نگاہوں میں خاص عزت رکھتے تھے، ایک شخص عتبی تھا جس نے اولاد بکتگیں کے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۱)

ایک سال بعد جب میران حسین قتل کیا گیا تو محمد قاسم ۱۵۹۹ء میں بیجاپور چلا گیا۔ یہاں دلاور خاں وزیر نے ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں جو اس وقت وہاں کا حکمران تھا اُسے پیش کیا لیکن کوئی خاص عزت اس کی نہیں کی گئی۔ جب دلاور خاں معزول ہو کر بھاگ گیا اور ۱۵۹۳ء میں عنایت خاں شیرازی وزیر ہوا تو اس نے پھر محمد قاسم کو پیش کیا اور ابراہیم عادل شاہ نے نہایت عزت سے اس کی پذیرائی کر کے تاریخ دکن لکھنے کی ہدایت کی جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۶۰۶ء میں اس نے یہ تاریخ مکمل کر کے عادل شاہ کے سامنے پیش کی لیکن اس کے بعد بھی وہ ہمیشہ اس کی صحت و ترمیم، حذف و اضافہ میں لگا رہا۔

برگس Briggs کا خیال ہے کہ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ جب کہ اس کی عمر صرف ۴۴ سال کی تھی لیکن ام جے فہل (J. F. Mohl) کی تحقیق یہ ہے کہ اس نے ۱۶۱۳ء تک اپنی تاریخ میں واقعات کا اضافہ کیا ہے اس لئے وفات کے وقت اس کی عمر ۴۵ سال سے کم نہ تھی۔

چونکہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں یہ تاریخ مرتب ہوئی تھی اس لئے مصنف نے اس کا نام گلشن ابراہیمی یا تاریخ ابراہیمی رکھا اور بعد کو بیابان ابراہیم نے تیار کیا یہ تخت نورس تعمیر کرایا تو اس کی یادگار میں دوسرا نام نورس نامہ بھی قرار پایا۔

یہ تاریخ، دکن کی بہترین تاریخ ہے لیکن چونکہ اس کا مصنف شیعی مذہب رکھتا تھا اس لئے عصبیت کی جھلک کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ انھیں نوادر میں سے ایک طائر تھاقمری کی صورت کا۔ جب مجلس میں زہر آلود کھا ۱۱ اس کے سامنے لایا جاتا تو وہ مضطرب ہو جاتا اور آتش اس کی آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ ایک پتھر کا ٹکڑا بھی ہمتا جو مومیائی اثر رکھتا تھا کیسا ہی زخم ہو اس کے گیس کر گانے سے فوراً پھٹا ہو جاتا تھا۔

۵ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲ (نوٹکشور)

حالات میں تاریخ عینی لکھی ہے۔ دوسرا غفاری رازی ایران کا رہنے والا تھا۔ ایک بار اس نے ایک مختصر سا قصیدہ محمد کے سامنے پیش کیا اور چودہ ہزار درہم انعام میں حاصل کئے۔ تیسرا اسدی طوسی باشندہ خراسان تھا۔ یہ بھی نہایت مشہور شاعر تھا اور محمود نے اُسے بارہا تصنیف شاہنامہ پر مجبور کیا، لیکن وہ ہمیشہ اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح منوچہر جو بلخ کا رئیس اور اپنی شاعری و ذہانت کی وجہ سے بہت مشہور تھا دربار محمود کا ایک جوہر تابندہ تھا۔

غزنوی جو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، حکیم، زبان دان اور فیلسوف تھا غزنی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اور کوئی نظم محمود کے سامنے پیش نہ ہو سکتی تھی، جب تک غزنوی اس کو نہ دیکھ لیتا۔

انھیں شعراء کے زمرہ میں فردوسی بھی تھا جسے محمود نے شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا۔ سامانی فرمانروا حقیقی سے ہوا میرا نوح سامانی کا معاصر تھا، شاہنامہ کا سنگ بنیاد پہلے ہی رکھوا چکا تھا اور وہ تین ہزار شعر بھی لکھ چکا تھا لیکن اس کی نادت موت سے یہ کام پورا نہ ہو سکا اور آخر کار محمود کے عہد میں قرعہ فال فردوسی کے نام نکلا۔

محمود کی عالم پروری اور ذوق ادب کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہیں ایک نمایاں مثال اس کی بھی ہے جو صاحب طبقات اکبری نے بیان کی ہے۔

۱۔ تاریخ عینی کے مصنف کا نام ابوالفر محمد ابن محمد الجبار العتبی تھا۔ یہ اس خاندان عتبی سے تعلق رکھتا تھا جو سامانی بادشاہوں کے عہد میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا ابوالفر عتبی سلطان محمود کا سکریٹری تھا۔ تاریخ عینی میں اس نے ناصر الدین سبکتگین کے پورے حالات اور مرد کے حالات ۱۱۱۲ھ تک درج کئے ہیں۔

تاریخ عینی ادب کے لحاظ سے بھی عربی کی مشکل کتاب خیال کی جاتی ہے اور فارسی میں بھی اس کے متعدد ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں سب سے قدیم ترجمہ ابوالشرف کا ہے جو ۵۸۲ھ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ اب نایاب ہے البتہ اس کو انگریزی طبوس میں ریورسٹڈ ہے رینالڈس Rev. J. Renolds نے ۱۸۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ محمد کوامت علی دہلوی کا ہے جو مختلف کتب خانوں میں نظر آجاتا ہے۔ تاریخ عینی کی شرحیں اور فرہنگیں بھی متعدد لکھی گئی ہیں جن میں سے اب صرف ایک آدھ کہیں نظر آجاتی ہے۔ تاریخ گزیدہ صفحہ ۸۱۸

۲۔ طبقات اکبری کا صحیح نام طبقات اکبر شاہی اور اسم مصنف کی رعایت سے تاریخ نظامی بھی کہتے ہیں۔ یہ تصنیف ہندوستان کی مشہور ترین تاریخوں میں سے ہے اور غالباً سب سے پہلی تاریخ ہے جس میں جدید اصول پر صرف ہندوستان کے حالات سے بحث کی گئی۔ تمام بعد کے مورخین نے اس کو اپنا اخذ قرار دیا۔ یہاں تک کہ علامہ عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ تو اپنی تصنیف کو صرف طبقات اکبری ہی کا خلاصہ ظاہر کرتا ہے اور سلت ۱۰۰۰ تک کے تمام واقعات اس سے اخذ کرتا ہے۔

(بقیہ فطی نوٹ صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

جب ۱۱۳۳ھ میں محمود نے گوانیار کا محاصرہ کر کے وہاں کے راجہ کو مطیع کر لیا تو کالجی کی طرف بڑھا جو اس وقت اپنی مضبوطی کے لحاظ سے ایک بے مثل قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جب یہاں کے راجہ ننڈا نے دیکھا کہ وہ محمود کے محاصرہ کی تاب نہیں لاسکتا تو اس نے تین سو ہاتھی پیش کرتے ہوئے صلح کی درخواست کی۔ چونکہ ان ہاتھیوں پر کوئی مہاتوت نہ تھا، اس لئے محمود نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انھیں پکڑ کر سوار ہو جائیں۔ ننڈا یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور محمود کی تعریف میں ایک شعر یا چند اشعار ہندی زبان میں پیش کئے، محمود نے اس کو پڑھوا کر سنا اور سمجھا۔ یہ اشعار اپنے معافی کے لحاظ سے اس قدر بے مثل تھے کہ محمود اپنے صحیح مقصود کو بھی بھول گیا اور اس نے بے اختیار ہو کر ننڈا کو پندرہ قلعوں کی حکومت تفویض کر کے (جن میں کالجی بھی شامل تھا) اور بھی تحائف و ہدایا دے جانے کا حکم دیا۔ فرشتہ نے بھی اس کو انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود اپنی فطرت کے لحاظ سے کیسا ہنر شناس تھا اور اپنے ذوقِ علم کی بنا پر بسا اوقات اپنے خیالِ ملک گیری کو بھی ترک کر دیتا تھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۳)

صاحب آثار الامراء نے بھی اس تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محرقاسم فرشتہ نے بھی اس سے بہت مدد لی ہے البتہ ابو الفضل کے اکبر نامہ سے کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اکبر نامہ زیادہ صحیح ہو سکتا ہے یا طبقات اکبری، یورپین مصنفین بھی اس تاریخ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس کا مصنف خواجہ نظام الدین احمد خواجہ مقیم بروہی کا بیٹا تھا۔ یہ خواجہ مقیم وہی ہے جو بابر کا ندیم و مصاحب تھا اور بعد کو اس کے خانگی انتظام کا جہتم ہو گیا تھا۔ بابر نے اپنی تصنیف ترک بابر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر کی وفات پر جب ہمایوں نے گجرات فتح کر کے صوبہ احمد آباد مرزا عسکری کے سپرد کی تو ساتھ ہی ساتھ خواجہ مقیم کو مرزا عسکری کا وزیر بھی مقرر کیا۔ جب ہمایوں کو چوتھے کے مقام پر شیر شاہ نے شکست دی اور وہ آگرہ کی طرف بھاگا تو مقیم خاں ساتھ ساتھ تھا۔

خواجہ نظام الدین اس مقیم خاں کا بیٹا تھا اور عہد اکبری کے ممتاز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ صوبہ گجرات میں وہ بخشی گری کے عہدہ پر متکون تھا اور اس نے مختلف جنگوں میں نمایاں حصہ بھی لیا۔

جب ۳۴ سال جلوس (۱۵۹۶ء) میں حکومت گجرات، خانِ اعظم صوبہ دار مالوہ کے سپرد کی گئی تو خواجہ نظام الدین کو اکبر نے اپنے حضور میں طلب کیا۔ وقت بہت کم تھا اور تاریخ سالگرہ قریب تھی اس لئے خواجہ نے ۶۰۰ کوس کا سفر بارہ دن میں طے کیا اور عین تاریخ جلوس پر پہونچ گیا۔ اکبر نے اس کی بہت عزت کی۔ ۳۹ سال (۱۶۰۲ء) میں جبکہ بادشاہ بابر شکار میں مصروف تھا خواجہ تپ میں مبتلا ہوا اور لاہور پہونچے پہونچے ساحلِ راوی پر انتقال کیا۔ بعد کو چھانگیر کے عہد میں خواجہ کی بعض اولاد نے کافی ترقیاں کیں۔

اب یہ ایک گاؤں ہے ضلع باندہہ کا۔ یہاں اب تک قلعہ شکستہ حالت میں موجود ہے۔ فرشتہ ہلد اول صفحہ ۵۲۔

صاحب نگارستان نے احمد حسن میمنڈی کی ذہانت کے متعلق جو محمود کے عنفوان شباب کا ساتھی اور اس کا
بہایت معتد علیہ خادم تھا، جو واقعات درج کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ذہن و دماغ کے لوگوں کی صحبت
پسند کرتا تھا۔

غضایری رازی اپنے وطن ہی سے قصیدہ لکھ کر محمود کے دربار میں بھیج دیا کرتا تھا اور ہر قصیدہ کے عوض میں مقررہ
انعام ایک ہزار اشرفیوں کا اُسے مل جاتا تھا۔ ایک بار وہ دربار میں خود آیا اور ایک رباعی پیش کی تو اشرفیوں کے دو توڑے
اور زاید دئے گئے چنانچہ وہ خود کہتا ہے :-

بے دو بدرہ دینار یافتہ تمام، حلال و پاک تراز شیر دایہ اطفال
بعض مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ محمود خود بھی شاعر تھا اور اس کے ثبوت میں حسب ذیل قطعہ پیش کرتے ہیں :
بہ زخم تیغ جہانگیر و گرز قلعه کشائے جہان مسخر من شد چو تن مسخر رائے
بے بلاد گرفتار بیک اشارت دست بے قلاع گرفتار بیک فشر دن پائے
چو مرگ تاختن آوردیچ سود نبود بقا، بقائے خداوند و ملک، ملک خداے
لیکن صاحب تاریخ گزیدہ نے سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف ان اشعار کو منسوب کیا ہے۔

بنو لیلین اعظم کی ممتاز ترین صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس نے جن جن ممالک کو مغلوب کیا وہاں کے بہترین صناعات
اپنے ملک میں لایا اور اس طرح پیرس کی آرائش میں کوئی دقیقہ کو شش کا نہ اٹھا رکھا۔ لیکن محمود نے اپنے پایہ تخت غزنویں
کی ترقی میں بنو لیلین سے زیادہ کام کیا، کیونکہ وہ مغلوبہ ممالک کی صناعات کے ساتھ ہی خود وہاں کے شعراء، علماء اور
فصلاء کو بھی غزنویں لے آیا اور اپنے دربار کو ان تابندہ جواہرات سے جگمگا دیا۔

ماوراء النہر کے سواصل بحر خضر، ایران، خراسان میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جس نے اپنے بہترین فرزندان کو محمود کی خدمت
کے لئے پیش نہ کر دیا ہو۔

سامانی خاندان، جو علم و ادب کا بڑا قدر شناس تھا تباہ ہو چکا تھا اور اب علماء و شعراء وغیرہ کے لئے غزنویں سے
بہتر کوئی جگہ نہ تھی جہاں سلطان محمود اہل کمال کی قدر دانی کے لئے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

۱۔ نگارستان ایک مجموعہ ہے مختلف حکمران خاندانوں کے متعلق مختلف قصص و حکایات کا۔ اس کا مصنف احمد بن محمد بن غنور الغفاری
القرظینی تھا جو عام طور سے قاضی احمد الغفاری کے نام سے مشہور ہے۔ نگارستان اس کتاب کا تادیخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ کتاب ۹۵۹ھ میں لکھی گئی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس نے ۲۸ معتبر کتب تواریخ سے مواد فراہم کیا ہے۔
۲۔ شعر العجم جلد ۴ - صفحہ ۱۵ - ”تاریخ گزیدہ“ صفحہ ۴۵ -

محمود کے اراکین

محمود کی شاعری

غزنی قصص و کمال کا مختصر

محمود پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ طامع تھا، بخیل و خسیس تھا لیکن کیا وہ شخص جو چار لاکھ اشرفی سالانہ مستقلاً شعراء و علماء پر صرف کرے، جو دارالعلوم اور اُس کے مصارف کے لئے ایک زبردست جایداد وقف کر دے، جو طلبہ اور شایقین علم کی ہمت افزائی میں ہمیشہ اپنے خزانہ کا منہ کھلا رکھے، جو حضوں اور فناروں، پلوں، محلوں، مسجدوں، خانقاہوں کی تعمیر میں دولتِ خطیر صرف کرنے سے گریز نہ کرے، جو ایک ایک شعر پر تین تین بار ایک شاعر کا منہ جواہرات سے بھر دے، جو ایک معمولی سی اور وہ بھی غیر زبان کی نظم پر اپنی فتوحات سے فائدہ نہ اٹھا کر ایک غیر مذہب والے مفتوح شخص کو پندرہ پندرہ قلعے تفویض کر دے، جس کا دربار دنیا کے حکماء اور علماء کا مخزن رہا ہو، کیا اس کی نسبت کوئی دانشمند شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ طامع و بخیل تھا؟

محمود بن غزوی کا الزام غلط

محمود کو تمام موزنین نے متفقہ طور سے سلیم الطبع، شجاع، مستقل مزاج، حلیم و بردبار اور علم دوست تسلیم کیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک سبب تو خود اس کی فطری صلاحیت تھی جو قدرت نے اس میں ودیعت کی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کا باپ سبکتگین خود بے مثل صفات کا فرمانروا تھا اور اس نے محمود کی تربیت میں کوئی دقیقہ کو ششش کا اٹھانہ رکھا تھا۔ محمود نے اپنی کم سنی میں ایک باغ نہایت محنت سے طیار کرایا اور اس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت بھی قائم کرائی جس میں اپنے باپ اور ملک کے امراء نامدار کو بھی دعوت دی۔ جب سبکتگین آیا تو اُس نے محمود سے کہا کہ ”اے جان پدر ایسے باغ اور محلات تو معمولی امیر بھی طیار کرا سکتا ہے میں تو تجھ سے ایسی عمارت کی توقع رکھتا ہوں جس کی نظیر کہیں نہ ملے۔“ محمود نے دریافت کیا کہ وہ عمارت کیسی ہے سبکتگین نے جواب دیا کہ وہ ”تعمیر ہے اہل فضل و کمال کے دلوں کی جو قائم رہنے والی ہے اور جس پر کسی نہال کا نصب کرنا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا ہے۔“ پھر جنھوں نے محمود کی سیرت کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ باپ کی نصیحت پر اس نے کس حد تک عمل کیا اور اس باب میں وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جوان ہو کر محمود نے سارے عالم کو اپنی شہرت سے معمور کر دیا۔

محمود کی تربیت

محمود حقیقتاً ایک مجتہد فطرت رکھتا تھا اور سخت سے سخت وقت میں بھی وہ عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا چنانچہ صاحب جامع الحکایات^۱ راوی ہے کہ جب محمود، سومنا تھ سے واپس آنے لگا تو دو ہندو آئے اور اُنھوں نے رہبری کی خدمات پیش کیں، چونکہ محمود ہندوستان کی راہوں سے واقعہ نہ تھا اس لئے ان کو رہبر بننے کی اجازت دی گئی۔ تین دن

محمود کی بہترین فطرت

۱۔ فرشتہ جوالہ ناثر الملوک جلد اول صفحہ ۲۱ (نوٹکشور) — ۲۲ اس کتاب کا پورا نام ”جامع الحکایات و لوامع الروایات“ ہے اس کا مصنف مولانا نور الدین محمد غزنی تھا جو شمس الدین التمش کے عہد میں پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب نظام الملک محمد (ابوسعید جنبیدی کے بیٹے) کے نام سے منسوب ہے جو التمش کا وزیر تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اس نے بخارا میں تعلیم پائی تھی اور رکن الدین امام اس کے استاد تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخارا ہی کے قریب و چواریں کہیں پیدا ہوا تھا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ ہو)

کے بعد سارا لشکر ایک بے آب و گیاہ صحرا میں پہونچا۔ محمود نے رہبروں سے دریافت کیا کہ یہ کیسا راستہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ راستہ نہیں ہے بلکہ صحرا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے راجہ کے حکم سے یہاں پہونچا دیا ہے اور اپنے فرض کو اچھی طرح ادا کر دیا ہے۔ اب یہ صحرا تمہارے سامنے ہے اور افواج ہند تمہارے عقب میں اس لئے تمہارا جانبر ہونا محال ہے۔ محمود اس کو سنکر ذرا مضطرب ہوا لیکن اتفاق سے اُسی وقت اُسے ایک مرغابی اڑتی نظر آئی۔ محمود نے کہا کہ یقیناً یہاں کسی جگہ شیریں پانی ملنا چاہئے اور مرغابی کے پیچھے پیچھے اس نے گھوڑا ڈال دیا۔ بہت دور چلکر اُسے ایک بڑا دریا ملا جس کا پانی بہت شور مچا، لیکن یہاں پھر اُسے ایک مرغابی اڑتی ہوئی ملی اور اس کے تعاقب سے وہ ایک گاؤں میں پہونچا جہاں شیریں پانی دستیاب ہوا۔ اب محمود کے سامنے بڑا مرحلہ اس دریا کو عبور کرنا تھا اور باوجود دریافت و تلاش کے کوئی حصہ دریا کا ایسا نہ ملتا تھا جو پایاب یا قابل عبور ہو۔ آخر کار محمود نے اپنے فطری عدم اور بے نظیر شجاعت سے کام لیکر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اُس کی تقلید کریں۔

انتظامی معاملات میں محمود حد درجہ ذی فہم تھا اور کسی حال میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک بار کوئی دادخواہ حاضر ہوا اور کہا کہ خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محمود فوراً اُسے کونہ میں لے گیا اور حال دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ ”آپ کا بھانجہ روزرات کو میرے مکان میں آتا ہے اور مجھے گھر سے باہر نکال دیتا ہے میں نے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ انصاف کرتے ہوں تو کیجئے ورنہ میں معاملہ کو منصف حقیقی پر چھوڑ دوں“ محمود یہ سن کر آبدیدہ ہو گیا اور بولا کہ ”آئندہ جسوقت وہ شخص تیرے گھر میں آئے مجھے فوراً مطلع کر“ چنانچہ تیسرے روز وہ پھر آیا اور کہا کہ ”اس وقت وہ شخص موجود ہے“ محمود نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۶)

اس نے کہمات *Caus May* اور خوارزم کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سے ثابت ہے کہ وہ سیاحانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے نظام الملک جہندی اور ناصر الدین قباچہ کی جنگ کا بھی ذکر کیا ہے اور ناصر الدین کے ساتھ قلعہ بھکر میں اپنے قید ہونے کا بھی حال لکھا ہے۔ مصنف نے جامع الحکایات میں صرف ان تاریخی حکایتوں کو فراہم کیا ہے جن سے لوگ اسلام کے اخلاق و عادات وغیرہ پر روشنی پڑے۔ یقیناً اس میں ایسی حکایات بھی مندرج ہیں جو پائے تحقیق سے گری ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں کے ساتھ ایسے قصص بھی پائے جاتے ہیں جن سے تاریخی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔

مصنف نے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں: ”تاریخ یمنی“، ”تاریخ ناسری“، ”تاریخ ملوک عجم“، ”تاریخ العباس“، ”مجمع الامثال“، ”عین الاخبار“، ”شرق النبی“، ”فرج بعد الشدت“، ”خلق الانسان“، ”اخبار براءکہ وغیرہ۔“

اس کے مصنف نے علاوہ اس کے ایک تذکرہ شعراء فارس، لباب الالباب کے نام سے بھی لکھا ہے جو مشہور کتاب ہے، اور ستر برادین نے اس کا بہترین ادیشن شائع کیا ہے۔ لے جامع الحکایات قسم اول۔ باب ۱۲۔ حکایت ۱۶

یہ سنتے ہی تلوار ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ہولیا، جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ ایک مرد اور عورت پلنگ پر سو رہے ہیں فوراً چراغ گل کر کے تلوار سے مرد کا سر قطع کر دیا اور پھر روشن کر کے مقتول کا چہرہ دیکھا اور خدا کا شکر ادا کر کے پانی پینے کو مانگا اور پانی پی کر اپنے گھر واپس آیا۔ اس آدمی نے چراغ گل کرنے اور پانی پینے کا سبب دریافت کیا۔ محمود نے کہا کہ چراغ گل کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ کہیں اُس کی صورت دیکھ کر مجھے رحم نہ آجائے اور پانی پینے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں اس ظلم کا انسداد نہ کر لوں گا پانی نہ پیوں گا۔ چنانچہ تین دن کا پیاسا تھا اور اسی لئے زیادہ انتظار رفع تشنگی نہ کر سکا۔

محمودی انصاف پسندی

ایک بار محمود نے فرمانروائے کرمان کے پاس کچھ قیمتی تحائف روانہ کئے۔ راستہ میں قزاقوں نے سارا مال لوٹ لیا۔ اور سفارت کے چند آدمی قتل بھی کر دیئے۔ اس گروہ کے متعلق عرصہ سے شکایت پائی جاتی تھی اور بہت نقصان لوگوں کو پہونچا چکا تھا۔ سلطان براہِ بست، غزنیس سے خوارزم کی طرف جارہا تھا کہ اُسے اس کی اطلاع ملی۔ جب محمود، بست میں پہونچا تو مسعود اُس کا بیٹا برات سے ملنے آیا لیکن محمود نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے کہا کہ میں کیونکر تمہاری صورت دیکھ سکتا ہوں جبکہ تمہارے جوار میں ظلم و بے امنی کا یہ حال ہے۔ میں اُس وقت تک تم سے نہیں مل سکتا جب تک اس کا انسداد نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسعود گیا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اس گروہ کو گرفتار کر کے پیش کیا۔

محمود کو بیہوش کر دیا

اسی طرح عراق کی اُس بڑھیا کا واقعہ نہایت مشہور ہے جس نے اپنا قافلہ لٹ جانے کے بعد محمود کو تنبیہ کی تھی کہ وہ دور دراز مقامات کا انتظام نہیں کر سکتا تو کیوں اپنے ملک کو اس قدر وسیع کر لیا ہے۔

الغرض محمود کی یہی انصاف پسندی تھی جس نے فردوسی کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ :-

جہاندار محمود شاہِ بزرگ بہ آہِ خوار اندھی میش و گرگ

چو کو دک لب از شیر مادر بشت بہ گہوارہ محمود گوید نخست

محمود، معاملات کی حقیقت سمجھنے میں حد درجہ کوشش کرتا اور جب تک وہ خود انتہائی غور و تامل کے بعد مطمئن نہ ہوتا معتبر سے معتبر آدمی کی شکایت یا سفارش قبول نہ کرتا۔

صاحبِ زینت المجلد نے بحوالہ تاریخِ ناصری لکھا ہے کہ جب محمود، ہرات آیا تو عبدالرحمن خاں، جو مجلسِ وزراء کا ممبر تھا

محمود خود حقیقت، معاملات پر غور کرتا

۱۔ فرشتہ، جلد اول صفحہ ۳۶ - (نولکشور) - ۲۔ جامع الحکایات - باب (۱۳) حکایت (۴۷)

۳۔ زینت المجلد بھی نگارستان کی طرح مختلف قصص و حکایات کا مجموعہ ہے اس کا مصنف مجد الدین محمد الحسنی تھا جو عام طور سے مجدی کے نام سے مشہور ہے مصنف اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے متعدد کتبِ تاریخ سے استفادہ کیا اور جامع الحکایات سے لیکر نگارستان تک کوئی کتاب اس نے نہیں چھوڑی اس کی تاریخِ تالیف ۷۸۷ھ ہے۔

اس کے بعد ایک سطر حروف مقطعات میں لکھی ہوئی تھی اور صرف الَمْ، الَمْ پڑھا جاتا تھا۔ بہت کوشش کی گئی کہ اس کا مطلب سمجھ میں آوے، لیکن یہ معصوم نہ ہوا، آخر کار ابو بکر قبیلہ ستانی جو اس وقت ایک معمولی شخص تھا جرات کر کے آگے بڑھا اور عرض کی کہ ”چونکہ خلیفہ کو ہاتھیوں کے حملہ سے ڈرایا گیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ ان حروف مقطعات سے مقصود ”الم ترکیف فعل ربک باسباب الفیل“ ہو۔ یہ سنتے ہی محمود کے دل پر حد درجہ خوف خدا طاری ہوا اور دیر تک روتا رہا۔

محمود فطرتاً ہی انتہائی منکسر المزاج بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک بھی تھا اور اس کی فتوحات نے وسط ایشیا اور سرزمین ہند کے ایک معقول حصہ کا احاطہ کر لیا تھا لیکن اُس نے خود کبھی اپنے تئیں سلطان آن نہیں سمجھا۔ اور نہ سکون میں اپنے نام کے ساتھ لفظ ”سلطان“ کا اضافہ کیا۔ تخت خلافت کی طرف سے اس کو بین الدولہ، امین المملکت کہتے الدولہ والا سلام کے خطابات ملے اور طبقات ناصری کی روایت سے ”سلطان کا خطاب بھی اس کو دیا گیا۔ لیکن محمود نے

محمود کا الکسار

۱۔ فرشتہ جلد اول - صفحہ ۲۸۔ ۲۔ طبقات ناصری کا مصنف ابو عمر منہاج الدین عثمان ابن سراج الدین الجزہانی تھا۔ منہاج الدین کا جلد اول جزہ جانی سے غزنی آیا تھا اور یہاں سلطان ابراہیم نے اپنی ایک لڑکی کی شادی اس سے کر دی تھی (سلطان ابراہیم کی چالیس لڑکیاں تھیں جو سب کی سب ایسے ہی فاضل اور مشہور لوگوں سے منسوب کی گئی تھیں) اس مواصلت سے ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام ابراہیم رکھا گیا اسی ابراہیم کا بیٹا سراج الدین تھا جو منہاج السراج مصنف طبقات کا باپ تھا۔ سراج الدین ۵۸۲ھ میں بہ عہد محمد غوری افواج ہندوستان کا قاضی مقرر کیا گیا اور منہاج السراج نے اُسے ”عجوبۃ الزمان و افصح العجم“ خطاب کیا ہے۔ منہاج السراج ۶۱۲ھ میں غور سے سندھ اور ملتان آیا اور اوج میں دارالعلوم فیروزپور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دوسرے سال جب سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین قباچہ کو وزیر کر کے واپس آیا تو منہاج السراج کو شرف حضور حاصل ہوا اور ساتھ ہی ساتھ دہلی آیا۔ ۶۲۹ھ میں وہ سلطان التمش کے ساتھ تھا اور محاصرہ گوالیار کے وقت یہیں وہ محکمہ افتار و قضا کا صدر قائم بنایا گیا۔ ۶۳۵ھ میں سلطان رضیہ کی افواج اس طرف آئیں تو منہاج السراج اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ جب رضیہ کا انتقال ہو گیا اور بہرام شاہ تخت نشین ہوا اس وقت منہاج السراج دہلی میں تھا۔ ۶۳۹ھ میں بہرام شاہ نے اُسے قاضی القضاہ مقرر کیا۔ لیکن وہ عرصہ تک اس عہدہ پر قائم نہ رہ سکا کیونکہ ۶۳۹ھ کے آخر میں بہرام شاہ قتل کیا گیا اور منہاج السراج کو بھی مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ ۶۴۰ھ میں وہ لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ۶۴۲ھ تک مقیم رہا اس کے بعد وہ ۶۴۳ھ میں پھر دہلی آیا اور ناصر دارالعلوم کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ۶۴۴ھ میں جب ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا تو اُس نے بہت ترقی حاصل کی اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں (جو ناصر الدین کے بعد تخت نشین ہوا اور جسے وہ خان معظم کہتا ہے) وہ صدر جہاں اور قاضی مقرر ہوا۔ طبقات ناصری، ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ۱۱ سال تک کے حالات اُس میں درج کئے گئے ہیں۔ طبقات ناصری نہایت معتبر تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے اور فرشتہ وغیرہ نے اکثر اس کا حوالہ دیا ہے۔ یورپین مورخین بھی اس کو نہایت عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ منہاج السراج کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی لیکن غالب گمان ہے کہ وہ ناصر الدین کے بعد کچھ زمانہ تک ضرور زندہ رہا۔ ۳۔ طبقات ناصری (ایڈٹ) جلد دوم صفحہ ۲۶۹۔

ہمیشہ لفظ ”سلطان“ کے استعمال سے احتراز کیا اور خلیفہ بغداد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اُس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا۔

تاریخ ”خانہ اہل غزنوی“ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم پروری کی خصوصیت صرف محمود پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اسکے بیٹے مسعود اور دیگر جانشینوں میں بھی یہی ذوق قائم رہا۔ چنانچہ مسعود کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ علماء کے لئے بے انتہا فیاض تھا اُسے قابل لوگوں کی صحبت کا اس قدر شوق تھا کہ مختلف ممالک سے ماہرین علم و فن اُس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص ”ابوریحان خوارزمی“ بہت مشہور ہوا ہے جو اپنے عہد کا بہت بڑا

سے فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰۔ ۵۱ برگس (Bergs) نے جو ترجمہ انگریزی میں تاریخ فرشتہ کا کیا ہے اس میں پچاسے ابوریحان کے ابوریحان لکھا ہے۔ جس پر ایٹ نے بھی اظہار حیرت کیا ہے اور بعض دیگر انگریزی تاریخوں میں بھی برگس پر اعتبار کر کے ابوریحان ہی لکھ دیا گیا ہے حالانکہ حقیقت اس غلطی کی یہ ہے کہ: Bergs (برگس) نے ابوریحان کو ابوریحان پڑھ لیا (کیونکہ تحریر میں یہ دونوں ایک ہی طرح نظر آتے ہیں اور اگر نقطوں کا محل ذرا بدل جائے تو یہ غلطی بہت ممکن ہو جاتی ہے) افسوس ہے کہ کسی انگریزی مورخ نے اصل کتاب پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ غویب فرشتہ اس الزام سے بری ہو جاتا۔

بیرونی کا پورا نام محمد بن احمد تھا اور ابوریحان اس کی کنیت تھی۔ اس کی تاریخ ولادت ۳۲۹ھ ہے۔ مسٹر سائن (Sassan) نے تحقیق الہند انگریزی ترجمہ (Hinduanis India) کے دیباچہ میں سنہ ولادت ۹۶۳ھ ظاہر کیا ہے۔ اسکی جائے ولادت کا مسئلہ البتہ بحث طلب ہے اگر لفظ بیرونی اس کی جائے ولادت یا مسکن کو ظاہر کرتا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ بیرون میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ بیرون کس جگہ کا نام ہے اور یہ مقام ملک کے کس حصہ میں پایا جاتا تھا۔

شہر زوری اپنی کتاب تاریخ الکما میں بیان کرتا ہے کہ ابوریحان بیرون میں پیدا ہوا تھا جو سندھ کا ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ حاجی خلیفہ نے بھی اس بیان کا تتبع کیا ہے اور ابوالفدا نے بھی ابوسعید کے اسناد سے یہی لکھا ہے۔

ایم ریناڈ (M. Renard) فرانسیسی مورخ نے بھی اس کو سندھی لکھا ہے، اس لئے اب قابل غور امر یہ ہے کہ بیرون سندھ میں کس جگہ واقع ہے؟ جہاں اب حیدر آباد (سندھ) واقع ہے، اس کے قریب ایک مقام بیرون یا نیرون کوٹ، اس جگہ واقع ہے جہاں بیرون کا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ چونکہ نیرون صرف ایک نقطہ کی جگہ بدل جانے سے بیرون پڑھا جاسکتا ہے اسلئے بالکل ممکن ہے کہ ابوالفدا سے یہ غلطی ہو گئی ہو۔ چونکہ ابوالفدا مورخ خود کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا اور سوائے مکہ اور مصر کے سفر کے اس نے کبھی شام کو نہیں چھوڑا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا بیان دوسرے لوگوں کی روایت یا تحریر پر منحصر ہے اور اس غلطی کا امکان اس سے بعید نہ تھا۔ اور کسی نے شہر منصورہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے دریائے ہیران کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ نیرون کے قریب سے ہوتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ تفسیر الکرام اور پنج نامہ میں بھی نیرون ہی کا ذکر ہے۔ یورپین مورخین میں فرانسیسی مصنفین، ابوالفدا کا تتبع کر کے اسکو بیرون لکھتے ہیں اور انگریزی مصنفین اسی کی پیروی کر کے نیرون صحیح سمجھتے ہیں۔ (بقرینہ نوٹ صفحہ ۵۲)

غزنوی عہد پر تبصرہ

فیلڈن اور ماہر ریاضی و ہیئت و علم نجوم سمیت اس نے ریاضی پر مشہور کتاب

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱)

خود بیرونی نے جو جغرافیہ ہندوستان کا لکھا ہے اس میں کہیں بیرون کا ذکر نہیں ہے اگر بیرون کوئی جگہ سندھ میں ہوتی اور وہ وہاں کے حالات لکھتا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیرون کوئی مقام سندھ میں نہیں تھا اور نہ وہ وہاں پیدا ہوا۔

صحتاً نے اپنی مشہور اور نہایت معتبر کتاب الانساب میں جو ۵۶۲ھ کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ بیرونی فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "ماہر کا" اور ہر وہ شخص جو پائے تخت سے باہر پیدا ہوتا تھا اسے بیرونی کہتے تھے۔

فرشتہ نے بھی اس کو خوارزمی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اور اس نے حسب بیان کتاب الانساب بیرونی کے نام سے مشہور ہو گیا نصف صدی سے زائد زمانہ گزر چکا ہے سٹرالنسن (Rawlinson) نے ۱۸۶۹ء کے کوارٹرٹی ریویو

Quarterly Review میں ابوریحان کے کچھ حالات لکھے تھے۔ سٹرالنسن نے اپنی مشہور انگریزی تاریخ ہند میں اس کا ایک جزو نقل کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتا ہے کہ:-

"ابوریحان، خوارزم کا رہنے والا تھا اور سب سے پہلے یہی وہ عرب تھا جس نے صحیح معنی میں مشرق کی تاریخ قدیم کی جستجو کی۔

ابوریحان بہت بڑا فاضل شخص تھا اور اس نے لکھا کہ خوارزم کی تقویم شمسی نہایت مکمل توقیت تھی اور ابوریحان اس سے بخوبی واقف تھا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا سٹرالنسن *Sasha* کی بھی یہی تحقیق ہے۔

ابوریحان اپنے عہد کا بہت بڑا ماہر نجوم، ریاضی دان، مورخ اور حکیم تھا اسے علمی تحقیقات کا اس قدر شوق تھا کہ (بقول شہر زوری) وہ

سال بھر صرف دو دن (نوروز و مہربان) آرام کرتا اور باقی تمام سال تحریر و مطالعہ میں صرف کر دیتا تھا۔

ابو الفضل سہقی نے جس کا زمانہ بیرونی کے نصف صدی بعد ہوا ہے لکھتا ہے کہ:-

"فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا فاضل و محقق تھا۔"

رشید الدین مصنف جامع التواریخ لکھتا ہے کہ:-

"ابوریحان بیرونی اپنے عہد میں بے مثل محقق ریاضی و فلسفہ کا ہوا ہے۔ محمود بنکین کے عہد میں وہ غزنی آیا اور شاہی ملازم ہو گیا۔"

سٹرالنسن، تحقیق الہند کے انگریزی ترجمہ *Alberunis India* کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"محمود کے عہد میں خوارزم ایک مامونی خاندان کے زیر حکومت تھا اور بیرونی اپنے وطن یعنی خوارزم میں فرمانروائے عہد کا مشیر خاص تھا۔

محمود کسی نہ کسی بہانہ سے خوارزم پر بھی قابض ہو جانا چاہتا تھا اور بیرونی اس کا مخالف تھا جب محمود نے خوارزم پر حملہ کر کے اسکو فتح کر لیا

تو وہاں اپنا ایک گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس آیا اس حال میں کہ بہت سا مال غنیمت، مامونی خاندان کے تمام افراد اور بہت سے

لہدی وغیرہ ساتھ ساتھ تھے۔ انہیں لوگوں میں سے ایک ابوریحان بھی تھا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ کیجئے)

”قانون مسعودی“ کے نام سے مرتب کی جس کے صدر میں ایک ہاتھی پر انبار کر کے چاندی اس کو دی گئی۔

اسی عہد کا ایک اور بہت مشہور شخص ابو محمد ناصحی تھا۔ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب مسعودی کے نام سے تصنیف کی اور بادشاہ کے سامنے پیش کی تھی۔

سلطان مسعود نے علاوہ مساجد کے بہت سے مدارس اور کالج (دارالعلوم) ملک کے مختلف حصص میں قائم کئے۔ الغرض مسعود اشاعت علم و ہنر، توقیر فضل و کمال میں اپنے باپ کا صحیح معنی میں جانشین تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ معمولی سا معمولی شخص بھی علم کی طرف توجہ کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کسب علم کے لئے بہت سی آسانیاں پہلک کے واسطے بہم پہنچا دی تھیں۔ طلبہ کو وظائف دئے جاتے تھے۔ اُن کے تمام مصارف کا بار برداشت کیا جاتا تھا اور بہت افزائی میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھانہ رکھا جاتا تھا۔

صاحب ”روضۃ الصفا“ کا بیان ہے کہ مسعود نے ملک کے مختلف حصص میں اس قدر کثرت سے معابد و مساجد، مدارس و کالج تعمیر کرائے کہ اُن کا شمار مشکل ہے اور اس کی فیاضی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک بار ماہ رمضان میں اسے ایک لاکھ درہم ایک ہی دن میں غزبا کو تقسیم کر دئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

چونکہ ابوریحان سے محمود خوش نہیں تھا اور اس کا وزیر احمد ابن حسن مہدی بھی مخالف تھا اس لئے وہ ایک منجم کی حیثیت سے محمود کے دربار میں پایا جاتا تھا۔

مسعود کے عہد میں اس نے کافی ترقی کی اور ہندوستان بھی آیا اور یہاں کی زبان سنسکرت سیکھ کر ایک سنسکرت کتاب ”انگل“ کا عربی میں ترجمہ کر کے اس کا نام ”انجل رکھا“۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مشہور تصنیف ”یاضی قانون مسعودی“ میں اس کتاب سے مدد لی ہے اس کی دوسری کتاب تحقیق الہند بھی بہت مشہور ہے جس کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس نے یونانی زبان سے بھی کئی کتابیں ترجمہ کیں اس کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ ۶۱۳۸-۶۱۳۹ھ اس کا سنہ وفات ہے۔

۱۔ قانون مسعودی کے ترجمہ و اشاعت کا انتظام نواب محمد اسحاق خاں صاحب آئری سکرٹری کالج نے کیا تھا لیکن انیسویں ہے کہ کوئی شخص اس کا ترجمہ نہ کر سکا اور یہ کام انجام کو نہ پہنچ سکا۔ ۲۔ روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء کا مصنف محمد بن خاوندشاہ بن محمود تھا جو میر ”خاوند“ اور میر ”خوند“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۸۳۶ھ کے آخر یا شروع ۸۳۷ھ میں پیدا ہوا۔ ”میر خوند“ کا باپ سید برہان الدین خاوندشاہ ماوراءالنہر کا رہنے والا تھا اس کا سلسلہ نسب حسن ابن علی سے ملتا ہے جب برہان الدین کا انتقال ہوا تو وہ کم سن تھا اور ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ آخر کار بلغ پہنچا اور یہیں تحصیل علم کی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

کی وجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔ فرخ زاد نے تمام محاصل معاف کر دیے اور علی طور سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد سلطان ابراہیم کا زمانہ آیا۔ سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غازی جو سلطان فرخ زاد کے بعد تخت نشین ہوا حد درجہ زاہد و متقی تھا اور باوجود عشوائی شباب کے اس نے لذت نفسانی کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ ماہ رمضان کے ساتھ رجب و شعبان کو بھی ٹالیا کرتا تھا اور اسی طرح سال میں مسلسل تین ماہ روزہ رکھتا تھا اس کا کوئی لمحہ رعیت پروری اور عدل پسندی کے خیال سے غالی نہ گزرتا تھا اور کثرت سے خیرات کرتا تھا۔

ابراہیم کو نصفت پروری اور حسن انتظام کا کس قدر خیال تھا اس کا حال یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ صبح سے دوپہر تک ٹول و مغموم بیٹھا رہا۔ تمام وزرا و اراکین خائف تھے اور کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ دریافت کرے آخر کار ایک درباری جس سے ابراہیم بہت زیادہ مانوس تھا آگے بڑھا اور وجہ دریافت کی۔ ابراہیم نے کہا کہ ”میرا وزیر و مشیر خاص بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ آج میں نے تمام اراکان دربار کو دیکھا تو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو اس کا چانشین ہو سکے۔ کیا یہ افسوسناک امر نہیں ہے؟“ اُس نے عرض کیا کہ ”جہاں پناہ کی نگاہ آفتاب کی طرح منور و تاباں ہے اور معمولی پتھر کو الماس اور ادنیٰ خاک کو سونا بنا سکتی ہے جس کو بھی اس خدمت پر مامور کیا جائے گا وہ اس قابل ثابت ہوگا۔“

سلطان ابراہیم نے جواب دیا۔ ”یہ صحیح ہے لیکن آفتاب کو بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہے کہ وہ کسی بارہ سنگ کو الماس بنا سکے اور ایک کیمیا گر بھی سونا نہیں بنا سکتا جب تک تمام ضروری اجزاء فراہم نہ ہو جائیں۔“

سلطان ابراہیم نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ انتظام سلطنت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں رہے۔ وہ اپنے افسروں کو خود تربیت کرتا تھا اور انھیں مختلف طریقوں سے بتاتا تھا کہ راعی و رعایا کے تعلقات کیا ہیں اور امن و سکون کا قیام کن تدابیر پر منحصر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ قابل سے قابل افسر کے ذہن میں یہ بات قسماً نہ ہونے دیتا تھا کہ سلطنت اس کی محتاج ہے۔ وہ ایک ہی خدمت کے لئے مختلف آدمی رکھتا تھا تاکہ ہر شخص خایف رہے کہ اگر وہ اہل ثابت نہ ہو تو دوسرا اُس جگہ پر گرنے کے لئے موجود ہے۔

فرشتہ، جامع الحکایات کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ سلطان ابراہیم مذہب کی طرف زیادہ مایل تھا اور نہایت پابندی رکھتا تھا۔ وہ امام یوسف سیاف و ندی کی صحبت میں مذہبی معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ سچا و ندی نے سلطان ابراہیم کو سخت الفاظ میں اخلاق کا درس دیا اور اُس نے ہمیشہ صبر و تحمل کے ساتھ اُسے سنا، سلطان ابراہیم درس کے وقت اپنی شانہ چشیت کو بالکل فراموش کر دیتا تھا اور ایک معمولی شاگرد کی طرح زانوئے ادب پر گرنے کے تمام زجر و توبیخ کو تمیز نہ رواداری کے ساتھ

مسعود کریم و فیاض، علم دوست اور پھر پرور ہونے کے ساتھ ہی بے انتہا دلیر و شجاع بھی تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسے رستم ثانی کہا کرتے تھے اور اس کا گزند کوئی شخص ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ وہ علی ثانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ وہ کبھی گوارا نہ کرتا تھا کہ اُس کی سلطنت میں بے امنی یا جور و ظلم رونما ہو۔ وہ قیام امن کے لئے مختلف تدابیر سے کام لیتا تھا اور پش دفعہ اس نے حد درجہ ذہانت سے کام لیا۔ چنانچہ جامع الحکایات راوی ہے کہ ایک بار صحرائے کرمان میں قزاقوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا اور قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ مسعود نے فوج اُسکی سرکوبی کے لئے روانہ کی لیکن وہ سب جنگل میں منتشر ہو گئے اور گرفتار نہ ہو سکے۔ سلطان مسعود کو اسکی اطلاع ملی۔ تھوڑی دیر تک اُس نے غور کیا اور حکم دیا کہ اصفہان سے بہت سے سب لائے جائیں اور ان میں باریک سا سوراخ کر کے زہر ڈال دیا جائے۔ جب سب اس طرح مسموم کر دیئے گئے تو وہ ایک قافلہ کے سپرد کر دیئے گئے جو صحرائے کرمان کی طرف سے گزرنے والا تھا اور ایک دستہ فوج کا بھی مامور کیا گیا کہ قافلہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو۔ جب یہ قافلہ قزاقوں کی جائے پناہ سے گزرا تو اُنھوں نے حملہ کر کے سب پہلے ان سیبوں کو کھانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت اُن کے زہر کے اثر سے ہلاک ہو گئی اور جو چند نفوس بچ گئے اُن کو دستہ فوج نے آکر گرفتار کر لیا۔

اسی طرح ایک بار اُس کے سامنے شکایت پیش ہوئی کہ ایک شخص غور جا رہا تھا کہ اُس نواح کے فرمانروائے اُس کو گرفتار کر کے زبردستی سارا مال چھین لیا۔ مسعود نے ایک تحریر اُس کے پاس روانہ کی کہ سارا مال واپس کر دیا جائے۔ لیکن جو قاصد خط لیکر گیا تھا اس کی بھی سخت توہین کی گئی اور اُس نے مسعود سے سارا حال آکر بیان کیا۔ مسعود نے حکم دیا کہ ”دوبارہ خط لکھا جائے اور ہدایت کی جائے کہ اگر ان تمام باتوں کی تلافی نہ کی گئی تو شاہی لشکر سرکوبی کے لئے روانہ کیا جائے گا۔“ جب یہ خط لکھ گیا تو پھر اُسی قاصد کے سپرد کیا گیا جو پہلے تحریر لے گیا تھا اُس نے عرض کیا کہ ”جہاں پناہ! کسی نہایت ہی مختصر پڑہ پر یہ پیام تحریر فرمایا کہ حکم دیجے کیونکہ وہاں یقیناً مجھے اس کاغذ کے ٹکٹے پر مجبور کیا جائے گا اور کاغذ بڑا ہوگا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی۔“ مسعود نے یہ سنتے ہی طیارہ لشکر کا حکم دیا اور حاکم غور کو شکست دیکر اُس کے ملک پر اپنا قبضہ کر لیا اور جو شخص لوٹا گیا تھا اُس کا مال واپس دلوا دیا۔

غزنوی خاندان کا ساتواں فرمانروا عبدالکریم بن محمود بھی بڑا فاضل و ذہین شخص تھا۔ تاریخ کا اُسے بہت شوق تھا اور خود بھی اکثر لکھنے پڑھنے ہی میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ اسی طرح نواں حکمران فرخ زاد ابن مسعود حد درجہ صلیم و منصف تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو رابلستان و بانی امراض

برداشت کرتا تھا۔

سلطان ابراہیم خط نسخ کا خوشنویس تھا اور ہر سال خود اپنے ہاتھ سے دو ایک نسخے کلام مجید کے لکھ کر کبھی مکہ معظمہ اور کبھی مدینہ منورہ بھی کرتا تھا۔ اور قتی جو افسیہ و شافیہ کا مصنف ہے اسی کے عہد میں ہوا ہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین سعود تخت نشین ہوا۔ یہ بھی نہایت بردبار، فیاض، وسیع الاخلاق، اور کریم النفس شخص تھا اس نے اُن تمام سخت قوانین کو جو اس سے قبل رائج تھے منسوخ کر دیا علاوہ اس کے ٹیکس اور خراج کے ناقابل برداشت رقوم معاف کر کے ملک میں عام طور سے امن و سکون پیدا کر دیا اور تمام وہ جاگیریں جو امراء و دربار کے لئے پہلے مقرر تھیں بہستور بحال کر دیں اس کا عہد جو سترہ سال تک رہا نہایت خوشحالی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے جب تک وہ بادشاہ رہا کسی جاگت نفس امن نہیں ہوا اور رعایا نے اس کے عدل و انصاف، رحم و کرم سے فائدہ اٹھا کر نہایت مطمئن زندگی بسر کی۔

فانداں غزنوی میں بہرام شاہ بھی خاص صفات کا بادشاہ تھا اس نے عمان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے ذوق علم کا ثبوت دینا شروع کیا۔ اس نے علم و فنن کی اس درجہ قدر کی اور ترقی ادب (لٹریچر) میں اس قدر فیاضی اور عالی حوصلگی سے کام لیا کہ لوگ محمود کے زمانہ کو بھول گئے۔ شیخ نظامی اور سید حسن غزنوی جو مشہور شعراء و حکماء ہیں شمار کئے جاتے ہیں، بہرام ہی کے دربار کے جوہر تابندہ تھے۔ بہرام نے مختلف کتابیں غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرائیں اور ان ہی میں سے ایک کلید و منہ بھی تھی۔ عہد قدیم میں یہ کتاب اور شطرنج ہندوستان کے کسی راہ نے نو شیر و آل شاہ فارس کے پاس بھیجی تھی اور اس کے وزیر بزرجمہر نے اس کتاب کا ترجمہ سنسکرت سے پہاوی زبان میں کیا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں ابن المقفع نے اس کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا اور اس عربی نسخے سے بہرام نے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ چونکہ اس ترجمہ میں عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے تھے اس لئے بعد کو سلطان حسین مرزا خوارزمی کے عہد میں مولانا حسین واعظ کاشفی نے پھر اس کو مرتب کیا اور اس کے اشکال دور کر کے اس کا نام انوار سہیلی رکھا۔

الغرض محمود کی نیک نیتی کا یہ اثر تھا کہ تقریباً غزنوی فاندان کے تمام فرمانروا محمود کی کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل تھے یہاں تک کہ آخری فرمانروا خسرو ملک بھی مدد درجہ فیاض، شریف الطبع اور حلیم تھا۔

۱۔ طبقات ناصری (ایڈٹ) جلد دوم صفحہ ۸۰

۲۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۸ (نولکشور)

۳۔ طبقات ناصری (ایڈٹ) جلد دوم صفحہ ۸۱

۴۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰ (نولکشور)

مذہب اور فلسفہ مذہب
دونوں معہ محصول دو روپیہ میں

ابراہیم کی مصحف نویسی

عہد سعود کا اس زمانہ

بہرام شاہ کا ذوق

غیر زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ

ہندوستان کے کامیاب مسلمان فرمانرواؤں کے خصوصیت

شہاب الدین محمد غوری

ہندوستان کا اولین مسلمان فرمانروا

۵۸۹-۶۰۲ھ
۱۱۹۳-۱۲۰۵ھ

شہاب الدین غوری نہ صرف جبری، فراخوصلہ اور مستقل مزاج شخص تھا بلکہ اسی کے ساتھ وہ بے انتہا ضابطہ و تحمل بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کو نہایت سخت مصائب کا سامنا پڑا اور راجگان ہند نے اُسے اکثر درجہ مشتعل و غضب آلود کر دیا لیکن میدان جنگ میں اُس نے کبھی اُس بیجا ظلم و ستم سے کام نہیں لیا جو وحشی و ناشائستہ قوموں کا شعار ہوا جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔

شہاب الدین کی یہ

ہندوستان کے نہایت سخت معرکوں میں وہ معرکہ بھی تھا جو راجہ بنارس اور شہاب الدین محمد غوری کے درمیان پیش آیا لیکن حسب بیان کامل ابن اثیر معادوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے باوجود شدت غیظ کے دوران جنگ میں، اور باوجود فاتح ہونے کے جنگ کے بعد ایک عورت اور بچہ پہ بھی ہاتھ نہیں اٹھایا کیونکہ شہاب الدین محمد غوری کبھی جبر و ظلم یا لکڑ و فریب کو روا نہیں رکھتا۔

۱۔ کامل التواریخ (جسے تاریخ کامل بھی کہتے ہیں) کا مصنف شیخ ابوالحسن علی ابن ابی الکریم محمد ابن عبدالکریم ابن عبدالواحد الیشافنی تھا۔ اس کی عرفیت عزالدین تھی اور عام طور سے ابن اثیر کے نام سے معروف ہے۔ ۵۵۵ھ میں بمقام جزیرہ ابن عمر پیدا ہوا تھا اس نے اُس کے نام کے ساتھ الجزیری بھی لکھا جاتا ہے۔ ابن خلکان جو ابن اثیر کا دوست تھا بیان کرتا ہے کہ اس نے پہلے موصِل میں تعلیم پائی اور پھر بغداد، شام اور بیت المقدس میں۔ بعد فراغ اس نے موصِل میں درس جاری کیا اور اس کا مکان علماء عصر کا مرکز بن گیا۔ ابن خلکان اس سے بہ مقام حلب ۶۲۶ھ میں ملا تھا اور اس کی نسبت یہ رائے قائم کی تھی کہ: ”ابن اثیر بڑا فاضل نہایت برگزیدہ صفات کا شخص ہے لیکن اسی کے ساتھ مدد و شرمیلہ“ دوسری جگہ ابن خلکان اُسے ”شیخنا ابن اثیر“ کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ: ”وہ علم حدیث کا بڑا بحر عالم تھا اور جدید و قدیم تاریخ پر اُسے کامل عبور حاصل تھا۔ اس کی تاریخ کامل جو ابتدائے عالم سے ۶۲۸ھ تک محیط ہے اس کی بے مثل تصنیف ہے۔“ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

مؤلف ”جامع الحکایات“ بیان کرتا ہے کہ:-

”نہروالہ میں شکست کھانے کے بعد جب شہاب الدین محمد غوری واپس آیا تو بعض نے تحریری مشورہ دیا کہ نہروالہ کے ایک سردار واسا پھر نے بہت سا اسباب تجارت جسکی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے ہوگی غرضیں روانہ کیا ہے اس لئے اُس کو ضبط کر لینا چاہئے اور اسی رقم سے ایک فوج طیار کر کے نہروالہ پر حملہ کرنا چاہئے۔“ شہاب الدین محمد غوری نے اس تحریر کی پشت پر جواب لکھا کہ:- ”یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ (جامع الحکایات قسم ۱- باب ۶- حکایت ۳۷)

کیا یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر اس قدر ناز ہے کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے، جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں اور بچوں پر کئے گئے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے، شہاب الدین غوری کی جنگ بنارس سے، جس میں ایک عورت اور ایک بچہ ہلاک نہیں کیا گیا اور حال کے عظیم الشان اصول حرب کو سردار نہروالہ کے واقعہ سے مطابق کر کے دیکھنا چاہئے کہ مخالفت ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینا اولین اصول قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شہاب الدین غوری اب سے آٹھ صدی قبل کے عہد تاریک میں بھی اس کو روانہ رکھتا تھا۔

قطب الدین ایک

۹۰۲-۹۰۶ھ
۱۲۱۰-۱۲۰۶ء

قطب الدین ترکی النسل تھا اور علاوہ جمال ظاہری کے حسن سیرت بھی بدرجہ اتم رکھتا تھا۔ صاحب طبقات ناصری نے لکھا ہے کہ قطب الدین نہایت جری بادشاہ تھا اور سخاوت میں تو اُسے عالم ثانی کہنا چاہئے۔ اس میں وہ صفات حکمرانی پائی جاتی تھیں جو اُس وقت مشرق و مغرب کے کسی بادشاہ میں نظر نہیں آتی تھیں۔ اُس کی اس فیاضانہ فطرت نے سارے ہندوستان کو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۸)

اس میں شک نہیں کہ تاریخ کامل عجیب و غریب تاریخ ہے اور ایشیا و یورپ میں ہر جگہ اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ابن خلدون مشہور مورخ نے بہت کچھ اس سے اقتباس کیا ہے اور یورپ کے موجودہ مورخین نے اسکی مدد سے متعدد تاریخیں لکھی ہیں۔ اسنے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے باتوں کا کچھ حال بیان کیا ہے اور عربوں کی فتوحات سندھ کا بھی ذکر اس میں موجود ہے لیکن ہندوستان کے متعلق اس کا وہ حصہ بہت زیادہ قابل غور ہے جس میں غزنوی اور غوری سلاطین کا حال درج ہے۔ حبیب السیر کا مصنف بیان کرتا ہے کہ تاریخ کامل کا ترجمہ تیمور کے بیٹے میران شاہ کے حکم سے نجم الدین نزاری نے (جو میران شاہ کا کاتب خصوصی تھا) فارسی میں کیا تھا۔ ابن اثیری دوسری کتاب نبایا الصحا بھی بہت مشہور کتاب ہو۔ اس کے دو بھائی اور تھے جو اسکی طرح علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے ان میں سے ایک مجر الدین تھا جس نے اصول حدیث کے فن میں ایک کتاب ”جامع الاسول من حیث الرسول“ لکھی ہے اس کتاب کا مصنف غلطی سے ابن اثیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

اُس کا مطیع بنادیا، یہاں تک کہ ایک شخص بھی اُس کا دشمن نہ تھا۔

شہاب الدین محمد غوری نے اس کی بلند نظری اور عالی حوصلگی کا اندازہ اول اول کیونکر کیا۔ اس کے متعلق مورخین نے بیان کیا ہے کہ ”ایک شب شہاب الدین محمد غوری نے محفل طرب قائم کی اور فرط مسرت کے عالم میں تمام حاضرین کو پیش بہا انعامات دئے۔ ان انعام پانے والوں میں قطب الدین بھی تھا۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین نے جو کچھ زر و جواہر و درہم و دینار پایا جاتا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کر دیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب یہ خبر سلطان کو معلوم ہوئی تو اُس نے قطب الدین کی اس ادا کو بہت پسند کیا اور اُسی وقت طبقہ امرا میں اُسے شامل کر لیا۔ اس کے بعد اُس نے بہت جلد جلد ترقی حاصل کی یہاں تک کہ میرا خویا کے عہدہ پر مامور ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کا وائسرائے ہو کر خود سلاطین غور نے اُسے سلطان ہند تسلیم کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کا زمانہ سلطان شہاب الدین محمد غور کی معیت میں اور نیز خود مختار بادشاہ ہونے کے بعد بھی زیادہ تر حرب و جنگ میں بسر ہوا لیکن اسی کے ساتھ اُس نے اپنے ذوق علم کا بھی کافی ثبوت دیا اور سیکڑوں ادارے قائم کئے جو نہ صرف درس مذہبی بلکہ تعلیم علوم و فنون کا بھی مرکز تھے۔

جب غیاث الدین محمود (غیاث الدین محمد غوری کے بیٹے) نے قطب الدین کے لئے چتر بادشاہی اور خطاب سلطانی ہندوستان روانہ کیا اور قطب الدین تخت دہلی پر بیٹھا تو اُس نے اس قدر داد و دہش کی کہ لک نجش کے نام سے مشہور ہو گیا اور بہاء الدین جو اُس کے عہد کا مشہور فاضل تھا ان الفاظ میں تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

اے نجش لک تو جہان آور ده کان راکف تو کار بجان آور ده
از رشک کف تو خون گرفته دل کان وز لعل بہان در میان آور ده
صاحب تاج المآثر نے لکھا ہے کہ :-

”قطب الدین ایک ایسا عادل بادشاہ تھا کہ اسکے عہد میں بطور ضرب المثل (گرگ و گوسفند ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے)۔“

۱۔ طبقات ناصری جلد ۱ صفحہ ۲۴ - ۲۔ طبقات اکبری صفحہ ۲۰ - ۳۔ میر انور یعنی شاہی اصطبل کا مہتمم۔ اُس کا فرض یہ بھی تھا کہ جب فوج باہر کوچ کرتی تو گھوڑوں کی نگہداشت کرنا اور دیکھتا کہ ان کے دانہ پانی کا انتظام درست ہے یا نہیں۔ ۴۔ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۶۱ - ۵۔ تو ہی وہ شخص ہے جس نے لاکھوں کی نجش کو دنیا میں ظاہر کیا اور زر و جواہر کی معدنی تیری فیاضی کو دیکھ کر مسد سے چلنے لگیں۔ لعل تو صرف بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تیرے دستِ کرم کے کرشمے دیکھ کر معدن کا دل خوں ہو گیا ہے۔ ۶۔ تاج المآثر میں زیادہ تر صرف قطب الدین ایک کے حالات درج ہیں معلوم نہیں اسکو تاج المآثر کیوں کہتے ہیں حالانکہ مصنف نے کہیں اس کا نام ظاہر نہیں کیا۔ مشرق میں یہ کتاب ہمیشہ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔ لیکن یورپ کو اس کا علم صرف پیر (Hearn) کے تفصیل سے حاصل ہوا۔ پیر لکھتا ہے کہ :- ”اگر حسن لفظی (مولف تاج المآثر) قطب الدین کے حالات دیکھتا تو آج یہ بھی ان دوسرے فرمانرواؤں کی طرح گنہگار حالت میں رہتا جس کے حالات کہیں تاریخ سے معلوم نہیں ہوتے۔“ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ کیجئے)

سرزمین محفوظ تھیں۔ رہزنی مفقود ہو گئی تھی اور تمام رعایا خوشحال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ تعصب بالکل نہ تھا۔ ہندو بھی مسلمانوں کے برابر سلطان قطب الدین کی فیاضی سے حصہ پاتے تھے اور انصاف میں مذہب و دولت، جاہ و امارت کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا تھا۔ اس نے دہلی میں ایک نہایت عمدہ مسجد جامع طیار کرائی شروع کی، جس کی یادگار قطب مینار کی صورت میں اب بھی پائی جاتی ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۰)

حسن نظامی کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں اس نے تاج المآثر کے دیباچہ میں اپنا نام حسن نظامی تحریر کیا ہے۔ میر خوند نے اس کا نام صدر الدین محمد بن حسن نظامی ظاہر کیا ہے اور ابو الفتح نے بھی آئین اکبری میں یہی نام درج کیا ہے۔

ہمیر نے اسے باشندہ لاہور بتایا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ وہ فیشتاپور کا رہنے والا تھا اور اس نے اس وقت تک اپنا وطن نہیں چھوڑا جب تک خراسانی کے حالات نے اسے اس پر مجبور نہیں کر دیا۔ یہ پہلے غزنی آیا اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ راہ کی سمجھوتوں کا حال اس نے نہایت موثر انداز میں لکھا ہے۔ دہلی پہنچ کر وہ شرف الملک قاضی شہر سے ملا اور چند دن بعد احباب کے اصرار سے اس نے تاریخ مرتب کرنی شروع کی۔

۶۱۲ھ میں اس تاریخ کی ترتیب شروع ہوئی اور اسی سال شعبان کے مہینہ میں شہاب الدین محمد غوری کی وفات وقوع میں آئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت تاج المآثر کی تحریر شروع ہوئی محمد غوری زندہ تھے اور اس نے حسن نظامی نے اس کے نام سے اپنی تاریخ کو منسوب کیا۔

ہمیر گٹال (Hemmer Gital) کی تحقیق کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی غلط ہے۔ اس نے اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین سے منسوب کیا ہے لیکن مسٹر ہمیر نے اس محمد بن سام کو فرانز واسے لاہور خیالی کیا۔ حالانکہ مصنف کا مقصود اس سے شہاب الدین محمد غوری ہے۔ یہ تاریخ ۵۸۶ھ سے شروع ہوتی ہے جب محمد غوری اپنی شکست تھا میں سرکانتھا لینے کے لئے حملہ ہندوستان کی طایاریاں کر رہا تھا۔ عام طور سے جو نسخے تاج المآثر کے نظر آتے ہیں ان میں ۶۱۴ھ (یعنی قطب الدین ایبک کے سات سال بعد تک) کا سال درج ہے۔ لیکن بعض قلمی نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ۶۲۶ھ (یعنی شمس الدین التمش کے زمانہ) کے حالات بھی درج کئے ہیں۔

اس کتاب میں عربی اور فارسی عبارتیں دونوں کثرت سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں اور تشبیہات، استعارات و دیگر صنایع و بدایع سے بہت زیادہ کام لیکر مورخانہ حیثیت کو ضعیف کر دیا ہے۔

سلطنت قطب الدین ایبک کے متعلق جو تاریخی حالات اس میں درج ہیں وہ نہایت قلیل اور غیر اہم ہیں۔ ہمیر نے شمار کر کے ظاہر کیا ہے کہ اس میں بارہ ہزار سطر ہیں جس میں سات ہزار سطر عربی اور فارسی کے اشعار پر مشتمل ہیں۔

شمس الدین التمش

۶۰۶ - ۶۳۳ھ
۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ھ

التمش کی زندگی زیادہ تر سیاسی مشاغل جنگ و حرب میں بسر ہوئی لیکن پھر بھی اُس کی فیاضیوں نے دہلی کو علماء و فضلاء کا مرکز بنا رکھا تھا۔ قاضی حمید الدین ناگوری، ملا عابد الدین، ملا جمال الدین اسی عہد کے درخشندہ جوہر تھے۔ فخر الملک عطائی جو تیس سال تک وزیر اعلیٰ اور چکا تھا اور کمالات ظاہر و باطن میں شہرت تمامہ رکھتا تھا سلطان التمش کے دربار میں آیا اور اُسی کی قدر شناسی نے اُسے منصب وزارت پر متمکن کیا۔ نور الدین محمد غزنوی (جامع الحکایات کا مصنف) اسی کے زمانہ میں تھا۔ جب چنگیز خانی فتنہ سے وسط ایشیا درہم و برہم ہو رہا تھا تو بہت سے علماء و فضلاء ہندوستان کی طرف بھاگ آئے اور انھیں میں امیر و خانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التمش نے اُس کی بہت قدر کی یہ شخص اپنے عہد کا بہت بڑا شاعر تھا۔ فتوحات التمش میں اس کے یہ اشعار تہنیت خاص شہرت رکھتے ہیں :-

خبر بہ اہل سما بُرد جب بریل امین ز فتحنامہ سلطان عہد شمس الدین
کہ اے ملائکہ قدس آسمانہارا بدیں بشارتے بندید کلہ و آئین
کہ از بلاد سوا ملک شہنشاہ اسلام کشاد بار دگر قلعہ سپہر آئین
شہ مجاہد و غاری کہ دست تیغیش را روان حیدر کرار می کند تحسین

اُس نے ایک بہت بڑی درسگاہ تعمیر کرائی تھی جہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اور وظائف حاصل کر کے تحصیل علوم میں مشغول رہتے تھے، فیروز شاہ تغلق ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اپنی فتوحات فیروز شاہی میں اس مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

”مدرسہ سلطان شمس الدین التمش مسمار ہو چکا تھا میں نے دوبارہ اُس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے علاوہ اس کے ستون صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سر نو تعمیر کرایا“

اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق نے اُس تالاب کا بھی ذکر کیا ہے جو حوض شمس کے نام سے مشہور ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس کی مرمت کرائی اور پانی آنے کے جو راستے مسدود کر دئے گئے تھے اُن کو صاف کرایا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ :-

”شمس الدین لقمش بڑا صالح اور عادل بادشاہ تھا، دادرسی کی طرف اُسے خاص توجہ تھی چنانچہ اُسے حکم دیا تھا کہ سوائے فریادی اور مظلوم کے اور کوئی شخص رنگین کپڑے نہ پہنے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو رنگین لباس میں دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور فوراً بلا کر اُس سے حالات دریافت کرتا۔ انصاف کرنے کے لئے وہ شب و روز ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس نے محل کے دروازہ پر دو شیر سنگ مرمر کے رکھے اور اُنکے گلے میں دو آہنی زنجیریں ڈال کر اُن میں گھنٹیاں لٹکا دیں۔ جب کوئی مظلوم رات کو آتا تو زنجیر کو جنبش دیتا اور سلطان فوراً قصر سے باہر آ کر اُس کی فریاد سنتا۔“

رضیہ سلطان

۶۳۲-۶۳۶
۶۱۲۳۹-۶۳۶

رضیہ نے تخت نشین ہوتے ہی تمام اُن قواعد و ضوابط کو جو اس کے باپ کے عہد میں رائج تھے اور رکن الدین کے زمانہ میں باطل ہو چکے تھے از سر نو قائم کیا اور کمال احتیاط کے ساتھ اپنی عادلانہ حکومت شروع کی۔

نظام الملک محمد بنیدی وزیر اور بعض دیگر امراء نے مخالفت کی اور آمادہ جنگ ہوئے، لیکن رضیہ نے اپنے حسن تدبیر اور فطری شجاعت سے کام لے کر ان سب کو درہم و برہم کر دیا اور اپنی مخالف قوتوں کا استیصال تمام کر دیا۔

جو عزل و نصب اُس نے اپنی حکومت میں کئے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی مردم شناس تھی چنانچہ ہندی غزنوی کا بیٹا تقرر (جائے نظام الملک بنیدی کے) عہدہ وزارت پر اور ملک سیف الدین ایبک کا نیا بت لشکر پر اور سلطنت کے تمام دیگر حکام و امراء کا ایک مقام پر تبادلاً اسکی کافی شہادت ہے۔ جب حکام اور صوبہ داروں کو رضیہ کی قوت اور اہلیت کا علم ہو گیا تو ساری مملکت میں لکھنوتی سے لیکر دیول تک تمام سرداروں اور امیروں نے سرطاعت اس کے سامنے خم کر دیا۔

منہاج السراج مصنف طبقات ناصری اسی کے عہد میں ناصریہ کالج سے متعلق ہوا اور گوالیار کا قاضی مقرر کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ کسی علم دوست اور ہنر شناس تھی۔ طبقات ناصری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اسوقت مغربی کالج موجود تھا جس کے دروازہ کو جامع مسجد کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔

رضیہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور قبائلاہ کے ساتھ دربار کیا کرتی تھی۔ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی تھی، لیکن گھوڑے کی سواری اُسے بہت پسند تھی۔ جنگ کے وقت فوج کی ترتیب خود کرتی تھی اور سب کے دوش بدوش میدان کارزار میں دادرمانی دیتی تھی۔

۱۔ طبقات ناصری جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۔ ۲۔ طبقات ناصری نے اس واقعہ کو رضیہ کے ابتدائی عہد میں درج کیا ہے لیکن طبقات اکبری اور دیگر کتب تاریخ شمس الدین لقمش کے آخری عہد میں اس کا وقوع ظاہر کرتے ہیں جن موزنین نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اُن سب کا مافذ ذمہ التواریخ مصنف نورالحق ہے۔

ناصر الدین محمود شاہ

۶۶۴-۶۶۳
۱۲۴۶-۱۲۴۵ھ

ناصر الدین علاوہ عادل و شجاع ہونے کے علاوہ عابد و متاوض تھا۔ خزانہ شاہی سے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر صرف نہ کرتا تھا اور صرف کلام مجید لکھ کر اپنا نفقہ حاصل کرتا تھا۔

ابن بطوطہ مشہور سیاح نے ناصر الدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن خود دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ:-
”قاضی کمال الدین نے مجھے ایک نسخہ بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا جو نہایت خوش خط تھا“

نظام الدین احمد کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ:-

”وہ ہر سال دو مصحف کی کتابت کرتا۔ ایک بار اُس قلمی مصحف کسی امیر نے زیادہ قیمت دیکر خرید لیا سلطان کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسے ناگوار ہوا اور آئندہ کے لئے حکم دیا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید خفیہ طور سے بازار کی معمولی قیمت پر فروخت کیا جائے“

سلطان ناصر الدین صرف ایک منگوسہ بی بی رکھتا تھا اور کوئی خادمہ وغیرہ نہ تھی۔ ایک دن بی بی نے شکایت کی کہ میرے ہاتھ روٹی پکاتے پکاتے چلے جاتے ہیں اگر کوئی کینز لے لی جائے تو کیا حرج ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ:- ”بیت المال ہنگام خدا کا حق ہے میں اس میں سے کچھ صرف نہیں کر سکتا ورنہ کوئی کینز مہیا کر دیتا“

ناصر الدین دوسرے کے جذبات کا بہت لحاظ کرتا تھا اور کبھی کسی کو تکلیف پہنچانا یا مایوس کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ ایک بار وہ کلام مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ ایک شخص اجنبی آگیا اور بولا کہ ”لفظ فیہ مکرر لکھا ہوا ہے“ سلطان نے فوراً اُس لفظ کے گرد قلم سے حلقہ کھینچ دیا اور اُس شخص کا حال پوچھ کر رفع حاجت کر دی۔ جب وہ چلا گیا تو پھر قلم تراش سے اُس حلقہ کو مٹا دیا۔ ایک غلام نے دریافت کیا کہ حلقہ کھینچنے اور پھر اُس کے محو کر دینے کا کیا سبب تھا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ ”یہ شخص اپنی حاجت لیکر آیا تھا اگر میں اُس سے کہہ دیتا کہ لفظ فیہ غلط تحریر نہیں ہوا تو وہ نادام ہو جاتا اس لئے میں نے حلقہ کھینچ دیا کہ اس کا محو کر دینا بہ نسبت غبارِ ملال رفع کرنے کے زیادہ آسان ہے“

مذہب کا وہ حدودِ احترام کرتا اور عظمتِ نبوی کے خیال سے ہر وقت کا پتہ رہتا تھا۔ اس کا ایک ندیم تھا جس کا نام محمد تھا۔ سلطان ناصر الدین جب اس کو بلاتا تو ہمیشہ نام لیکر پکارتا اور جو کام ہوتا کہہ دیتا۔ ایک دن تاج الدین کہہ کر آواز دی

نہیم آیا اور کام کر کے گھر چلا گیا۔ جب تین دن تک حاضر نہ ہوا تو سلطان نے اُس کو طلب کر کے وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ ”سلطان ہمیشہ میرا نام لیکر پکارا کرتا تھا اُس دن بالکل خلافت معمول تاج الدین کہلے آواز دی، میں سمجھا کہ سلطان کچھ بھرم ہے بے یقین و مضطرب ہو کر گھر چلا گیا“ سلطان نے قسم کھا کر کہا کہ ”میں تم سے مطاق رنجیدہ نہیں ہوں اُس دن تمہارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں با وضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ محمد میں اپنی زبان سے ادا نہ کر سکتا تھا“

غیاث الدین بلبن

۶۶۴-۶۸۶ھ
۱۲۶۵-۱۲۸۶ء

ابن بطوطہ نے بیان کیا کہ جب بلبن سلطان شمس الدین التمش کے روبرو لایا گیا تو اُس نے خریداری سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بہت پستہ قامت اور بد صورت تھا۔ بلبن نے یہ معلوم کر کے سوال کیا کہ ”جہاں پناہ اور غلام کس کے لئے خریدے گئے ہیں؟“ التمش نے منہس کر جواب دیا کہ ”اپنے لئے“ بلبن نے عرض کیا کہ ”تو پھر ایک مجھے خدا کے لئے مول لے لیجئے“ یہ سن کر التمش خوش ہوا اور اسکو مول لے کر سقہ کی خدمت سپرد کر دی۔

چونکہ بلبن فطرت کی طرف سے بہترین صفات و خصایل لیکر آیا تھا اس لئے اُس کا تقرب بڑھتا گیا۔ رضیہ کے عہد میں میر شکار ہو گیا اور سلطان بہرام شاہ نے اس کو میر آخور بنا دیا۔ سلطان علاء الدین مسعود کے زمانہ میں ”امیر حاجب“ ہو گیا اور سلطان ناصر الدین نے تو تمام امور سلطنت ہی اس کے سپرد کر دیئے۔ یہاں تک کہ سلطان ناصر الدین کے بعد بالاتفاق سب نے اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

بلبن نے اپنا طویل زمانہ سلطنت جس فراست و دانائی سے بسر کیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ مخصوصیات کیونکر اسے حاصل ہو گئیں جبکہ اس کا زمانہ تربیت کافی تکلیف و مصائب میں بسر ہوا۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا کہ

لے فرشتہ صفحہ ۷۷۔

لے ضیاء الدین برنی کی ”تاریخ فیروز شاہی“ نہایت مشہور کتاب ہے جس سے دیگر مورخین (فرشتہ وغیرہ) نے بہت مدد لی ہے۔ یہ کتاب ناصری کے بعد لکھی گئی۔ منہاج السراج نے سلطنت سلطان ناصر الدین محمود کے صرف پندرہ سال تک کے حالات لکھے تھے، اس کے بعد ایک صدی تک کسی مورخ نے توبہ نہیں کی آخر کار ضیاء الدین برنی کو خیال پیدا ہوا اور اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کر کے سلطان فیروز شاہ تغلق کے حالات پر ختم کر دیا ہے۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس نے یہ تاریخ مرتب کی تھی اس لئے اسی کے نام سے منسوب کی گئی۔ تاریخ فیروز شاہی میں مسلسل واقعات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور تاریخوں کی صحت کی طرف بھی زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا۔ تاہم اس لحاظ سے کہ اس عہد کی تاریخ کوئی اور مرتب نہ تھی تمام مورخین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ضیاء الدین برنی کا آخری زمانہ نہایت افلاس و تنگ دستی میں بسر ہوا اس کی قبر حضرت امیر خسرو کے مزار کے قریب ہی نظام الدین (دہلی) میں واقع ہے۔

بلبن کی فرض شناسی

”جس زمانہ میں یہ صرف ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا اُس وقت وہ عیش و تفریح کی طرف مایل تھا۔ بذلہ سنج ندیم اور خوش گلو مغنی اُس کی محفل میں رہتے تھے اور وہ بھی بادہ خواری، قمار بازی اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل میں مصروف نظر آتا تھا لیکن جب بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنی زندگی کا ورق ہی اُلٹ دیا۔ نہ کہیں محفل عیش و طرب تھی نہ ہزم بادہ خواری وہ سردار جہتیں۔ نجیدہ ہو گیا۔ شراب خواری کو نہ خود ترک کیا بلکہ عام طور سے اُس کے استعمال کی سخت ممانعت کر دی۔ ناز و روزہ کا سختی کے ساتھ پابند ہو گیا، یہاں تک کہ اشراق و تہجد کی ناز بھی وہ ترک نہ کرتا تھا، ہمیشہ با وضو رہتا، بغیر علماء و صلحاء کی صحبت کے کھانا نہ کھاتا، ہمیشہ اُن سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا رہتا اور بزرگوں کے مکانوں پر خود حاضری دیتا، لوگوں کی تعزیت کرتا، اکابر کے جنازوں میں حاضر رہتا اور اگر راستہ میں کہیں مجلس وعظ برپا دیکھتا تو تعظیماً سواری سے اتر پڑتا اور کچھ دیر سنتا۔ یہ تھا اُس کے زہد و ورع کا عالم“

انتظامِ سلطنت اور ادبِ حاکمانی

انتظامِ سلطنت کا اُسے اس قدر خیال تھا کہ جب تک وہ پوری طرح کسی شخص کی شرافت نفس اور اہلیت کو معلوم نہ کر لیتا اُس وقت تک اُس کو کوئی عہدہ نہ دیتا اور اگر کوئی ملازم یا حاکم صلاح و تقویٰ، دیانت و امانت سے منحرف ہو جاتا تو فوراً معزول کر دیتا۔ کبھی رذیل اور معمولی لوگوں سے بات نہ کرتا۔ کسی ہزل گو یا مسخرہ کو دربار میں آنے نہ دیتا اور ہمیشہ نہایت سنجیدہ اور معقول لوگوں کو اپنی صحبت میں رکھتا۔ وہ قہقہہ سے کبھی نہ ہنستا تھا اور نہ کسی اور کو جرات ہوتی تھی کہ اُس کے سامنے ہنستے

ملحقات طبقاتِ ناصری مصنفہ شیخ عین الدین بیجا پوری کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ ”فتنہ چنگیز خانی سے بھاگ کر ترکستان، ماوراء النہر، خراسان و عراق، فارس اور روم و شام وغیرہ کے پندرہ شاہزادوں نے بلبن کی سلطنت میں پناہ لی تھی بلبن نے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک محلہ الگ کر دیا تھا اور سب کے شاہانہ وظائف مقرر کر دئے تھے۔

چونکہ اس زمانہ میں وسط ایشیا اور اس کے حوالہ کے تمام صاحبانِ کمال تاریخی فتنہ سے پریشان تھے اس لئے ان کے لئے سوائے سلطنتِ دہلی کے اور کوئی مامن نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ:-

”زبدہ و نجبہ و خلاصہ عالم از اصحابِ سیف و قلم و سازندہ و خوانندہ و اربابِ ہنر کہ در بے مسکون عدیل و نظیر نہ داشتند در درگاہِ بلبن جمع شدہ بودند و درگاہ اور ابر درگاہ محمودی و بخاری ترجیح می دادند“

بلبن کی عدل پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا اور نہ کسی کی سفارش کو ماننا تھا اس نے اپنے لڑکوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر کبھی تمھاری طرف سے ظلم و ستم ظاہر ہوگا تو میں بغیر سزا دئے ہوئے نہ چھوڑوں گا۔

جو نصیحتیں وہ اپنی اولاد کو سناتا تھا اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کن اصول پر حکمرانی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک بار

انتظامِ سلطنت اور ادبِ حاکمانی

فیاضی و درباری - دربارِ بلبن علماء کا مرکز تھا - عدل پروری

اپنے بیٹوں سے کہا کہ ”دیکھو ایک بادشاہ کی نجات چار باتوں پر منحصر ہے ایک یہ کہ وہ خدا سے ڈر کر رعایا کے آرام و سکون کا انتظام کرے۔ دوسرے یہ کہ فسق و فجور کا ملک سے استیصال کلی کر دے۔ تیسرے یہ کہ خدمات حکومت ہمیشہ خدا ترس، امین اور شایستہ لوگوں کے سپرد کرے۔ چوتھی بات یہ کہ ظلم و ستم نہ ہونے دے اور انسانیت کرنے میں کسی کی رعایت نہ کرے۔“

ایک بار ملک نعیق پسر جادار نے جو امراء کبار میں سے تھا اور ولایت بدایوں اُس کی جاگیر میں تھی حالت مستی میں ایک فراش کو اس قدر دڑے مارے کہ وہ مر گیا۔ جب سلطان بلبن بدایوں پہنچا تو فراش کی بیوی دربار عام میں حاضر ہوئی۔ سلطان بلبن نے اُسی وقت سب کے سامنے ملک نعیق کو طلب کیا اور اس قدر دڑے لگوائے کہ وہ بھی مر گیا اور بدایوں کے بریدوں پر چنگاروں کو جنھوں نے اس واقعہ کی اطلاع اُسے نہیں دی تھی شہر کے پھاٹک پر سولی دیدی۔

اسی طرح ایک بار ہیبت خاں نے جو سلطان بلبن کے نہایت معتبر غلاموں میں سے تھا اور اقطاع اوڈھ جاگیر میں رکھتا تھا ایک شخص کو حالت مستی میں مار ڈالا۔ اُس کی بیوی سلطان کے پاس فریاد لائی۔ سلطان نے ہیبت خاں کو طلب کر کے پانچ سو دڑے لگوائے اور عورت سے کہا کہ ”ہیبت خاں آج تک میرا غلام تھا لیکن آج سے تو اس کی مالک ہے۔ تجھے اختیار ہے چاہے مار ڈال چاہے معاف کر دے۔“ مشکل تمام ہیبت خاں نے بیس ہزار تنگہ دے کر اُس عورت کو راضی کیا اور نجات پائی۔ سلطان بلبن نے اپنی سلطنت کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کثرت سے جاسوس یا برید مقرر کر دئے تھے اور وہ نہایت سختی سے احتساب کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ جاسوس کوئی غلط خبر اُس تک پہنچا سکتا تھا اور نہ حکام کو جادہ اعتدال سے ہٹنے کا یارا تھا۔

بلبن نے تخت نشین ہوتے ہی جس طرف توجہ کی وہ سپاہ تھی اس نے تمام فوج کا جائزہ لیا اور کمان ایسے ہاتھوں میں دی جن کی وفاداری مسلم تھی۔ بلبن اپنی سلطنت میں دورہ بھی کثرت سے کیا کرتا تھا اور خود انتظامی حالات کو دیکھ کر اُن میں اصلاحیں کیا کرتا تھا۔ ہر چند وہ نظم و نسق کے باب میں بہت سخت تھا لیکن پھر بھی وہ بہت رحم و کرم کرتا اور ضعیفوں کا بہت خیال رکھتا۔ ایک بار بلبن کو معلوم ہوا کہ عہد شمس (شمس الدین تہمش) کے بہت سے سپاہی ضعیف ہو کر بیکار ہو گئے ہیں۔ بلبن نے حکم دیا کہ جو مواضع اُن کے پاس ہیں خالصہ میں لے لئے جائیں اور سڑیک کے لئے تیس تنگہ بطور مدد معاش کے مقرر کر دیا جائے۔ اس سے ان لوگوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور سب کے سب ملک فخر الدین کو توال کے پاس روتے ہوئے آئے۔ کو توال بلوچ مضمحل سلطان کی خدمت میں گیا اور دریافت کرنے پر عرض کی کہ ”جہاں پناہ نے ضعیف کو اپنے رحم و کرم سے محروم کر دیا ہے اگر خدا نے قیامت کے دن بھی اسی طرح ہم ضعیفوں کو مردود کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟“ یہ سن کر سلطان بلبن بہت رویا اور فرمایا کہ ”بچ سابق پر سب کی معاش بحال رکھی جائے اور آئندہ کوئی تعرض نہ کیا جائے۔“

سفر کے دوران میں اگر کسی ٹیل، گھاٹ یا گزرگاہ عام پر پہنچ جاتا تو اپنے سرداروں کو مقرر کرتا کہ سب سے پہلے عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور کمزور جانوروں کے گزر جانے کا انتظام کریں اور پھر دوسرے لوگ عبور کریں۔

سلطان بلبن کبھی اس کو گوارا نہ کرتا کہ کوئی شخص اُس کی سلطنت میں بغاوت یا نقص امن کا مجرم ہو۔ وہ مفسدوں اور باغیوں کو سخت سزائیں دیتا اور خود فوج لے کر سرکوبی کرتا۔ طغرل کی بغاوت میواتیوں کی شورش اس کے عہد کے خاص واقعات ہیں۔ پھر بلبن نے جس طرح ان فتنوں کو فرو کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست میں بھی وہ خاص ملکہ رکھتا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن اپنے تمام صفات رحم و کرم، بذل و نوال کے ساتھ سطوت و جبروت بھی بدرجہ اتم قائم رکھتا تھا اور لوگوں کے دلوں میں اس نے اپنی ہمیت و عظمت بہت قائم کر رکھی تھی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال جب اس نے جلوس نکالا تو سیکڑوں کوس سے لوگ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور اس قدر تزک و احتشام کی نمائش کی گئی کہ دنیا متحیر تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ نے اس شان و شوکت کا اظہار نہیں کیا۔

وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی اس کا لحاظ رکھتا تھا کہ کوئی خادم گستاخ نہ ہو جائے اور اس کے بعض ایسے خادم جو ہر وقت خلوت میں ساتھ رہتے تھے اُن کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کو خلوت کے نصف لباس میں نہیں دیکھا ہمیشہ وہ اپنے پورے ملبوس میں نظر آتا تھا۔

بلبن کے بڑے بیٹے کا نام محمد سلطان تھا جو بعد کو خان شہید کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے انتظام میں بلبن نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مکارم اخلاق اور محاسن اوصاف میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ فضیلت دانش و ہنر میں بھی وہ بے مثل شخص تھا اور اس کا دربار علماء و فضلا کا مرکز تھا۔ صاحبان فضل و کمال اور شعراء عصر ہر وقت اس کے پاس جمع رہتے اور وہ اپنی شاہانہ بخشش سے سب کو مال کر دیتا۔ حضرت امیر خسرو جن کی ذات پر ہندوستان کو فخر حاصل ہے اور خواجہ حسن جو بہترین شعراء میں سے تھے اسی شاہزادہ کے دربار کے عواہر تائبندہ ہیں سے تھے۔ محمد اس قدر مہذب تھا کہ مجلس میں بعض اوقات پورا ایک ایک دن ایک ایک رات بسر ہو جاتی لیکن اپنا زمانہ باندہ نہ کرتا۔ وہ قسم نہ کھاتا اور اگر کبھی ضرورت ہوتی تو صرف ”حقاً“ کہہ دیتا۔ عمر بھر اس کی زبان سے کوئی ناپائیدار لفظ نہیں نکلا۔ اس کی مجالس میں زیادہ تر شاہنامہ، دیوان خاقانی و انوری خمسہ نظامی اور اشعار امیر خسرو پڑھے جاتے۔ حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ:-

”بہدت طبع و دریافت معنی دقیق و سخن شناسی و یادداشت اشعار متقدمین و متاخرین ہیچو محمد سلطان کم کسے را دید ام“

محمد سلطان کے پاس ایک بیاض تھی جس میں اُس نے بیس ہزار اشعار قدما کے انتخاب کئے تھے۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن کا بیان ہے کہ اُس سے بہتر انتخاب کوئی دوسرا کر ہی نہ سکتا تھا، جب محمد سلطان شہید ہوا تو اس بیاض کو سلطان

بلبن نے امیر علی جامدار کے سپرد کیا اور پھر یہاں سے حضرت امیر خسرو کے پاس پہنچی اور اُس سے بہت سے صاحبانِ ذوق نے اشعار کا انتخاب کیا۔

اقامتِ ملتان کے زمانہ میں شیخ عثمان ترمذی جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ و درویش تھے تشریف لائے۔ محمد سلطان نے تحائف پیش کر کے اقامتِ ملتان کی درخواست پیش کی اور ایک خانقاہ تعمیر کر کے دیہات وقف کر دینے کا وعدہ کیا لیکن شیخ نے قبول نہ کیا۔

اگر اس کی مجلس میں احیاءِ نا کوئی شعر ایسا پڑھ دیتا جس میں کوئی پند و نصیحت ہوتی تو سارے کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ایک بار صحبتِ سماع برپا تھی شیخ عثمان اور شیخ صدر الدین بن شیخ بہاء الدین ذکر یا بھی موجود تھے کسی شعر پر اہل لوگوں کو رقت طاری ہوئی تو سلطان محمد فرطِ تاثیر سے بیتاب ہو گیا اور ان حضرات کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر زار زار رونے لگا۔

سلطان محمد نے دوبار اپنا خاص آدمی اور قیمتی تحائف شیخ سعدی شیرازی کے پاس بھیج کر ملتان آنے کی درخواست کی لیکن شیخ نے اپنی ضعیفی کا ذکر کر کے معذرت چاہی اور کہلا بھیجا کہ امیر خسرو وہاں موجود ہیں اُن کی قدر دانی فرمائی جائے۔ بلبن کے عہد میں اور بھی بڑے بڑے صاحبِ کمال موجود تھے مثلاً شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج، شیخ الشیوخ بہاء الدین زکریا، شیخ صدر الدین بن شیخ بہاء الدین، شیخ بدر الدین غزنوی، خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سید مولہ وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک بے مثل شخص تھا۔

علاوہ مشائخ و علماء کے اور لوگ بھی خاص خاص صفات کے موجود تھے مثلاً ایک کشتی خاں جو تیر اندازی، نیزہ بازی اور دیگر فنونِ حرب میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اسی طرح بلبن کا برادر زادہ علاء الدین محمد بن اعز الدین جو مجلسِ آرائی اور بخشش و کرم میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مصر و شام، روم و بغداد، عراق و خراسان وغیرہ سے شعراء اور اکابر علماء آتے تھے اور اس کے بذل و نوال سے بہرہ مند ہو کر نہایت مطمئن و مسرور واپس جاتے تھے ایک بار خواجہ شمس الدین اور خواجہ حسین الدین قطب الدین حسن غوری کے ندیم خاص نے چند اشعار علاء الدین کی مدح کہہ کر مغنیوں کو یاد کرا دیے اور تاکید کر دی کہ تقریبِ نوروز (جشنِ بلبنی) میں ان کو گاکر سنائیں جب جشن منعقد ہوا تو مطربوں نے وہی اشعار مدح سنائے، علاء الدین بھی موجود تھا۔ یہ شکر مجلس سے اُٹھ گیا اور گھر پہنچ کر دریافت کیا کہ یہ اشعار کس کے تھے اور خواجہ شمس الدین کو طلب کر کے مجلسِ نوروز کا تمام سامان و اسباب جو اُس نے اپنے لئے ترتیب دیا تھا اُٹھا کر اس کو دیدیا اور دس ہزار تھکے مطربوں کو بلا کر دیا۔ اس کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آخر وقت میں اس کے پاس سوا اُس کپڑے کے جو اُس کے جسم پر تھا ایک چیز بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔

بلبن نے جو پہلے ایک معمولی غلام تھا اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے میر شکار، میر انور، جنرل اور وزیر کے درجہ تک پہنچا۔ بحیثیت بادشاہ اور وزیر ہونے کے چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور اس میں شک نہیں کہ اس کا زمانہ عجیب خیر و برکت کا زمانہ تھا، انتظام سلطنت، عدل و انصاف، بیدار مغزی و دور اندیشی، رحم و کرم، علم پروری، ہنر شناسی الغرض ہر اعتبار سے سلطان بلبن اپنا جواب نہ رکھتا تھا، رعایا مسرور و مطمئن تھی، عمال امین و متدین تھے۔ علماء و فضلا، شعراء و مشائخ کا ہجوم تھا۔ علم و فضل کا چشمہ ہر جگہ سے اُبھتا ہوا نظر آتا تھا ملک میں ہر جگہ امن و سکون کی حکومت تھی۔ تمام ایشیا کے بڑے بڑے شاہزادے، امراء اور شعراء دربار کی رونق بڑھا رہے تھے اور حضرت امیر خسرو کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ”اس وقت بخارا بھی جو وسط ایشیا کا بہت بڑا مرکز علم و ہنر تھا، وہی پر رشک کر رہا تھا۔“

سٹرلین پول کی رائے ہے کہ سلطان بلبن سے زیادہ کسی بادشاہ نے نہیں سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے اور یہاں کی رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔

غیاث الدین بلبن کی تمام سیاسی زندگی ایک مرقع ہے اُس جبرأت و بے مالت و فراست و دانائی کا جو نہ صرف غلام خاندان بلکہ تمام مسلم فرمانروایان ہند میں بہت کم نظر آتا ہے۔

اس نے مسلسل بیس سال تک ناصر الدین محمود شاہ کی جس محنت و صداقت سے خدمت انجام دی اُس کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ وہ زمانہ کس سازش و بغاوت کا تھا اور مغلوں نے حکومت ہند کے قیام کو کس قدر دشوار بنا دیا تھا۔ ناصر الدین ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ قرآن مجید لکھ کر اپنی معاش بہم پہنچاتا تھا اور اُسکی ایک بیوی بغیر اس کے کہ کوئی خادمہ اُس کی مدد کرے کھانا پکایا کرتی تھی، وہ ایک فیاض طبیعت فاضل شخص تھا اور ہمیشہ علماء و حکماء کی صحبت پسند کرتا تھا لیکن ساتویں صدی کے پر آشوب عہد کے لئے وہ یقیناً کسی طرح موزوں نہ تھا جب کہ ہندوستان کو ایک نہایت ہی سخت گیر، جنگجو اور سیاست داں بادشاہ کی ضرورت تھی۔ پھر باوجود ان صفات کے فقدان کے جو کامیابی ناصر الدین کو حاصل ہوئی اُس کی وجہ صرف یہی تھی کہ بلبن اس کا دست راست تھا اور اس نے ساری سلطنت کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا۔

اس نے اپنی آہنی تدبیروں سے قرب و حوار کی لورٹ مار کا سبب باب کیا اور دہلی کے نواح میں جس قدر گاؤں آباد تھے انہیں عسکر سلطانی نے گھس گھس کر قزاقوں کو گرفتار کیا، جنگلوں کو صاف کیا اور تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کی قربانی کر کے ان غارتگروں کی کمین گاہ کو پُر امن قابل زراعت ضلع میں تبدیل کر دیا۔

اس نے تمام ایسے مقامات میں جہاں فتنہ پر دازوں کو فساد پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا، قلعے تعمیر کرائے، چوکیاں قائم کیں

اور اس طرح تمام اُن راستوں کو صاف اور پر امن بنا دیا جو بقول ضیاء ربی، ساٹھ سال سے قزاقوں کا مسکن بنے ہوئے تھے، اور لوگوں کی آمد و رفت وہاں مسدود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام نرمی و آسانی سے نہ ہو سکتا تھا، اس لئے جب بلبن کو کسی ایسے گروہ کا پتہ چلا تو وہ فوراً شیر کی طرح وہاں پہنچ گیا اور شیر ہی کی طرح دشمنوں اور فتنہ برپا کرنے والوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس غرض سے اس نے بہت سے جنگل کٹوا کر سڑکیں بنوا دیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تدبیر اس کی بہت کارگر ہوئی۔

جلال الدین کی صلاحیتیں

جلال الدین فیروز شاہ

۶۸۹-۶۹۵ھ
۱۲۹۰-۱۲۹۵ھ

سلطان جلال الدین بڑا خدا ترس، رحم دل اور خطا پوش بادشاہ تھا اس نے کبھی خونریزی کو روا نہیں رکھا اور بڑے بڑے مجرموں کی خطائیں درگزر کر دیں۔

جب جلال الدین پرانی دہلی گیا اور قصر کے پاس اُترا تو اُس نے نماز شکرانہ ادا کی اور بہ آواز بلند کہا کہ میں کیونکہ خدا کا شکر ادا کر سکتا ہوں کہ جس تخت کے سامنے میں نے برسوں سر جھکا یا ہے اُس پر آج اپنا قدم رکھتا ہوں اس کے بعد وہ کوشک محل میں جو غیاث الدین بلبن کا محل خاص تھا گیا اور وہاں پہنچتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ ملک احمد حبیب نے عرض کیا کہ سواری سے اُترنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ قصر بھی بادشاہ کی ملکیت ہے۔ جلال الدین نے کہا کہ ”یہ میرے آقائے ولی نعمت کا قصر ہے اور مجھ پر تعظیم فرض ہے“ پھر ملک حبیب احمد نے کہا کہ ”بادشاہ کو یہیں سکونت اختیار کرنی چاہئے“ جلال الدین نے جواب دیا کہ ”اس عمارت کو شاہ بلبن نے اپنی سرداری کے عہد میں تعمیر کرایا ہے اس لئے یہ اُس کے ورثاء کی ملکیت ہے میں صرف عارضی مصلحت کی وجہ سے قواعد اسلام کو ترک نہیں کر سکتا۔“ جب کوشک محل کے اندر جلال الدین پہنچا تو وہ اُس جگہ نہیں بیٹھا جہاں شاہ بلبن بیٹھا کرتا تھا بلکہ امراء کی نشست میں جلوس فرما کر حاضرین سے کہا کہ ”ایتم کچن اور ایتم سرخہ کا گھرتباہ ہو کہ انھوں نے میرے مار ڈالنے کا قصد کیا اور میں اپنی جان کے اندیشہ سے اس گناہ کا مرتکب ہوا ورنہ کہاں بادشاہی اور کہاں میں دیکھے مال کار کیا ہوتا ہے اور میری اولاد پر کیا گزرتی ہے۔“

جلال الدین بے انتہا حلیم و کریم تھا جب وہ کسی کو جاگیر دیتا تو کبھی اُس میں تغیر نہ کرتا اور امراء و مقربین سے اگر کوئی جرم سرزد ہوتا تو کبھی اُنھیں ذلیل نہ کرتا۔ وہ امراء کے ساتھ مسامحانہ سلوک کرتا اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ اُن سے ملتا۔

وہ علم دوست بھی اسی درجہ کا تھا۔ حضرت امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، موید جاہر جی، موید دیوانہ، امیر ارسلان کلامی وغیرہ جو اپنے عہد کے بڑے فاضل و کامل لوگ تھے جلال الدین کے ندیم تھے، امیر فاضل، حمید راجہ

جلال الدین

جلال الدین

غزل خوانان دربار میں سے تھے اور محمد شاہ چنگی، فتوح خاں، نصیر خاں اور بھور جو موسیقی کے بے بدل ماہر تھے اس کے مطرب تھے۔ امیر خسرو روز اس کی مجلس میں کوئی نہ کوئی غزل پڑھتے اور شاہانہ انعامات کی بارش اُن پر ہوتی۔ جب جلال الدین عہدہ میر جاداری سے ترقی پا کر عارض مالک کے درجہ پر پہنچا تو اُسی وقت امیر خسرو کو اپنے پاس بلایا اور سفید جامہ و کمربند عنایت کر کے، جو امرائے کبار کے لئے مخصوص تھا، اُن کو مصحف داری کی خدمت سپرد کر دی اور بہت بڑا منصب مقرر کر دیا۔ جب بادشاہ ہوا تو یہ التفات اور زیادہ بڑھ گیا اور دہلی کے شاہی کتب خانہ کا اہتمام امیر خسرو کے سپرد کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم و ہنر کی پوری قدر کرتا تھا اور مردم شناسی کی صحیح قابلیت اپنے اندر رکھتا تھا۔ جلال الدین خود بھی شعر کہتا تھا چنانچہ بدایونی نے اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں:-

آں زلف پریشانت ژد لید نمی خواہم وال روے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم

بے پیر بہت خواہم یک شب بہ کنار آئی ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی خواہم

اسی طرح جب وہ محاصرہ گوالیار میں مصروف تھا تو وہاں اُس نے ایک عمارت مقبرہ طیار کرائی اور یہ رباعی تصنیف کی تاک بطور کتبہ کے وہاں درج کی جائے:-

امیر خسرو کی قدرت شاعری
جلال الدین کی شاعری

۱۔ فرشتہ صفحہ ۹۰۔ تاریخ فیروز شاہی (ایٹ) جلد سوم صفحہ ۱۴۴۔ طبقات اکبری صفحہ ۶۱

۲۔ اس کتاب کا نام منتخب لتواریخ ہے اور اس کا مصنف ملا عبد القادر بدایونی ہے چونکہ بہت سے لوگوں نے منتخب لتواریخ کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اس لئے ملا عبد القادر کی منتخب لتواریخ کو ممتاز کرنے کے لئے صرف تاریخ بدایونی کے نام سے مشہور ہے۔

بدایونی میں عہد غزنوی سے لیکر اکبر کے چالیس سال تک کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ عہد اکبری کی یہ مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے گو اس میں شک نہیں کہ اس نے بہت زیادہ سختی سے تنقید کی ہے۔

ملا عبد القادر ۹۴۷ھ یا ۹۴۹ھ میں بمقام بدایوں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام شیخ ملوک شاہ تھا اور شیخ بچھو منجھلی کا (جو مشہور درویش تھے) مُرد تھا۔ ملوک شاہ کا انتقال ۹۶۹ھ میں ہوا۔

عبد القادر نے مکمل علوم اس وقت کے بڑے بڑے علماء کی خدمت میں جا کر کی اور علاوہ تمام فنون متداولہ کے موسیقی، تاریخ اور علم نجوم میں بھی کافی مہارت پیدا کی۔ جلال خاں قورچی نے اسے دربار اکبری میں پیش کیا اور چالیس سال تک وہ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ رہا۔ بدایونی ہمیشہ ان دونوں بھائیوں سے برہم رہا کیونکہ اس کے نزدیک یہ محمد تھے۔

ملا بدایونی بڑا فاضل شخص تھا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کی فرمائش سے مختلف کتابیں عربی اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیں جن میں معجم البلدان، جامع رشیدی اور راین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس نے فن حدیث میں ایک کتاب بحر الآثار لکھی اور دوسری کتاب خلاق میں نجات الرشید تصنیف کی۔ (بقیہ قسط نوٹ صفحہ ۷۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

مارا کہ قدم بر سر گردوں ساید
از تودہ سنگ و گل چہ تدرافزاید
ایں سنگ شکستہ زان نہادیم درست
باشد کہ دل شکستہ آساید

غیاث الدین بلبن کے بھتیجہ ملک چھو نے ولایت کرٹہ میں سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا اور ایک عظیم لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب یہ خبر شاہ جلال الدین خلجی کو پہونچی تو اُس نے اپنے بیٹے ارکلی خاں کو بہاول بنالکھ آگے روانہ کیا اور خود بارہ کوس کے فاصلہ سے عقب میں روانہ ہوا۔ ارکلی خاں اور چھو کا مقابلا ہوا جس میں چھو کو شکست ہوئی۔ ملک چھو نے امیر علی میر جالدار اور دوسرے باغی امراء کو قید کر کے اُن کی گردن میں دو شاخہ ڈال کر برائٹوں پر سوال کر دیا اور اپنے باپ کے پاس اسی حال میں روانہ کیا۔ جب یہ لوگ بادشاہ کے پاس پہونچے تو اُس نے فوراً اپنی آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور بے اختیار ہو کر چیخ پڑا کہ ”یہ کیا ہے؟ فوراً اُن لوگوں کو اتارو اور حمام میں لے جاؤ“ جب یہ لوگ نہا چکے تو خاص خلعتیں عطا ہوئیں اور دربار میں بلا کر حد درجہ نرمی و محبت سے اُن کے ساتھ پیش آیا۔ اُس کے اس طرز عمل سے یہ لوگ سخت منفعل ہوئے لیکن بادشاہ اس کو بھی گوارا نہ کر سکا اور کہا کہ ”آپ لوگوں نے مجھ سے بغاوت کر کے کوئی نیک حرامی نہیں کی کیونکہ میں تمہارا بادشاہ نہ تھا کہ مجھ سے مخالفت نیک حرامی ہوتی بلکہ تم نے اپنے ولی نعمت کی طرفداری کی اور یہ تمہارا فرض تھا۔“

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۲)

اس نے کچھ حصہ جہا بھارت کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تاریخ کشمیر کا (جسے شاہ آبادی نے اصل ہندی زبان سے ترجمہ کیا تھا) بھی خلاصہ کیا۔ باوجود اس کے کہ ملا عبدالقادر شہنشاہ اکبر کا بہت زیادہ زیر بار احسان تھا اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اکبر سے اس لئے جلتا تھا کہ اس نے مذہب کا خیال ترک کر دیا اور صحیح طریقہ شریعت سے منحرف ہو گیا تھا۔ چونکہ بدایونی کی نفرت اکبر اور اس کے درباریوں سے اسی بناء پر بہت بڑھ گئی تھی اس لئے اس نے عہد اکبری کی تاریخ نہایت تعصب کے ساتھ درج کی ہے اور اکثر جگہ اپنی بیجا نکتہ چینیوں سے اس کو پائے اعتبار سے گرا دیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۵۷۵ء کے ابتداء میں ختم ہو جاتی ہے۔ مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ ”اس تاریخ کے مسودات عہد جہانگیر میں دستیاب ہوئے۔ اور جب ملا عبدالقادر کی اولاد سے پوچھا گیا تو انہوں نے انکار کیا کہ ہم اس سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ جہانگیر اس پر ناخوش ہوا“ افسوس ہے کہ ترک جہانگیری میں اس کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ۱۵۷۵ء یعنی جہانگیر کے دسویں سال جلوس تک اس تاریخ کا کسی کو پتہ نہ تھا، کیونکہ مصنف آثار رحیمی شکایت کرتا ہے کہ سوائے طبقات اکبری اور اکبر نامہ کے اور کوئی تاریخ نظر نہیں آتی۔ ہر چند بدایونی نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی تاریخ صرف تاریخ اکبر شاہی اور طبقات اکبری سے ماخوذ ہے جسے کہ وہ نجات الرشید میں اسے صرف طبقات کا خلاصہ تحریر کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے بہت کچھ اور بھی شامل کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ لب و لہجہ جس سے اس کا تعصب پیدا ہے صرف بدایونی ہی کے دماغ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ طبقات شاہجہانی میں بدایونی کا سنہ وفات ۱۵۷۵ء لکھا ہے۔

۱۵ بدایونی صفحہ ۴۶ — ۵۷ دو شاخہ سے مراد جوا ہے جو بیلوں کے کندھوں پر رکھا جاتا ہے۔

اتفاق سے چند دن بعد چھجھو کو بھی کسی زمیندار نے گرفتار کر کے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی بڑی عزت کی اور ملتان بھیج کر وہاں کے حاکم کو لکھا کہ ”شاہ بلبن کے برادر زادہ کو نہایت دلجوئی سے رکھا جائے اور اس کے لئے تمام سامان عیش و تفریح کا ہتھیار کیا جائے۔“ لوگوں نے کہا بھی کہ دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے، ان کو قتل کر دینا چاہئے۔ لیکن سلطان جلال الدین نے کہا کہ ”میں ضعیف ہو گیا ہوں اور اس وقت تک میں نے کسی کا خون نہیں بہایا اب وقت آخر میں مجھے اس پر مجبور نہ کرو“ اس واقعہ کو ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”خود حضرت امیر خسرو نے اس واقعہ کی روایت اُس سے کی تھی“

خواریزموں سے اصرار

جب سلطان کا رحم و کرم اس حد تک بڑھ گیا تو ایک دن ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر یہ لوگ جمع ہوئے اور نشہ کی حالت میں یہ فیصلہ کیا کہ ”ملک تاج الدین بادشاہ ہونے کے قابل ہے“ ایک نے کہا کہ ”میں اس نیم شکاری (چاقو) سے جلال الدین کا فیصلہ کئے دیتا ہوں۔“ دوسرے نے کہا کہ ”ابھی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔“ بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو طلب کیا اور برہم ہو کر تلوار ان لوگوں کے سامنے ڈال دی اور کہا کہ ”اگر تم میں کوئی مرد ہے تو اسی وقت نکل آئے اور مجھ سے مردانہ فیصلہ کر لے، ورنہ یوں فضول مزخرفات کہنے سے کیا فائدہ ہے۔“ سب لوگ نادم و منفصل کھڑے تھے اور بادشاہ کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ آخر ملک ناصر ”دوات دار“ نے جو بادشاہ کا ندیم تھا اور خود بھی اس سازش کرنے والی جماعت میں شریک تھا عرض کیا کہ ”جہاں پناہ کو معلوم ہے کہ نشہ کی حالت میں انسان کے منہ سے ایسی ہی فضول باتیں نکل جاتی ہیں اور اگر بادشاہ مواخذہ کرے گا تو پھر ہم لوگوں کے لئے مفر کہاں ہے۔“ سلطان جلال الدین کا غصہ اس الحاح سے فرو ہو گیا اور کسی کو تھپوئی تنبیہ بھی نہیں کی۔

زلی و انشتی پسندی

غیاث الدین بلبن کے عہد میں جب جلال الدین نائب سمانہ اور مدہ جادار تھا، تو صوبہ کی منتقلی اس کی حکومت میں تھا۔ اس نے مولانا جلال الدین سے جو شعراء عصر میں سے تھے اور جن کے پاس ایک گاؤں مدد معاش میں بطور جاگیر یا وظیفہ کے تھا، حسب قاعدہ خراج طلب کیا۔ مولانا نے برہم ہو کر جلال الدین کی بچو میں ایک ثمنوی لکھی اور اس کا نام خلیجی نامہ رکھا۔ جب جلال الدین بادشاہ ہوا تو وہ ڈرے اور اپنے گنگے میں رستی ڈال کر گناہگاروں کی طرح دربار میں حاضر ہوئے لیکن سلطان جلال الدین نے نہایت عزت سے ان کی پذیرائی کی اور خلعت فاخرہ اور انعامات سے سرفراز کر کے اس گاؤں کے علاوہ ایک گاؤں اور جاگیر میں دیا۔

غصہ و کرم

اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور واقعہ ہے۔ جس زمانہ میں جلال الدین ٹائپ سمانہ اور منڈاہروں کے دیہات پر تاخت میں مصروف تھا تو ایک منڈاہر نے اس کے چہرہ پر آکر تلوار ماری اور ایسا سخت زخمی کیا کہ جلال الدین ایک سال تک بیمار رہا۔ اور زخم کا نشان آخر عمر تک نہ گیا۔ جب جلال الدین بادشاہ ہوا تو یہ منڈاہر بھی مولانا جلال الدین کی طرح گلے میں رسی ڈال کر دوسری حاضر ہوا۔ سلطان نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ”میں نے اس منڈاہر جیسا کوئی مرد نہیں دیکھا“ اور علاوہ خلعت وغیرہ کے ایک لاکھ جیتل کا فلیٹہ مقرر کیا۔

سلطان جلال الدین نے چونکہ مغلوں کے مقابلہ میں متعدد بار جنگ کی اور کامیابی بھی حاصل کی اس لئے اس کے ذہن میں آیا کہ اُسے مجاہد فی سبیل اللہ کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس لئے اُس نے اپنی بیوی ملکہ جہاں سے کہا کہ: ”جب قضاۃ و علماء اس کے پاس آئیں تو وہ اپنی طرف سے اس کی تحریک کرے“ چنانچہ ملکہ جہاں نے ان لوگوں سے تحریک کی اور سب نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ سلطان کو مجاہد فی سبیل اللہ کہنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے اور جلال الدین کے حضور میں جا کر درخواست پیش کی کہ ”آئندہ سے خطبہ میں سلطان کو مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کرنے کی اجازت دیجائے“ سلطان جلال الدین یہ سن کر کانپ گیا اور ابدیدہ ہو کر کہا کہ ”میں نے ملکہ جہاں کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے اسکی تحریک کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری یہ تمام نبرد آزمائیاں محض دنیاوی غرض اور ہوس جاہ کی بنا پر تھیں اور جہاد مقصود نہ تھا اس لئے میں اس کا اہل نہیں ہوں اور ہرگز اس لقب کو اختیار نہیں کر سکتا۔“

جب سلطان جلال الدین نے ۶۸۹ھ میں جہانیں اور مالوہ فتح کر کے قلعہ رتنپور کا محاصرہ کیا اور تمام مناجاتی وغیرہ اس نصب کرا دیں تو اس کو صرف اس وجہ سے انجام تک نہ پہنچا سکا کہ اس میں زیادہ خونریزی ہوتی اور یہ اُسے پسند نہ تھا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی

$$\frac{۶۹۵}{۶۱۲۹۵} = \frac{۷۱۵}{۶۱۳۱۶} \text{ جنوری ۱۲۹۵ھ}$$

یہ بالکل صحیح ہے کہ علاؤ الدین جاہل و ناشائستہ تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بے انتہا

۱۔ تاریخ فیروز شاہی ۱۴۵۔ طبقات اکبری صفحہ ۶۱۔ فرشتہ صفحہ ۹۲۔ ۲۔ فرشتہ نے اس کو جہان لکھا ہے۔ طبقات اکبری میں جہان درج ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اوچین ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں جہاں اس مقام کا ذکر آیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام رتنپور کے قریب تھا اور اسی کو شہر تو یا نو شہر بھی کہتے تھے۔ ۳۔ فرشتہ صفحہ ۹۲۔ طبقات اکبری ۶۲۔ تاریخ فیروز شاہی ۱۴۶-۱۴۷۔

بیدار مغز اور مستقل ارادہ کا شخص تھا۔ اس نے بیس سال تک حکومت کی اور اس زمانہ میں سلطنتِ دہلی کے حدود دکن تک وسیع ہو گئے۔ بڑے بڑے راجاؤں نے سرطاعت خم کر دیا۔ دولت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سیکڑوں نئی نئی عمارتیں قائم ہو گئیں۔ علماء و فضلاء سرزمینِ دہلی کے ذرہ ذرہ سے پیدا ہونے لگے۔ خانقاہیں آباد ہو گئیں۔ مساجد کی رونق بڑھ گئی، مدارس میں درس و تدریس کا مشغلہ عام ہو گیا۔ بڑے بڑے صاحبانِ دل و اربابِ ذوق رونما ہو گئے۔ دربارِ اساتذہ فن کا مرکز بن گیا۔ ارزانی حیرتناک طریقہ تک بڑھ گئی۔ اور سلطنت ایسی نظر آنے لگی جیسے کسی مشینری میں کوئی نہایت قوی اور بالکل نیا انجن کام کر رہا ہو۔ الغرض یہ تھا نظامِ حکومت اس مسلمان بادشاہ کے عہد کا جس کا شمار حد درجہ کے ظالم لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ یقیناً وہ فضول کی حد تک فیاض و سخی نہ تھا لیکن ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ مناسب وقت پر اس نے کمال بیداری سے دولتِ صرف کر دی اور مصلحت کے مقابلہ میں کبھی طمع کو ترجیح نہیں دی۔

سلطنت کی رونق

جب علاء الدین کٹرہ سے دہلی کی طرف تخت نشین ہونے کے لئے چلا تو اس نے حکم دیا کہ نہایت آزادی کے ساتھ روپیہ تقسیم کیا جائے اس سے مقصود یہ تھا کہ دہلی پہنچتے پہنچتے ایک بڑی جماعتِ تابعین کی اس کے ساتھ شریک ہو جائے چونکہ جلال الدین کے قتل سے لوگوں میں برہمی پیدا ہو گئی تھی اور یہ بھی خیال تھا کہ شاید دہلی میں جنگ کرنی پڑے اس لئے اس نے اس ذریعہ سے لوگوں کو مالوت کرنا چاہا اور ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ کر لی، ضیا بُرنی لکھتا ہے کہ:-
”ہر منزل پر پانچ من زریں ستارے (خضر زرد) ایک سبک سی منجینق میں رکھ کر اڑائے جاتے تھے اور ہزاروں آدمی اُن کے لوٹنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔“

داد و دیگر

سلطان علاء الدین باوجود ایک جابر و خود سر بادشاہ ہونے کے ہمیشہ تمام امور میں اپنے امراء سے مشورہ طلب کرتا تھا اور ایک صائب رائے کے مقابلہ میں اپنے بڑے سے بڑے ارادہ کو ترک کر دیتا تھا۔ جب وہ نشہ کی حالت میں کسی مسئلہ پر گفتگو کرتا تو اس کے امراء و ندیم خوف کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتے۔ ایک دن علاء الملک کو کوئال کے سامنے بھی یہی ذکر ہوا اس نے حد درجہ جرأت سے کام لیکر علاء الدین کو سمجھایا کہ منصبِ نبوت خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور چونکہ اب سلسلہ نبوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے اس لئے یہ خیال قائم کرنا سخت نادانی اور خلافِ انصاف ہے۔ رہا سکندر کی طرح عزمِ جہاں کشائی کرنا، سو اس کے لئے دیکھ لیجئے کہ آپ کے پاس کوئی وزیرِ اوسطا طالیس کی طرح ہے جو

مشاورت فی الامر

علاء الدین، سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں کٹرہ ہنگ پور کا حاکم تھا ۷۹۴ھ یعنی ۱۳۹۲ء میں تخت نشین ہونے کے سال ڈیڑھ سال قبل اسنے مالوہ اور ہندوستان کی شورشوں کو دفع کر کے کوہستان و ندھیا کے دشوار گزار دروں کو طے کیا اور صرف ۷۰۰ آدمیوں کی جمعیت سے دیوگر پہنچا جو مرہٹہ راج کا پایہ تخت تھا اور اس کو فتح کر کے دکن کی طرف بڑھ کر اپنے پور پر قبضہ کیا یہ مسلمانوں کا پہلا قدم تھا جو دکن کی طرف بڑھا ان فتوحات سے علاء الدین نے بے شمار دولت حاصل کر لی تھی جسے وہ اب اپنے قیامِ سلطنت کے لئے بیدار رہنے صرف کر رہا تھا۔

آپ کی غیبت میں انتظام سلطنت کو درہم و برہم نہ ہونے دے۔“ یہ سن کر علاؤ الدین نے کہا کہ پھر اب میں کیا کروں یہ تمام خزانہ و دفائن کس کام میں لائے جائیں۔ علاؤ الملک نے کہا کہ ابھی تو ہندوستان کا سارا جنوبی حصہ تسخیر کے لئے پڑا ہوا ہے، تنجپور، چندیری، چتور، مالوہ، دھار، انہیں فتح کیجئے، تاہم اس کے حدود کا بل کا مستحکم کرنا ضروری ہے تاکہ مغلوں کی طرف سے اطمینان کلی حاصل ہو جائے۔

سلطان علاؤ الدین نے یہ سن کر اپنے خیال سے توبہ کی اور اسی وقت علاؤ الملک کو دس ہزار تنکہ دو آراستہ گھوڑے نہایت قیمتی زریں خلعت۔ طلائی کمر بند جو وزن میں نصف من تھا، اور دو گاؤں انعام میں دئے۔

سلطان علاؤ الدین راست پسندی کے ساتھ اصول سیاست سے بھی کما حقہ واقف تھا اور نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے تمام ذرائع صرف کر دیا کرتا تھا۔ جب وہ قلعہ تنجپور کی تسخیر کے لئے آمادہ ہوا اور وہاں توقع سے زیادہ اسکو دیر لگی تو وہاں میں مسلسل تین چار سازشیں اس کے خلاف ہوئیں۔ سب سے پہلے سیلیان شاہ اکت خاں (برادر زادہ علاؤ الدین) نے سازش کی اور اپنے نزدیک سلطان علاؤ الدین کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد عمرو خاں اور منگو خاں (علاؤ الدین کے ہمیشہ زادگان) نے سلطان کی غیبت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کیا، لیکن یہ بھی گرفتار ہو کر اپنی سزا کو پہنچے۔ پھر آخر میں حاجی نامی ایک شخص نے زیادہ سنگین بغاوت کی۔ یہ امیر الامراء فخر الدین کوٹوال سابق کا غلام تھا اس نے مرہٹی کو خالی پا کر ہنگامہ مچا دیا جو مشکل سے فرو ہو سکا۔ گجرات کے نو مسلموں کی بغاوت اس سے قبل ظاہر ہو چکی تھی۔ الغرض سلطان علاؤ الدین متردد ہوا اور بغاوتوں کے اس سلسلہ کو ختم کر دینے کے لئے اس نے امراء کو جمع کر کے مشورہ طلب کیا۔ ان میں بعض نے کہا کہ بد امنی کے چار اسباب ہوا کرتے ہیں:

- ۱۔ خلق کے نیک موبد سے بادشاہ کا لاعلم رہنا۔

۲۔ شراب کا علانیہ استعمال کیونکہ نشہ کی حالت میں لوگ مافی الضمیر کو آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں اور اس طرح باہم دگر گزشتہ و فساد پر لوگوں میں اتفاق ہو جاتا ہے۔

۳۔ امراء و اعیان کا ایک دوسرے سے تعلق رشتہ داری اور خلوص و محبت کا بڑھ جانا کہ ایک پر اگر آفت آتی ہے تو سب اسکی درد کرتے ہیں۔

۴۔ زرد مال کی کثرت کہ جب بد عمل آدمی دولت مند ہو جاتے ہیں تو ہمیشہ ان میں خیالات فاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔

علاؤ الدین یہ سن کر متنبہ ہوا اور سب سے پہلے اس نے اپنی بخیری دور کرنے کے لئے تمام ملک میں جاسوس مقرر کئے اور خبر سانی کا ایک ایسا مکمل انتظام کیا کہ امراء وغیرہ جو بایں رات کو اپنے گھر کے اندر کرتے تھے وہ صبح کے وقت بادشاہ کو معلوم

علاؤ الدین کی بخیری کا قیام

ہو جاتی تھیں اور جب امیر آتا تو بادشاہ ایک پرچہ لکھ کر اس کو دکھا دیتا کہ رات کو تم نے یہ باتیں کی ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس قدر خائف ہو گئے کہ خلوت و جلوت میں گفتگو کرنا دشوار ہو گیا اور سازش و سرکوشی کا بالکل سد باب ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ملک کے تمام راستوں کو اس قدر محفوظ کر دیا کہ تمام قافلے آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے اور رات کو اپنا اسباب بغیر کسی حفاظت کے یونہی کھلا چھوڑ دیتے تھے، پھر یہ انتظام صرف وہی ہی کے قرب و حوا میں نہ تھا بلکہ کابل و کشمیر سے لیکر بنگال تک، سندھ و گجرات سے لیکر بلنگانہ و معتبر تک ہر جگہ راستوں کے پُر امن ہونے کی یہی کیفیت تھی اور رہزنی و قزاقی بالکل مفقود ہو گئی تھی اگر کوئی سیاح یا مسافر گاؤں میں پہنچتا تو مقدم اور اُس گاؤں کے لوگ، اس کو عزت کے ساتھ ٹھہراتے اور کھانے پینے کا بندوبست کرتے۔

گھروں کی حفاظت

مختاری کا سبب

تعلقات ازدواج کی مخالفت

مختاری کے اصول

دوسرا انتظام شراب خواری کا تھا۔ ہر چند یہ ذرا مشکل کام تھا کیونکہ علاؤ الدین خود اس کا عادی تھا لیکن اس نے اپنی طبیعت پر سخت سیر کیا اور سب سے پہلے اپنے ابدار خانہ کو درہم و برہم کیا۔ جس قدر چینی کے برتن تھے ان کو تڑوا دیا اور طلائی و نقرئی ظروف کو گلو کر دارا الضرب میں بھیج دیا اور تمام ملک میں اعلان کر دیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے اس لئے اب اگر کوئی شراب بنائے گا یا پیئے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔

مردمین کا بیان ہے کہ اس فرمان کے بعد اس قدر شراب کے قراہے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکال نکال کر لٹھائے کر تمام راستوں میں کیچر ہو گئی۔ الغرض جب وہ اس انتظام سے بھی فارغ ہوا۔ تو امراء و اعیان کے لئے ایک فرمان جاری کیا کہ آئندہ سے بلوگم سلطانی آپس میں کوئی رشتہ قائم کریں نہ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔ اس سے تمام امراء کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا اور آپس میں تعلقات رشتہ داری پیدا کرنا مسدود ہو گیا۔

چوتھے سبب کا اس نے یہ انتظام کیا کہ سوائے مخصوص امراء و اعیان کے اور لوگوں کے پاس قبضے گاؤں وقف، انعام، جاگیر یا منصب کی صورت میں پائے جاتے تھے، سب کو ضبط کر کے خالصہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب پر معاش تنگ ہو گئی اور فتنہ و فساد کا خیال دور ہو گیا۔

اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دیہات کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت تک انتظام کی صورت یہ تھی کہ مقدم اور چودھری سے وصولی مانگنا اور یہ کام عام ہو کر تھا اور یہ لوگ رعایا کو سخت تباہ کر رہے تھے چنانچہ سلطان نے یہ پالیسی زمین کے مطابق مالگزاروں کی بسودہ مقرر کی اور حکم دیا کہ نصف پیداوار ہر کسی، استثناء دہلی کے سب سے وصول کر لی جائے۔ علاوہ اس کے مقدموں سے جو وصول ہو وہ خزانہ میں داخل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص خواہ مقدم ہو یا معمول کا شکار۔ چارمیل، دو بھٹیس، دو گائے اور بارہ بکریوں یا بھیڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ پھر چرائی بھی مقرر کی اور آباد گھروں کا کر ایہ بھی معین کیا۔ اگر کوئی مقرر یا عامل بددیانتی کرتا یا ان احکام کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی اور اگر سوائے چارہ کے وہ کوئی اور چیز گاؤں سے حاصل کرتا تو پٹواری کے کاغذات سے دیکھ کر اس کی قیمت وصول کر لی جاتی۔

اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاین عمال و محرر ملازمت سے ہزار ہوں ترک کرنے لگے اور تمام مقدم و چھ دھری جو معزز و امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے بالکل محتاج ہو گئے اور ان کی عورتیں محنت و مزدوری کرنے لگیں۔

جب علاؤ الدین ۱۲۰۲ء میں قلعہ چتور کے محاصرہ میں مصروف تھا تو ماہ اتر میں یہ خبر پہنچی کہ میدان خالی ہے اور مغل قوہیں دہلی کی طرف بڑھنے لگیں۔ علاؤ الدین قلعہ چتور فتح کرنے کے بعد مجبوراً پھر دہلی واپس آیا لیکن چونکہ شاہی افواج کا ایک بڑا حصہ درنگل کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اس لئے یہ بہت تردد ہوا کہ کیا کرے۔ تاہم اس نے فار بندی اور خندقوں سے دہلی کو محفوظ کیا اور اپنی افواج مشترک فراہم کرنا چاہا اتفاق سے دو ماہ محاصرہ کرنے کے بعد مغلوں میں از خود دعوت دہرا اس پیدا ہو گیا اور وہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد علاؤ الدین نے حصار دہلی کو اس قدر تعمیر کرایا کہ ہزار ستوں اور دوسری عمارات طیار کیں لیکن صرف حصار و عمارات بیکار تھیں اس لئے اس نے یہ بھی چاہا کہ عساکر سلطانی کی مقدار و تعداد زیادہ کر دی جائے یہ اس وقت ممکن تھا جب تنخواہیں کم کر دی جائیں ورنہ یوں تو موجودہ خزانہ صرف ۶ سال کے مصارف کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ امرائے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ لشکریوں کی تنخواہ اس وقت کم ہو سکتی ہے جب تمام اشیاء ارزاں ہو جائیں چنانچہ اس کے لئے علاؤ الدین نے چند قواعد مقرر کئے اس کا اثر یہ ہوا کہ غلہ، کپڑا وغیرہ بہت ارزاں ہو گیا اور باوجود اس کے کہ پھر قحط بھی رونما ہوا لیکن ارزانی بدستور باقی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قواعد سلطان علاؤ الدین کی خصوصیات حکومت میں داخل ہیں جس کی طرف اس سے قبل کسی کو توجہ نہیں ہوئی اور نہ اس قدر ارزانی اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی۔ پھر لطف یہ کہ ارزانی عارضی نہ تھی بلکہ علاؤ الدین کے بقیہ ایام حکمرانی تک بدستور باقی رہی۔ اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ وہ ضوابط و قواعد مجملات یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اہل بازار کو نرخ مقرر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ صرف بادشاہ نرخ مقرر کرے گا، چنانچہ تمام مملکت میں حسب تفصیل ذیل نرخ مقرر کیا گیا:۔

ایک من گیہوں	۱/۴	جیتل	ایک سیر شکر تری	۱/۴	جیتل
” جو	۱/۴	”	” شکر سرخ (گڑ)	۱/۴	”
” چاول	۱/۵	”	” سرگھی، مکھن	۱	”
” ماش	۱/۵	”	” سیر و غن کجند	۱	”
” چنا	۱/۵	”	” من نمک	۱/۵	”
” موٹھ	۱/۳	”			

۱۔ عہدِ علانی کا من موجودہ وزن کے لحاظ سے ۱۲ ۱/۴ سیر کا تھا۔ ایک سیر موجودہ ۶ چھٹانک کے برابر اور ایک جیتل تقریباً دو سپ یا ایک دھری کی قیمت کا۔ اس لئے اگر حساب لگایا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ ارزانی اور سکوں کے لحاظ سے عہدِ علانی میں ایک من (یعنی موجودہ ۲۴ سیر) گیہوں کی قیمت ۱۲ (سپ سک) انگریزی) تھی۔

۲۔ ملک قبول الفخ خاں (جو انتظامی معاملات میں نہایت صحیح فراست رکھتا تھا) منڈی کا داروغہ یا شحہ مقرر کیا گیا جس کا کام صرف یہ تھا کہ مقررہ نرخ میں کوئی تفاوت نہ ہونے دے۔

۳۔ دو آب کے تمام خالص دیہات کی مالگداری غلہ کی صورت میں وصول کی جائے اور سلطنت کی طرف سے غلہ کے اشیاء محفوظ رہیں اگر بازار کا غلہ کم ہو جائے تو شاہی غلہ کو بازار کے نرخ سے فروخت کریں۔

۴۔ سلطنت کے تمام سفری غلہ فروشوں (بنجاروں) کو طلب کر کے ساحل جمی پر آباد کیا جائے اور ان سے معاہدہ لیا جائے کہ باہر سے غلہ منگا کر شہر میں مقررہ نرخ سے فروخت کریں گے۔

۵۔ غلہ جمع کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ اگر کوئی شخص غلہ جمع کرتا تو بحق سلطنت قرق کر دیا جاتا اور سخت تہنید کی جاتی، ولایت دو آب کے افسران مال سے اقرار نامہ لیا گیا کہ کوئی شخص ان کے علاقہ میں غلہ جمع نہ کرے۔

۶۔ افسران مال (ریوینو) سے اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ کھیتوں ہی پر بنجاروں سے قیمت دلا کر غلہ دیدیں اور سوائے اپنے ضروری خرچ کے غلہ کا ایک دانہ بھی کوئی کا شتکار گھر نہ لیجائے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بنجاروں کو غلہ آسانی سے ملنے لگا اور بازار میں انحراف ہو گئی۔

۷۔ منڈی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے تین عہدہ دار مقرر کئے ایک شحہ منڈی، دوسرے برید منڈی، تیسرے جاسوس منڈی۔ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بازار کے حال اور منڈی کے نرخ سے روزانہ بادشاہ کو اطلاع دیتا۔ اگر انی اطلاعات میں ذرا بھی تفاوت ہوتا تو شحہ سے سخت باز پرس کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی شخص مقررہ قواعد سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور تمام بازار کا بازار ایک شیش کی طرح چل رہا تھا اور حیرت یہ ہے کہ اس کے زمانہ میں کبھی غلہ کے نرخ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار قحط کے زمانہ میں شحہ نے صرف نصف جیتلی (ایک سو پینس) فی من نرخ بڑھا دیا جس کی درخواست کی تو سلطان نے ۲۱ چوب اس کے ماریں۔

کوئی شخص ایک وقت میں روزانہ خرچ کے علاوہ نصف من سے زیادہ نہیں خرید سکتا تھا۔ اگر قحط کی وجہ سے مساکین کا بھوم زیادہ ہو جاتا اور ان کا کوئی معقول انتظام نہ ہوتا تو شحہ کو سخت سزا دی جاتی۔ شہر کا ہر محلہ ایک بنجارے کے سپرد تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ اس محلہ کے لوگوں کو روزانہ غلہ مہیا کرے۔

۸۔ اسی طرح کپڑے کا نرخ مقرر کیا گیا۔ اعلیٰ درجہ کا سوئی کپڑا بیس گز فی تنگہ (نقرہ) اور درجہ کا سوئی کپڑا تیس گز فی تنگہ (نقرہ) فروخت کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی مناسبت سے اور تمام قسم کے کپڑوں کی قیمت متعین کی گئی۔ اس کے علاوہ اس نے

۹۔ فرشتہ لے لکھا ہے کہ تنگہ نقری ہو یا طلائی ایک تولہ چاندی یا سونے کا ہوتا تھا ہر نقری تنگہ کی قیمت تہا در پچاس جیتلی (تانبہ کا پینس) ہوتی تھی۔ جیتلی کا وزنی البتہ مشتبہ ہے لیکن کہتے ہیں ایک تولہ تانبہ کا ہوتا تھا، بعض پونے دو تولہ کا بتاتے ہیں۔

ایک مکان سرائے عدل کے نام سے تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ یہاں صبح سے ایک نماز پیشین تک دکانیں کھلی رہیں۔
۹۔ سوداگران شہر و اطراف کے نام دفتر میں درج کئے گئے اور ان سے اقرار نامہ لیا گیا کہ اس قدر کپڑا اور اس قسم کا ہر سال لاکر سرائے عدل میں مقررہ نرخ پر فروخت کیا کریں۔

۱۰۔ ملتان والے سوداگروں کو پینس لاکھ تنکہ (نقرہ) خزانہ شاہی سے دیا گیا کہ اطراف ممالک سے کپڑا خرید کر کے لائیں اور نرخ مقررہ سے بازار میں فروخت کریں۔

۱۱۔ امراء وغیرہ میں سے جس کو نفیس اور قیمتی کپڑوں کی ضرورت ہو پہلے رئیس بازار کا پروانہ حاصل کرے۔ یہ قید اسلئے لگائی تھی کہ سوداگر یہاں سے نرخ سلطانی پر بازار کپڑا خرید کر کے باہر گراں قیمت پر فروخت نہ کر سکیں۔

۱۲۔ گھوڑوں کی قیمت ۲۰ تنکہ (نقرہ) سے بارہ تنکہ (نقرہ) تک مقرر کی گئی اور حکم دیا گیا کہ صرف بازار ہی میں نرخ مقررہ کے مطابق گھوڑوں کی خرید و فروخت ہو۔

۱۳۔ لونڈی، غلاموں کی قیمت ۲۰۰ تنکہ (نقرہ) سے ۵ تنکہ نقرہ تک مقرر کی گئی۔

الغرض اس نے گائے، بھینس، بکری اور بازار کی تمام چیزوں یعنی ٹوپی سے موزہ تک، شانہ سے سوزن تک، نیشکر سے سبزی تک، ہر لسیہ سے شوربہ تک، حلوائے صابونی سے ریوڑی تک، بریاتی سے روٹی تک، پان، پھول سے ساگ پات تک، الغرض تمام ضروری اشیاء جسے کہ ایک ندیم خاص کے کہنے پر شاہان بازار ہی تک کا نرخ مقرر کر دیا۔ چنانچہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ:-

”عہد علانی میں مصری بحساب فی سیر دو جبتیل۔ شکر تری فی سیر ایک جبتیل۔ شکر سرخ فی سیر نصف جبتیل۔

نک ۵ سیر فی جبتیل فروخت ہوتا تھا“

۱۴۔ بادشاہ صرف شہر و غیرہ کی اطلاع پر کفایت نہ کرتا بلکہ کس لڑکوں کو جنھیں کوئی وقوف نہ ہوتا دام دے کر بازار بھیجتا اور پھر ان چیزوں کو وزن کراتا۔ اگر وزن یا قیمت میں خلافت قاعدہ کوئی فرق ہوتا تو سخت سزا دی جاتی اور کمترین سزا یہ تھی کہ ناک خنجر کاٹ لئے جاتے یا جس قدر کم اس نے دیا ہے اتنا ہی گوشت اس کی ران یا کولھے سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا جاتا۔
الغرض علاؤ الدین نے مستحکم اور عجیب و غریب انتظام بازار کا کیا کہ اس کی حالت میں پھر کوئی تغیر نہیں ہوا اور کبھی کسی نے قانون مقررہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۵۔ جب علاؤ الدین بازار کا سارا انتظام کر چکا تو اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں حسب ذیل مقرر کیں:-

سپاہی درجہ اول - دو سو چونتیس تنکہ (تقریباً ۲۴ پونڈ طلائی موجودہ انگریزی سکے کے مطابق) ماہوار۔
سپاہی درجہ دوم - ۱۵۶ تنکہ ماہوار - سپاہی درجہ سوم - ۸۷ تنکہ ماہوار۔

لے حسب بیان فرشتہ اس وقت سیر وزن میں ۲۴ تولہ کا ہوتا تھا

جس کے پاس دو گھوڑے ہوتے اس کو ۸ تنگہ اور زیادہ ملتا۔

۱۶۔ جارج ممالک (جسے موجودہ اصطلاح انگریزی میں *Masaka Cavalry* کہہ سکتے ہیں) تمام سپاہ کا معائنہ کرتا اور جو فن تیر اندازی و شمشیر زنی وغیرہ کا ماہر ثابت ہوتا اسے گھوڑے کی قیمت دیدی جاتی اور گھوڑا داغ دیا جاتا۔ جب علاؤ الدین ان تمام انتظامات سے فارغ ہو گیا اور اس نے فوج کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ صرف سواروں کی تعداد چار لاکھ بہتر ہزار ہے۔

اسی عسکری انتظام کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد جب مغلوں نے عہدِ علائی میں ہندوستان کا قصد کیا تو ہمیشہ ان کو شکست ہوئی اور نہایت کثیر تعداد میں مقتول و مقید ہوئے۔

علاؤ الدین پہلے بالکل ناخواندہ شخص تھا اور بعد کو اس نے صرف معمولی نوشت و خواند سیکھ لی تھی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ جتنے ماہران فن، بزرگانِ دین، علماء کرام، شعراء عظام اس کے زمانہ میں ہوئے ہیں کسی عہد کو نصیب نہیں ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین اولیا، شیخ علاؤ الدین صابرنہرہ شیخ فرید الدین گنج شکر، قطب لاولیا، شیخ رکن الدین بن صدر الدین عارف ملتانی۔ اسی عہد کے بزرگوں میں سے تھے۔

علاوہ ان حضرات کے شیخ صدر الدین جو بے مثل فیاض تھے تاج الدین ولد صدر الدین جو اپنی جو دو سخاوت علم و علم کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ سید مغیث الدین و سید نجیب الدین، قاضی جلال الدین، قاضی صدر الدین، مولانا سیاء الدین بیانوی حمید الدین ملتانی جو اپنے کمالات ظاہری و باطنی میں مخصوص درجہ رکھتے تھے اسی بادشاہ کے دربار سے متعلق تھے۔ علماء ظاہری میں اس وقت ۴۴ صرف وہ لوگ تھے جو درس و تدریس کے مشغلہ میں مصروف تھے۔ فنِ قرأت کے جاننے والوں میں مولانا نشاطی، مولانا علاؤ الدین، خواجہ زکی خواجہ زادہ شیخ حسن بصری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اہلِ وعظ میں سے مولانا حسام الدین، مولوی جلال الدین، مولانا شہاب الدین جلیل، مولانا اکرم وہ نفوس تھے جنہیں نوادر روزگار میں جگہ دیجاتی ہے۔

طبقہ شعراء میں صدر الدین عالی، فخر الدین، حمید الدین، مولانا عارف، عبدالحکیم، شہاب الدین جن میں سے ہر ایک شیوہ شاعری میں ایک خاص طرز کا مالک تھا اور ان سب کے سراجِ حضرة امیر خسرو جو جامع کمالات ظاہری و باطنی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں فرو تسلیم کئے جاتے ہیں اسی دربار کے زلہ رہا تھے۔

اطباء میں صدر الدین، جہینئی طبیب، علیم الدین اور مولانا بدر الدین و مشقی خاص لوگ تھے۔ مولانا بدر الدین کی مسیحائی و صداقت کچھ عالم تھا کہ اس وقت تک کوئی دوسرا طبیب اس ذہانت و فراست کا پیدا نہیں ہو سکا ان کی نسبت مشہور ہے کہ اگر چند جانوروں کا قارورہ ایک جگہ ملا دیا جاتا تو یہ بتا دیتے کہ فلاں فلاں جانوروں کا بول اس میں شامل ہے۔

علاوہ ان کے دیگر فنون کے ماہرین، جن میں مثنوی مطرب، اہل نجوم وغیرہ شامل تھے کثرت سے پائے جاتے تھے اور انکا شمار مکمل تھا

علاؤ الدین کی خدمات

عہدِ علائی کے کاہلین

علاؤ الدین کے عہد میں اس قدر مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار اور حصار طیار ہوئے کہ کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ: علاؤ الدین کے شاگرد پیشہ کی تعداد ۷۰ ہزار تھی جن میں سات ہزار صرف معمار، گلکار تھے جو بڑی سی بڑی عمارت کو چند ہفتوں میں طیار کر دیتے تھے۔ تمام سلطنت میں سڑکیں کثرت سے بن گئی تھیں اور نہایت عمدہ حالت میں تھیں۔

بیب سلطان قطب الدین مبارک شاہ (علاؤ الدین کے بیٹے اور جانشین) نے دہلی سے دولت آباد تک کا سفر کیا ہے تو اس وقت کا حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ”دہلی سے دولت آباد (دیوگرھ) تک چالیس دن کا سفر تھا اور ان دونوں شہروں کے درمیان جو سڑک تھی اس کے دونوں جانب بہید وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے ایک مسافر ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا وہ کسی باغ کی روش پر چل رہا ہے۔ ہر میل پر ڈاک کی چوکی تھی اور راستہ میں ہر جگہ اس کو تمام ضرورت کی چیزیں اس قدر فراوانی سے دستیاب ہوتی تھیں گویا بازار لگا ہوا ہے۔

یہاں سے اور سڑکیں ۶ مہینہ کی راہ کی معبر اور تلنگانہ تک بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل پر بادشاہ اور دیگر مسافروں کے قیام کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مفلس مسافروں کو زاد راہ کی مطلق فکر نہیں ہوتی تھی اور ان کو تمام چیزیں مفت ملتی تھیں۔

سب سے پہلے جو شخص ہاتھی پر عمارتی رکھ کر سوار ہوا۔ علاؤ الدین خلجی تھا۔ چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں:-

کے در شاہی وانگہ سواری

جزا و نہاد ہر فیلاں عماری

سلطان علاؤ الدین اپنے عزم و جہد، اپنی سطوت و سیاست کے لحاظ سے تاریخ ہندوستان کا عجیب و غریب

بادشاہ ہوا ہے، اس کے عہد کی چند خصوصیات کو ضیاء برنی نے ایک جگہ حسب ذیل جمع کیا ہے:-

۱۔ غلہ۔ کپڑا اور دیگر اشیاء کی ارزانی

۲۔ مسلسل فتوحات اور دولت کا بیشمار انبار

۳۔ بڑی فوج کا قیام قلیل خرچ سے

۴۔ باغیوں کی سرکوبی اور تمام راجاؤں اور ماتحت فرمانرواؤں کا اطاعت شعار رہنا

۵۔ مغلوں کی تباہی

۶۔ ملک کے تمام راستوں کی حفاظت

۷۔ بازاری لوگوں کا ایماندار ہونا

۸۔ مسجدوں، میناروں، قلعوں، تالابوں وغیرہ کا کثرت سے تعمیر کیا جانا

غیاث الدین تغلق

۶۱۳۲۵ — ۶۱۳۲۰

غیاث الدین تغلق نے عہدِ علانی کے تمام معزول و تباہ شدہ امراء کو طلب کر کے، اُن کے مواجب و انعامات بحال کئے، فائزِ انِ علانی کے بقیۃ السیف افراد کی حد درجہ عزت کی اور خواتینِ خلجیہ کا احترام کرنے میں اس نے اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ الغرض ملک کا نظام حکومت جو بہت ابتر ہو گیا تھا اس کو ایک ہفتہ کے اندر اصلی حالت پر لے آیا۔ مستحقین کے حقوق ادا کئے اور ظالموں کی دار و گیر شروع کی۔

وہ حد درجہ معتدل مزاج تھا اور افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک مناسب رائے تمام امور میں قائم کیا کرتا تھا۔ کام کرنے والے لوگوں کی اس نے قدر کی اور ناکارہ لوگوں کو اپنے دیار سے خارج کر دیا۔

اس نے خراج کے اصول از سر نو منضبط کئے اور پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصہ سے زیادہ محصول لینے کی سخت ممانعت کر دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبہ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم و چودھری کا شتکاران پر جبر نہ کر سکیں جن امراء و ملک کے پاس جاگیریں تھیں ان کی انتظامی حالت کی بھی نگرانی کرتا اور جبر و تعدی پر سخت باز پرس کرتا۔ خسروں و خاں نے جن لوگوں کو خزانہ شاہی سے بیجا انعامات دئے تھے وہ سب وصول کر کے خزانہ میں داخل کئے۔

جب کوئی فتح یا کامیابی کی خبر اس کو ملتی، بیٹا پیدا ہوتا، یا شاہزادوں کی شادی وغیرہ ہوتی تو تمام اکابر و علماء کو طلب کرتا اور حسبِ حیثیت انعامات سے سرفراز کرتا جو مشایخ و صوفیہ خلوت نشین ہوتے اُن کے پاس تحایف و نذرانے دینے بھیجتا۔ چاہتا تھا کہ مسرت مجھے حاصل ہو، اس میں ساری رعایا شریک ہو، چنانچہ وہ سب کو کچھ نہ کچھ دیتا اور اکثر ایسی داد و دہش کے بہانے پیدا کرتا رہتا۔ اس کا مقصد و سلطنت یہ تھا کہ سارا ملک فراغت و اطمینان سے زندگی بسر کرے رعایا خوش حال ہو جائے لوگ گدائی چھوڑ دیں اور حلال کی کمائی حاصل کریں۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے مزدوری و اجرت میں ۲۵ فیصد اضافہ کر دیا۔ کاشتکاروں اور مہندروں کی حالت میں جو تمدنی انحطاط عارضی اسباب کی وجہ سے ہو گیا تھا دور ہو گیا اور پھر وہ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

جس سپاہ کو خسرو و خاں نے مواجب سے زیادہ روپیہ تقسیم کر دیا تھا وہ آہستہ آہستہ اس نے وصول کیا اور فوج کے باب میں جو قواعد علاؤ الدین خلجی نے مقرر کئے تھے رعایہ، امتحان، داغ اور تعین قیمت وغیرہ وہ سب بدستور جاری رکھے البتہ اس کی احتیاط ضروری کی کہ کوئی افسر یا امیر سپاہیوں کو ذلیل نہ سمجھے اور اُن کے گورے نہ مارے۔

انعام و اکرام

وصولی مصلحت میں لگائی

مطالبات کے وصول کرنے میں بھی وہ بہت نرمی سے کام لیتا لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حد درجہ نرمی و آشتی سے کام لیکر معاملات کو طے کرتا۔ وہ نہ معمولی باتوں پر کسی کو حد سے زیادہ انعام دیتا اور نہ ضرورت سے زیادہ سختی عمل میں لاتا۔ میانہ روی اس کی خصوصیت تھی اور عدل و انصاف اس کی حکومت کا تنہا نصب العین۔

انھیں باتوں کے ساتھ اس نے مغلوں کی طرف سے بھی ہندوستان کو مطمئن کر دیا اور ایسی سخت ناکہ بندی کر دی کہ اسکے عہد میں ان کو حد درجہ ہند کی طرف آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ اس نے نہریں کثرت سے کھدوائیں، باغات تعمیر کرائے، ویرانوں کو آباد کیا، بنجر زمین کو تردد سے قابل کاشت کیا اور متعدد عمارات قائم کرا دیں۔ حصار تغلق آباد اس بادشاہ کی یادگار ہے۔

غیاث الدین صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتا اور تراویح کے ساتھ روزہ رکھتا۔ وہ اکثر با وضو رہتا اور شراب نہ خود پیتا اور نہ کسی کو پینے دیتا۔ کبر و غرور اس میں نام کو نہ تھا۔ مکر و فریب سے وہ بالکل نا آشنا تھا اور سادگی اس کی فطری خصوصیت تھی۔

محمد بن تغلق شاہ

۶۲۵ھ — ۶۵۲ھ
۶۱۳۲۵-۶۱۳۵۱

محمد تغلق نہایت شیریں بیان اور فصیح مقرر تھا عربی و فارسی میں فی البدیہہ ایسے مراسلات تحریر کر دیتا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن متحیر ہو جاتے تھے۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی اس کے تمام محاسن و معائب سے اس طرح آگاہ ہو جاتا جیسے کہ برسوں کے تجربہ کا نتیجہ ہو۔ علم تاریخ میں وہ جہارت حاصل تھی کہ مشکل سے اس کے سامنے کسی کو گفتگو کی جرأت ہوتی، حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو ایک بار دیکھ یا سن لیتا پھر وہ نقش کا لچر ہو جاتا۔ حکمت، نجوم، ریاضی و منطق میں تبحر کی کیفیت تھی کہ دقیق ترین مسائل علمیہ بات کی بات میں حل کر دیتا۔ فن شعر میں بھی اس کی جامعیت مشہور ہے اُسے نہ صرف قدام کے کلام پر عبور حاصل تھا بلکہ خود بھی نہایت پاکیزہ شعر کہتا۔ فن طب کا ایسا مجتہدانہ ذوق رکھتا تھا کہ خود مریضوں کا علاج کرتا۔

۱۰ غیاث الدین نے سکونت دہلی ترک کر کے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تغلق آباد آباد کیا اور یہیں قیام رکھا۔ اب بھی یہاں کی شکستہ عمارتیں سیاحوں کے لئے جاذب نظر ہیں ۱۲

فرق کتابت میں ایسا ملکہ اسے حاصل تھا کہ بڑے بڑے خوشنویس اس سے شرا تے تھے۔ مذہب کا حد درجہ احترام کرتا اور فراموشی کے علاوہ نوافل و مستحبات بھی کبھی اس سے ترک نہ ہوتے تھے۔ شراب کو اس نے کبھی منہ نہیں لگایا اور دیگر مشاغل بہو و لعب جو امرا و سلاطین کے ساتھ مخصوص ہیں اس نے کبھی اختیار نہیں کئے بخشش و کرم کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی درویش کو خزانہ بھی اٹھا کر دیدیتا تو یہی سمجھتا کہ میں نے کچھ نہیں دیا۔ ممکن نہیں تھا کہ کسی بہو یا غریب و ضعیف کی فریاد اس تک پہنچ جائے اور وہ اسے ملامت نہ کر دے۔ عراق و خراسان، ماوراءالنہر و ترکستان، روم و عربستان کے علماء و فضلاء ماہرین فنون اس کے دربار میں کھینچے ہوئے پہلے آ رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے زر و جواہر کی بارش ان پر کر رہا تھا۔

تاتار خاں والی سنار گاؤں کو جب اس نے بہرام خاں کا خطاب دیا تو اس کے ساتھ ایک ہی دن میں سو ہاتھی، ہزار گھوڑے اور ایک کروڑ تنکے سرخ (اشرفی) بھی مرجعت فرمایا۔

ملک سنجہ بدخشان کی کو اسی لاکھ تنکے۔ ملک عماد الدین کو ستر لاکھ تنکے اور مولانا ظفر الدین اپنے استاد کو چالیس لاکھ تنکے ایک دن میں اٹھا کر دیدیا۔ اسی طرح مولانا ناصر الدین اور ملک غازی کو جو ایک فاضل شاعر تھا سالانہ لاکھوں تنکے انعام میں دیدیتا۔ پھر اس کے ساتھ جرات و بہادری، علوئے حوصلہ، بختگی عزم، رسوخ تدابیر کو بھی شامل کیجئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ ان صفات کا بادشاہ کیا چیز ہو سکتا ہے اور اس کو کتنا کامیاب ہونا چاہئے۔

صاحب مسالک البصار نے سراج الدین ابوالفتح عمرو (جو اودھ کا رہنے والا اور محمد تغلق کے دربار سے عرصہ تک متعلق رہا تھا) اور شیخ مبارک کی روایت سے مفصل حالات اس عہد کے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کس شوکت و جبروت کا بادشاہ تھا اس کے دربار کا کیا آئین تھا اور اس کے زمانہ میں دہلی اور دیوگیر (دولت آباد) کی رونق کا کیا عالم تھا۔ دولت آباد کا نام اس نے قبۃ الاسلام رکھا تھا اور کثرت سے عمارتیں بنوا کر مخصوص جماعتوں کے قیام کے لئے شہر کو وقف

دولت آباد اور دیوگیر کی کیفیت

۱۔ فرشتہ ۱۳۳۔ طبقات اکبری ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ مسالک البصار فی ممالک لامصار کا مصنف شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی تھا

۲۔ ۶۹۹ھ میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ میں بنگالہ میں بنگالہ کے خانہ بدوشوں کے ہاتھوں سے شہید ہو گیا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا

ہے کہ وہ اور اس کا خاندان سلاطین مصر سے وابستہ تھا اس کا باپ قاضی محی الدین دمشق میں صیغہ راز کا سکریٹری تھا۔ جب وہ یہاں سے علیحدہ

ہو گیا تو اس کے چند دن بعد اسی خدمت پر مصر میں مامور ہو گیا۔ شہاب الدین دونوں جگہ اپنے باپ کا معاون رہا لیکن آخر کار وہ دمشق چلا آیا اور

۳۔ اپنی عمر گزاری۔ شہاب الدین بڑا فاضل شخص تھا اس نے تمام علوم متداولہ میں تبحر حاصل کیا تھا اور بہت سی کتابیں اس نے تصنیف کیں

جو آج بالکل فقود ہیں۔ مسالک البصار میں جلدوں میں تمام کی۔ لیکن اب صرف ۵ جلدیں نظر آتی ہیں، اور وہ بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ شہاب الدین نے عہد محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرائع سے فراہم کر کے لکھے ہیں اور تحقیق و جستجو اس کی تمام تصانیف

کی تصدیق بتاتی جاتی ہے مصنف نہایت القلوب کے بھی اپنی تصنیف میں شہاب الدین کی تصانیف کا حوالہ دیا ہے۔

کر دیا تھا۔ علماء، فقراء، مشائخ، امراء، ملوک، خواتین، فوج، وزراء، تجار، پیشہ ورانگ، انگریز، بھار، عداد وغیرہ کے لئے الگ الگ محلے مقرر کئے اور وہاں ان کے لئے مسجدیں، بازار، حمام، بھٹیاں، اور ضرورت کی تمام عمارتیں قائم کرادیں۔ ہر محلہ کو ایک مستقل قصبہ تھا اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے دوسرے محلہ کا محتاج نہ تھا۔

دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب تھے، اور ہسپتال (دارالشفاء) تھے جن میں غریبوں کا علاج ہوتا تھا۔ ۲۰۰۰ مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا۔ کنوئیں کثرت سے موجود تھے۔

افسران ریاست درجہ بدرجہ خان، ملک، امیر سپہ سالار اور جند کہلاتے تھے اور سواروں کی تعداد نولاکھ تھی جن میں ترک، ایرانی اور ہندوستانی لوگ شامل تھے ان کے گھوڑے عمدہ، درومی نفیس، اور اسلحہ کی حالت بغایت پسندیدہ تھی۔

ایک خان کی ماتحتی میں دس ہزار سوار اور ایک ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار سوار ہوتے تھے۔ امیر سواروں کے دستہ کا

افسر تھا اور سپہ سالار اس سے کم درجہ کا۔ سپہ سالار، بادشاہ کی حضور میں نہیں جاسکتا تھا۔ ان کی تنخواہوں کے عوض میں جاگیریں مقرر تھیں جن میں کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ ہر خان کو دو لاکھ تنگہ (ہر تنگہ آٹھ درم کے برابر) ہر ملک کو پچاس اور ساٹھ ہزار تنگہ کے

درمیان ہر امیر کو تیس اور چالیس ہزار تنگہ کے درمیان اور سپہ سالار میں ہزار تنگہ کی جاگیر اس کے ذاتی مصارف کے لئے

مقرر تھی۔ سپاہیوں اور مملوکوں کی تنخواہ علاوہ خوراک، لباس اور مصارف اس کے ہاتھ تنگہ مقرر تھی، جو خزانہ شاہی

سے نقد ملتی تھی۔

غلاموں کو دس تنگہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی اور چار جوڑے کپڑے ہر سال مرحمت ہوتے۔ اس کے علاوہ ماہوار دو من گندہ

اور چاول اور روزانہ تین سیر گوشت مع ضروری سامان گھی اور مسالہ وغیرہ کے ہر غلام کے لئے مقرر تھا۔

سلطان کا ایک ذاتی کارخانہ کپڑا بننے کا تھا جس میں چار سو آدمی ہر قسم کا ریشمی کپڑا بنا کرتے تھے۔ اس کارخانہ میں جو کپڑے

طیار ہوتے، ان سے خلعت وغیرہ بھی طیار کئے جاتے۔ سلطان ہر سال موسم بہار میں ایک لاکھ اور موسم خزاں میں ایک لاکھ

خلعت تقسیم کرتا۔ موسم بہار کی خلعتیں اسکندریہ کے ریشمی کپڑوں کی ہوتیں اور موسم خزاں کے خلعت دہلی یا چین و عراق کے

کپڑے کی طیار کی جاتیں۔ خلعتیں، خانقاہوں میں مشائخ و علماء وغیرہ کو بھی تقسیم کی جاتی تھیں۔

صرف سلطان کے ذاتی کارخانے زر دوزی اور کارچوب کے ۵۰۰ تھے جن میں خواتین حرم و دیگر معزز خواتین کے لئے

ہر وقت کام ہوتا رہتا تھا۔

سلطان ہر سال دس ہزار عرب گھوڑے نہایت اچھی نسل کے معہ ساز ویرانی کے امراء کو تقسیم کرتا تھا اور معمولی گھوڑوں

کا تو کوئی شمار نہ تھا۔

سلطان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جو خواتین سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کی جاگیر کا رقبہ صوبہ عراق سے کم نہ تھا۔ اسی

طرح ایک وزیر بھی ہوتا تھا وزیر کی ماتحتی میں چار اس کے معاون ہوتے تھے۔ جن کی جاگیر میں ہزار اور چالیس ہزار تنگہ کے

آبادی شہر کے خاص اصول
افسران سلطنت کی تقسیم
خاندان کا خزانہ
سلطان کی وجہ
سلطان کے مالک

درمیان ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے چار دبیر (یا منترشی) بھی ہوتے تھے۔ بعض محروں کی جاگیر بھی تھی اور نقد تنخواہ بھی۔ ایک عہدہ قاضی القضاہ کا بھی ہوتا تھا جسے صدر جہاں اور صدر اسلام بھی کہتے تھے۔ اس کی جاگیر میں دس قصبات ہوتے تھے جن کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ ایک شخص شیخ الاسلام بھی ہوتا تھا اور اس کی جاگیر بھی اسی قدر ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں کا کام مقدمات کی سماعت اور احکام سزا وغیرہ دینا تھا، اور شیخ الاسلام صرف قاضی تھا جو شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کیا کرتا تھا۔ ایک عہدہ محتسب (کوٹوال) کا بھی تھا اس کی تنخواہ ۸۰۰ تنکہ تھی۔ سلطان کے دربار میں ۱۲۰۰ طبیب تھے اور دس ہزار شکاری جو گھوڑوں پر سوار ہو کر ہاتھیوں پر باز اور شاہین بٹھائے ہوئے نکلتے تھے۔ ۳۰۰ ہانکہ کرنے والے بھی نوکرتھے اور علاوہ ان کے تین ہزار ایسے لوگ بھی تھے جو اس شکار کے تمام اور ضروریات کو مہیا کرتے تھے۔

سلطان کے دسترخوان پر ۵۰۰ امراء کھانے میں شریک ہوتے اور ۱۲۰۰ مثنیٰ ہر وقت حاضر رہتے اس میں ان ایک ہزار مغنیوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے قصر شاہی کے اندر رہتے تھے ایک ہزار شاعر بھی دربار سے متعلق تھے جن میں سے بعض عربی بعض فارسی اور بعض ہندی زبان میں شاعری کرتے۔ ان مغنیوں اور شعراء میں بعض کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں اور بعض نقد تنخواہیں بیس ہزار سے ۴۰ ہزار تنکہ تک پاتے تھے۔ انعام و اکرام اس کے علاوہ تھا۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان روزانہ صبح و شام دربار کرتا تھا اور اس کے بعد کھانا ہوتا تھا جس میں بیس ہزار خواتین و ملوک، امراء و اراکین شامل ہوتے تھے خاص بادشاہ کے دسترخوان پر بڑے بڑے علماء (جن کی تعداد ۲۰۰ تھی) بیٹھے تھے اور بادشاہ کھانے کے دوران میں ان سے علمی مباحث پر گفتگو کیا کرتا تھا۔

شیخ ابوبکر بن خلّال کا بیان ہے کہ شاہی مطبخ کے لئے روزانہ ۲۵۰۰ پھل یا گائے اور ۲۰۰ بکریاں ذبح ہوتی تھیں چڑیوں کا تو کوئی شمار نہ تھا۔

فوج اور رعایا کا انتظام نائب سلطان کے سپرد تھا۔ علماء و فقہاء ہندی ہوں یا اجنبی سب کا تعلق صدر جہاں سے تھا۔ اسی طرح مشائخ و فقہاء کا معاملہ شیخ الاسلام کی وساطت سے طے ہوتا تھا۔ سیاحین و سفراء و دیگر اہل کمال دبیروں (سکرٹریوں) سے متعلق تھے۔

جب بادشاہ شکار کو جاتا تو ایک لاکھ سوار اور ۲۰۰۰ تھیں اس کے جلو میں ہوتے۔ لکڑی کے سفری مکان دو دو منزل کے ساتھ ہونے جنھیں دو سو اونٹ کھینچتے۔ خیمے اور قناتیں وغیرہ بھی کثرت سے ساتھ ہوتیں۔

جب بادشاہ ایک مقام سے کسی دوسرے مقام پر کسی غرض سے سفر کرتا تو تیس ہزار سوار ۲۰۰ ہاتھی اور ایک ہزار کوئل گھوڑے جو ہر کار ساز و میراق سے آراستہ ہمراہ ہوتے۔

بادشاہ بہت منکسر مزاج تھا۔ ابوالصفا عمر بن اسحاق کا بیان ہے کہ خود اس نے بادشاہ کو ایک فقیر کے جنازہ کو کاندھا دینے ہوئے دیکھا تھا وہ کلام مجید کا حافظ تھا اور شرع حنفی کی تمام کتابوں پر اس کو پورا عبور تھا۔ وہ علماء کبار سے برابر مسائل علمیہ میں مباحثہ کرتا شعر و شاعری میں حد درجہ پاکیزہ مذاق رکھتا اور فنِ کتابت کا زبردست ماہر تھا۔ شراب کار و راج کہیں نہ تھا۔ بادشاہ کو اس سے سخت نفرت تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص ایک قطرہ شراب اپنے مکان میں رکھ لے۔ پان کار و راج عام تھا اور اس کی ممانعت بھی نہ تھی۔

خبر رسائی کا انتظام بھی سلطان نے نہایت مکمل کیا تھا علاوہ جاسوسوں کے ڈاک کی آمد و روانگی کے لئے ہر کسے بھی مقرر تھے ہر محکمہ میں شاہی جاسوس پھرا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں اپنے افسران کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ دور دراز مقامات کے حالات ڈاک کے ذریعہ سے پہنچتے تھے اس کا انتظام اس طور پر تھا کہ سڑکوں پر چار تیر کی مسافت سے چوکیاں بنی ہوتی تھیں، ہر چوکی پر دس ہرکارے متعین تھے جن کا فرض تھا کہ وہ ڈاک کو ہر ممکن سرعت کے ساتھ اگلی چوکی تک پہنچا دیں اس صورت سے ڈاک ادھر سے ادھر بہت جلد پہنچ جاتی تھی۔ ہر چوکی پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں مسافر قیام کرتے، نمازیں ادا کرتے اور شیریں پانی کے لبریز حوضوں سے اپنی تشنگی رفع کرتے۔ اسی طرح ہر چوکی کے پاس ایک بازار بھی تھا جس میں تمام ضروری اشیاء غذا کی ملتی تھیں اور جانوروں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ دہلی اور دولت آباد کے درمیان ہر چوکی پر ایک نقارہ بھی رکھا رہتا اور کسی خاص امر کے وقوع پر وہ بجایا جاتا اس سے یہ فائدہ تھا کہ بادشاہ دہلی میں ہو یا دولت آباد میں اس کو دوسرے شہر کے تمام واقعات کی اطلاع فوراً ہو جاتی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ڈاک کی انتظامی حالت بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کہ اس وقت ڈاک دو قسم کی تھیں ایک برید الخیل (گھوڑے کی ڈاک) دوسرے برید الرحال (قاصدوں یا ہرکاروں کی ڈاک) ہر میل کے اندر تین چوکیاں ڈاک کی ہوتی ہیں۔ یہاں ہرکارے متعین ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی ہرکارے کے پاس ڈاک پہنچتی ہے وہ فوراً اپنی کمر بستہ اور ایک ہاتھ میں ڈاک اور دوسرے میں گھونگر و دار چاہک لئے ہوئے جسے وہ راستہ بھر بجاتا جاتا ہے، دوسری چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے اسی طرح وہاں کا ہرکارہ آگے لیجاتا ہے۔

اسی ڈاک کے ذریعہ سے خراسان کے میوے، طباقوں کے اندر سر بہر روزانہ بادشاہ کے پاس پہنچتے تھے، اور گنگا کا پانی بھی چالیس دن کے راستہ سے شاہی استعمال کے لئے اسی ذریعہ سے روزانہ پہنچتا تھا۔ جب کوئی اجنبی ہندوستان آتا تو انھیں ہرکاروں کے ذریعہ سے بادشاہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص اس شکل و حالیہ اس صورت و لباس کا فلاں مقام پر آیا ہے اور اس کے متعلق مناسب احکام صادر کئے جاتے۔ خاص خاص قیدی

بھی ڈاک ہی کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہنچائے جاتے تھے۔

طلائی تنکہ کو تنکہ سرخ کہتے تھے جس کا وزن تین مثقال کا تھا۔ نقرئی تنکہ کی قیمت ۸ درہم ہشت کافی تھی اور درہم ہشت کافی کا وہی وزن تھا جو اس وقت مترو شام کے ایک نقرئی درہم کا ہوتا تھا۔

ایک درہم ہشت کافی، چار درہم سلطانی کے برابر سمجھا جاتا تھا جنہیں دو کافی بھی کہتے تھے۔ ایک سکہ نصف درہم سلطانی کا بھی تھا جس کو یکا کافی کہتے تھے اور اس کی قیمت ایک جلیل تھی۔ ایک درہم کا نام دو ازدہ کافی بھی تھا جو ڈیڑھ ہشت کافی کے برابر تھا۔ ایک سکہ شانزدہ کافی بھی تھا جس کی قیمت دو درہم کے برابر تھی۔ کل چھ نقرئی سکے اس وقت رائج تھے۔ شانزدہ کافی دو ازدہ کافی، ہشت کافی، شش کافی، سلطانی اور یکا کافی، درہم سلطانی ۸ فلوس (پیسوں) کے برابر تھا اور جلیل چار فلوس کے برابر۔ درہم ہشت کافی کے ۲۴ فلوس ملتے تھے۔ سیرتر مثقال کا تھا اور ایک من چالیس سیر کا ہوتا تھا۔

ایک من گیسوں ڈیڑھ ہشت کافی میں ملتا تھا، ایک من جو ایک درہم میں، چاول ایک درہم میں ۳ من سڑ اور چنا ایک درہم ہشت کافی میں دو من ملتا تھا۔ گوشت بکری کا ایک درہم سلطانی میں ۶ سیر ملتا تھا۔ بڑی بط دو درہم ہشت کافی میں ملتی تھی اور ایک ہشت کافی کی چار مرغیاں فروخت ہوتی تھیں۔ شکر ایک ایک ہشت کافی میں ۵ سیر ملتی تھی اور نہایت نفیس اور فربہ بھڑ ایک تنکہ میں۔ اسی طرح ایک عمدہ بیل دو تنکہ میں فروخت ہوتا تھا۔

ابن بطوطہ نے جو حالات و بار و غیرہ کے لکھے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں اس لئے مختصر الفاظ میں ان کا اظہار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتا ہے کہ:-

”سلطان نے جو قصر دلی میں تعمیر کرایا ہے اس کا نام دار اسرا ہے اور اس میں متعدد دروازے ہیں پہلے دروازہ پر محافظ فوج کا ایک دستہ ہر وقت متحین رہتا ہے اور نقارے، نفیریں اور قمرنا وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں جو امراء کبار کی آمد پر بجائے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دروازہ کا ہے آخری دروازہ کے بعد قصر ہزار ستون ملتا ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ نقیبوں کے سر پر زریں دستار، کمر میں ٹپکا، ہاتھ میں طلائئی یا نقرئی دستہ کا کوٹار کھنڈا ہوتا ہے۔ نقیب اعظم کے ہاتھ میں سونے کی جریب ہوتی ہے اور سر پر زریں کلاہ جس میں جواہر جگمگاتے رہتے ہیں۔

دربار کی نشست اکثر عصر کے بعد ہوتی ہے۔ ایک چبوترہ پر سفید فرش بچھا کر اس پر شاہی تخت رکھا جاتا ہے جب بادشاہ برآمد ہو کر اپنی نشست پر جاتا ہے تو تمام نقیب اور حاجب باوا بلند بسم اللہ کہتے ہیں اور ملک کبیر چنور لیکر کھڑا ہوتا ہے۔ سلطان کے واسطے اور بائیں جانب سو سو مسلح سپاہی کھڑے ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور شانوں پر

۱۔ یہ تمام حالات سوائے ان بیانات کے جہاں ابن بطوطہ کی صراحت کر دی گئی ہے مسائل لابصار (الایٹ) جلد سوم صفحہ ۵۰۴-۵۰۵ سے نقل ہیں۔
۲۔ قصر ہزار ستون کی وجہ سے یہ کہ اس میں ایک ہزار چوبی ستون لگے ہوئے تھے اس قصر کی چھت بھی لکڑی کی تھی۔

کمانیں ہوتی ہیں تمام امراء درجہ بدرجہ بٹھائے جاتے ہیں۔ یہاں ساٹھ کوئی گھوڑے بھی جو اسہرکار ساز و براق کے ساتھ رہتے ہیں گھوڑوں کے بعد بچاں ہاتھی کھڑے ہوتے ہیں ان کی جھولیں حرمیہ کی ہوتی ہیں، جس پر زردوزی کا کام ہوتا ہے اور ان کے دانتوں پر لوہے کا خول چڑھا رہتا ہے۔ ان ہاتھیوں پر ہودہ ہوتا اور ہودہ پر چار علم بھی ہوتے ہیں۔

عید کی صبح کو ہاتھی آراستہ کئے جاتے ہیں اور ان پر جو اسہرکار زردوزی کی جھولیں ڈالی جاتی ہیں، سولہ ہاتھی بادشاہ کی سواری کے لئے مخصوص ہیں جن پر صبح چھتر ہوتے ہیں، چھتر کی ڈنڈی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ بادشاہ جس ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس کی مستک پر ایک روشن ستارہ جو اسرات کا لگا دیا جاتا ہے، اس ہاتھی کے آگے غلاموں کی قطار ہوتی ہے جن کے سروں پر سونے کی کاخیاں ہوتی ہیں اور کمر میں جو اہر کا پٹکے۔ ان کے آگے ۳۰۰ نقیب ہوتے ہیں جو سر سے پاؤں تک نہ وجوہ سے لدے رہتے۔ ان کے آگے امراء ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پھر فوج اور ماہی مراتب عید گاہ کے دروازہ پر پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے اور جب تمام علماء و امراء اندر چلے جاتے ہیں تو پھر خود ہاتھی سے اتر کر اندر جاتا اور نماز سے فارغ ہو کر اونٹ کی قربانی کرتا ہے۔

عید کے دربار میں حد درجہ تزک و احتشام سے کام لیا جاتا، جس کا بیان ابن بطوطہ نے نہایت تفصیل سے کیا ہے لیکن ہم اس کا ذکر یہاں نہیں کرتے بیان ماسبق سے اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب بادشاہ کسی سفر سے واپس آتا تو ہاتھی آراستہ کئے جاتے اور آبا ہاتھیوں پر جو اسہرکار ہودے رکھے جاتے ہر ایک کی مستک پر ایک ستارہ لگایا جاتا جس میں موتی و الماس ٹنکے ہوتے۔ علاوہ ان کے کئی کئی منزل کے چوبی تہ بنائے جاتے اور ان پر ریشمی کپڑا لپیٹ دیا جاتا۔ ان قبوں کی ہر منزل میں خوبصورت کمیزیں پر تکلف لباس اور قیمتی زیور پہنے ہوئے نغمہ و رقص میں مصروف نظر آتیں۔ راستہ میں تمام ریشمی فرش ہوتا اور اس پر سے سلطانی کی سواری گزرتی۔ شہر کے دروازہ سے نیکر قصر کے دروازہ تک راستے آراستہ کئے جاتے اور ان پر بھی ریشمی فرش کیا جاتا۔ بادشاہ کے آگے ہزار غلام ہوتے اور پیچھے فوج کے دستے۔ بادشاہ جس وقت شہر کے اندر داخل ہوتا تو دینار و درم کی بارش ہونے لگتی تھی، غریب و غنیس بوٹتے تھے اور سلطان اسی حال میں قصر کے اندر داخل ہو جاتا۔

طریق طعام یہ تھا کہ جب مطلع سے کھانا چلتا تو نقیب باواز بلند سم آواز دیتے ہوئے آگے ہوتے جب کھانا بادشاہ کے قریب پہنچ جاتا تو سوائے بادشاہ کے سب کھڑے ہو جاتے اور کھانا فرش پر چٹا جاتا اس کے بعد نقیب اعظم، بادشاہ کی زوجہ و تعریف کرتا اور تمام نقیب بادشاہ کو عجب الکے ہٹ جاتے پھر بادشاہ کے سامنے تمام حاضرین کی فہرست پڑھی جاتی اور اس کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ صدر و ستر فحول پر فقہاء و علماء و محدثین و مشائخ ہوتے اس کے بعد بادشاہ کے اقارب و امراء کبھ اور پھر تمام آدمی اپنی اپنی معین جگہ پر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد شراب و درسونے چاندی کے بوتلیں لائے ہوئے آتے جن میں مصری کا شربت ہوتا، پہلے یہ پی لیا جاتا اس کے بعد کھانا شروع کیا جاتا۔ فراغ طعام کے بعد جو اور مہینہ کا افترہ پینے کو

دیا جاتا اور پھر ریشمی تاکہ سے بندھی ہوئی پان کی گوریوں تقسیم ہوتیں۔

سلطان عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھا کہ وہ اپنے وجود کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا تھا۔ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کر ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ یہ گیا اور قاضی کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اس وقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہو گیا۔

ان تمام بیانات سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق اپنی صفات کے لحاظ سے ایک بے مثل حکمران تھا، عزم و استقلال، سطوت و جبروت، بذل و کرم، زہد و اتقاء، شجاعت و بسالت، اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ خود تمام امور کا انتظام کرتا، قوانین نافذ کرتا اور خود اپنے کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا، خود میدان جنگ میں فوج کے ساتھ جاتا اور دشمن کا مقابلہ کرتا لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ کامیاب بادشاہ ثابت نہ ہوا اور تمام صوبے اس کے آخر عہد میں خود مختار ہو گئے۔

سلطان فیروز شاہ

۵۲۰ھ — ۹۰ھ
۱۳۵۱ء — ۱۳۸۸ء

فیروز شاہ نے اپنے عہد میں بہت سے انتظامات کئے اور قوانین رائج میں متعدد اصلاحیں کیں لیکن ان میں سے کوئی اصلاح ایسی نہ تھی جس کی بنیاد رحم و انصاف پر نہ ہو۔

چنانچہ وہ خود فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ:-

(۱) مجھ سے قبل بہت سے ناجایز اور نامشروع ٹیکس قائم تھے۔ میں نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ صرف شرع کے مطابق خراج وصول کیا جائے یعنی زمین مزرعہ کی پیداوار کا دسواں حصہ، معدنی پیداوار کا ایک خمس، اور مسلمانوں کی صدقہ و زکوٰۃ کی رقم خزانہ میں داخل ہونی چاہئے۔

اصلاحات فیروز شاہی خود اسکے بیان کے مطابق

۱۔ اسی بطور (تاریخ ہندوستان مولوی ذکار اللہ) ۱۳۷-۱۵۶

۲۔ ان کی فہرست بھی فیروز شاہ نے دی ہے جن میں سے خاص خاص ٹیکس کے نام یہ تھے:- گل فروشی، دلالی بازاری، بنگلی فلد، ہی فروشی، صابون گری، رسیان فروشی، روغن گری، خود برائی، تہ بازاری، قمار خانہ، کوتوالی، چرائی۔

(۲) میرے عہد سے پہلے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا باقی خزانہ میں داخل ہوتا تھا میں نے اسکو بھی موقوف کیا کیونکہ حکم شرعی اسکے بالکل خلاف تھا، چنانچہ میں نے ہمیشہ خزانہ میں مال غنیمت کا ایک تہمس داخل کیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کر دیا۔

(۳) شرع کے خلاف مسلمانوں میں عام طور سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ ان کی عورتیں شہر کے باہر مزاروں پر جاتی تھیں، چاکر اور باشاہ کو بد معاشی کا زیادہ موقع ملتا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ آئندہ جو عورت مزاروں پر جائے گی اس کو سخت سزا دی جائیگی۔ چنانچہ یہ دستور بالکل موقوف ہو گیا۔

(۴) مجھ سے قبل یہ دستور تھا کہ شاہی دسترخوان پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور تلواروں کے قبضے وغیرہ زرو جو اہر سے مرصع ہوتے تھے میں نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ ہتھیاروں میں صرف ہڈیوں کے دستے لگائے جائیں اور ظروف نقرئی و طلائی کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے۔

(۵) امراء زریں لباس پہنا کرتے تھے اور زین، لگام، گلوبند، صراحی، خیمے، پردے، کرسیاں اور تمام چیزیں تصویروں سے آراستہ کی جاتی تھیں، میں نے ان ناجائز نقش و نگار کو محو کر کے آئندہ کے لئے ممانعت کر دی۔

(۶) ریشمیں و زربفت کے لباس کا بھی امراء میں عام رواج تھا۔ میں نے اس کی بھی ممانعت کی اور شریعت کے مطابق ایک انگلی سے زیادہ عریض ریشمی کپڑے کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

(۷) میرے مرنے اور آقا سلطان محمد تغلق کے عہد میں جو لوگ قتل ہوئے ان کے وارثوں کو اور جو مفلوج الاعضاء تھے خود انھیں بلا کر اتنی بخشش کی کہ انھوں نے رضا مندی کا اظہار کر کے اقرار نامے لکھ دئے کہ ہم کو اب سلطان محمد تغلق پر کوئی دعوئے نہیں ہے میں نے یہ سارے اقرار نامے ایک صندوق میں بند کر کے محمد تغلق کی قبر کے سرہانے رکھ دئے اس امید کے ساتھ کہ خدا میرے آقا کے ساتھ نہر باقی فرمائے گا۔

(۸) مجھ سے قبل جو وظائف اور دیہات معافی وغیرہ کے ضبط ہو گئے تھے ان کے متعلق میں نے عام حکم دیدیا کہ از روئے سند جس کا حق ثابت ہو اس کے حق میں تمام وظائف وغیرہ بحال کر دئے جائیں۔

سراج عقیق نے فیروز شاہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً فیروز نہایت اچھے صفات کا بادشاہ تھا اور محمد تغلق کے بعد ہندوستان کو ایسا فرمانروا مل جانا ایک ایسا عہد تھا جس نے تمام جراحات کو مندل کر دیا۔ فیروز شاہی عہد میں جو انتظامات ہوئے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) بازار نفیس اور عمدہ اسباب تجارت سے معمور ہو گئے۔ (۲) مزدوروں کو پوری اجرت ملنے لگی اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔ (۳) پیشہ ور لوگ نہایت اطمینان سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے اور شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ (۴) ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے۔ (۵) رعایا کے پاس غلہ اور تمام ضروری سامان زندگی مہیا ہو گیا اور تمام

سلطنت میں امن و سکون و مسرت و خوشحالی نظر آنے لگی۔ ہر چنانچہ ان ٹیکسوں کے موقوف کردینے سے سلطنت کی آمدنی کم ہوگئی لیکن اس کے عوض مخلوق خدا کو جو راحت و آسانی حاصل ہوئی وہ کافی سے زیادہ معاوضہ اس کی کمی کا تھا جس پر فیروز شاہ قانع تھا۔

سلطنت کے امراء و اہلکین افسران و معززین علاؤ الدین خلجی سے پہلے جاگیریں رکھتے تھے اور وہی ان کی خدمات کا معاوضہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن علاؤ الدین خلجی نے اس دستور کو مٹا کر نقد تنخواہیں کر دی تھیں اور تمام جاگیریں وغیرہ خالصہ میں شامل کر لی تھیں۔ اس کے بعد بھی یہی دستور جاری رہا۔ لیکن جب فیروز شاہ نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی فطری فیاضی اور نرمی سے مجبور ہو کر جاگیریں پھر بحال کر دیں اور کامل چالیس سال تک اس کے عہد سلطنت میں اس قاعدہ کی پابندی کی گئی اور کسی جاگیردار یا معافی دار کی طرف سے اظہار سرکشی و بغاوت نہیں ہوا جس کے خوف سے علاؤ الدین خلجی نے جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔

فوجی ملازمین کے لئے اس نے ایک قانونی اور بنایا وہ یہ تھا کہ کوئی افسر مر جائے یا ضعیف ہو جائے تو اس کے بیٹے کو جگہ دی جائے اگر بیٹا نہ ہو تو داماد کو، اگر یہ بھی نہ ہو تو غلام کو اور اس کے بعد اور کسی قریبی رشتہ دار کو۔ جب تک فیروز شاہ زندہ رہا اس قانون پر اس نے عمل کیا اور اس طرح فوجی خدمات کی طرف لوگوں کو بہت زیادہ توجہ ہو گئی۔

فیروز شاہ کو چونکہ غلاموں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا اس لئے تھوڑے دنوں میں تحائف اور نذرانوں کی صورت سے اس قدر کثیر تعداد میں غلام جمع ہو گئے کہ سلطان کو مستقلاً ان کا انتظام کرنا پڑا۔ بہت سے غلام تو اس نے مختلف اقطاع میں بھیج دیے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ جو غلام شہر میں رہ گئے ان کا مشاہرہ ۱۰۰ تنگہ سے دس تنگہ تک حسب حیثیت مقرر کیا۔ علاوہ اس کے ہر غلام کو اس کی میلان طبیعت کے موافق تعلیم بھی دلائی، کسی کو حافظ بنایا اور کسی کو فقیہ کسی کو حدیث کا درس دلایا اور کسی کو علم کلام کا، کسی کو خوشنویسی کی تعلیم دلائی اور کسی کو سپاہ گری کی سب سے اعلیٰ طرح دوسرے پیشوں اور حرفوں کی طرف ان کو راغب کیا۔ چنانچہ ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں میں بارہ ہزار غلام صرف وہ تھے جو مختلف پیشوں

سے جاگیردار لوگ و امراء کی خوش حالی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ رئیس بنا ہوا تھا اور باغات، قصبات، دیہات اور پرگنوں کی آمدنی سے بڑے بڑے کارخانے لگے ہاں جاری تھے رعایا سے لیکر جاگیردار تک، امیر سے لیکر غریب تک، کاشتکار سے لیکر مقدم اور کھساکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ خوش اور نہایت بے فکری سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

اس کے بعد جب ملک عماد الملک دیوان عرض ضعیف ہو گیا تو اس کا بیٹا ملک سلق اس کی جگہ کام کرتے لگا کہ ایک دن اسحاق نے بادشاہ سے کہا کہ سپاہ میں بعض آدمی بہت ضعیف ہو گئے ہیں ان کی جگہ دوسرے جو ان آدمی بھرتی کرنا چاہئے بادشاہ نے کہا یہ رائے مناسب ہے لیکن پہلے مجھے تمہارا بیٹا کو علیحدہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی بہت ضعیف ہے، یہ سنکر اسحاق خاموش ہو گیا۔ اسے فیروز شاہ کے عہد میں اسی نوے ہزار سوار شاہی سپاہ میں تھے

اور صنعتوں کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے غلاموں کا محکمہ ہی جدا کر دیا تھا اور اس محکمہ کے دیوانی، خزانچی، محاسب، وزیر الگ کر دیے تھے جن امراء کو غلام دئے جاتے تھے ان کو سخت تاکید کی جاتی تھی کہ اپنے بچوں کی طرح انکی پرورش کریں اور تعلیم و تربیت کی خاص نگہبانی رکھیں۔

زراعت و آبادی کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ دو آبے کے ۵۲ پرگنے تھے اور تمام پرگنوں میں ایک گاؤں بھی غیر آباد نہ تھا اور ایک چڑی میں کاشت سے خالی نہ تھی، صوبہ سامانہ میں بھی ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے تھے اور تمام رعایا خوش حال نظر آتی تھی۔ ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ خاص دہلی میں (جہاں پایہ تخت تھا اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے غلہ کو قدرتا گراں ہونا چاہئے) ایک من گہیوں ۸ جبتیل میں، ایک من مجوار اور جوہم جبتیل میں عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ایک سوار اپنے گھوڑے کے لئے دس ہیر دلا ہوا غلہ جسے سراج عقیف نے دلیہ یعنی ”دلیہ“ سے تعبیر کیا ہے ایک جبتیل میں خرید لیتا تھا۔ کھئی ڈھائی جبتیل کا ایک سیر اور شکر ۳ یا ۳ ۱/۲ جبتیل کی ایک سیر ملتی تھی۔ اگر کبھی امساک باراں ہوتا تو ایک تنکہ فی من سے زیادہ کبھی نرخ نہ بڑھتا، چالیس سال تک فیروز شاہ نے حکومت کی اور اس زمانہ میں قحط عام یا گرائی کی شکایت کسی کو نہیں ہوئی۔ کپڑے کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کے عہد میں صرف دو آبے کی آمدنی ۸ لاکھ تنکہ اور کل سلطنت کی ۶ کروڑ ۸ لاکھ تنکہ تھی لیکن یہ سب خزانہ شاہی میں نہ

آتی تھی بلکہ مختلف امراء و اراکین، لوگ و وزراء، ملازمین مال و فوج پر جاگیروں کی صورت میں منقسم تھی۔ خان جہاں وزیر کی ذات خاص کا تیرہ لاکھ تنکہ مقرر تھا۔ اسی طرح کسی کی جاگیر آٹھ لاکھ کی تھی، کسی کی ۶ لاکھ کی، کسی کی ۴ لاکھ تنکہ کی۔ چنانچہ امراء کی دولت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جب ملک شاہین شہزادہ جو مجلس خاص کا نائب امیر بھی ہوا وہ قیمتی گھوڑوں اور جواہرات کے پچاس لاکھ تنکہ نقد اس کے گھر سے نکلا تھا۔ اسی طرح عماد الملک کی دولت کا کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے رومیہ رکھنے کے لئے جو تھیلیاں سلوائی تھیں ان میں ڈھائی ہزار تنکہ صرف ہو گیا تھا۔ (حالانکہ اسوقت ایک ٹاٹ کا تھیلہ چار جبتیل میں آتا تھا) کہا جاتا ہے کہ سترہ کروڑ تنکہ نقد اس کے پاس موجود تھا۔ پھر یہ دولت و خوشحالی مخصوص افراد کا حصہ نہ تھی بلکہ تمام امراء و اراکین ملازمین و متوسطین یہاں تک کہ کاشتکار اور مزدور بھی ایک دوسرے سے مستغنی نظر آتے تھے اور حد درجہ راحت و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ علماء و مشائخ کے لئے ۶۰ لاکھ تنکہ اور سائیں و فقراء کے لئے ایک لاکھ تنکہ بطور وظایف کے تقسیم کیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ کے لئے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں بیکار پھرے اور تکلیف سے زندگی بسر کرے۔ چنانچہ اس نے ایک عام حکم دیدیا تھا کہ جب کوئی بیکار آدمی نظر آئے تو کو تو ال اہل محلہ سے اس کے حالات تحقیق کر کے بادشاہ کے روبرو پیش کرے۔ پھر بادشاہ ہر بیکار کو اسکی حیثیت مشاغل بتا دیتا۔ کسی کو کارخانہ میں بھیج دیتا کسی کو وزیر کے پاس

لے گئی اور شکر کا نرخ سراج عقیف نے نہیں لکھا بلکہ مارکویس ٹینکیر نے اپنی تحقیق سے لکھا ہے جسے ایڈورڈ ٹامس نے اپنی کتاب کرائنگس آف دی پٹھان کنگس میں درج کیا ہے۔

بھیجتا اگر کوئی کسی جاگیردار کے پاس رہنا چاہتا تو وہاں بھیج دیا جاتا۔ ان لوگوں کے رہنے کے لئے مکان ملتے اور انکی معاش کا پورا انتظام کیا جاتا۔

بادشاہ نے ۳۶ کارخانے قائم کر رکھے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں معمولی اور غیر معمولی۔ معمولی قسم میں قیل خانہ یا پائے گاہ (اصطبل) مطنخ، شترخانہ، سگ خانہ، آبدارخانہ وغیرہ شامل تھے ان کا خرچ ماہوار ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکے تھا اور اس قدر صرف ملازمین وغیرہ کے مشاہرہ کا تھا۔

غیر معمولی قسم میں جامدارخانہ، علم خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ وغیرہ داخل تھے ان کارخانوں کے لئے ہر سال بنیادیں خریدی جاتی۔ جامدارخانہ کے لئے موسم سرما میں (بہار و گرمی کی خریداری علیحدہ تھی) ۶ لاکھ تنکے کا، علم خانہ کے لئے ہر سال ۸۰ ہزار تنکے کا اور فراش خانہ کے لئے ہر سال دو لاکھ تنکے کا اسباب خریدا جاتا۔ ہر کارخانہ ایک امیر کے سپرد تھا اور سب کا حساب جداگانہ مرتب کیا جاتا تمام کارخانوں کی نگرانی خواجہ ابوالحسن کے ذمہ تھی

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ کو بھی سکوں کی طرف بہت توجہ تھی اس نے بڑی احتیاط کی کہ سکے عمدہ اور خالص طیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکے علاوہ طلائی اور نقرئی تنکے کے جو پہلے سے رائج تھے۔ چھل و ہشت گانی، بست و پنج گانی (یہ سکے خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہار گانی، دوازہ گانی، دہ گانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ انکی قیمتیں علی الترتیب ۸، ۴، ۲ سے لیکر ۱ جیتل تک تھیں۔

ایک بار بادشاہ کو خیال آیا کہ خرید و فروخت کے وقت ایک جیتل سے کم کا حساب ہوتا ہوگا تو بچنے والا کیونکر فاضل رقم واپس دے کرے گا، جبکہ جیتل سے کم کوئی سکے نہیں ہے، چنانچہ اس نے دو سکے اور رائج کے ایک نصف جیتل کا جسے آدھ کہتے تھے اور دوسرا پانچ جیتل کا جس کا نام بیکہ رکھا گیا۔

ایک دفعہ بادشاہ کو دو آدمیوں نے خبر دی کہ شش گانی سکے میں کچھ خفیف سی کھوٹ ہے اور بازار میں اس کا پڑچا ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے وزراء کو حکم دیا کہ اس کی کامل تحقیقات کی جائے۔ یہ واقعہ ۷۲۷ھ کا ہے۔ خان جہاں زندہ تھا جب اس کو بھی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ سکے کی حالت ناگذاڑ کی کی سی ہے کہ اگر اس کی عصمت پر جھوٹا الزام بھی لگ جائے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے اگر علانیہ تحقیقات کی گئی اور کھوٹ ثابت ہو گیا تو شاہی سکے کا اعتبار اٹھ جائے گا، اس لئے پہلے خفیہ یا پنج مناسب ہے اس وقت کہ شاہ ٹکسال کا ہتھم تھا۔ اس سے خان جہاں دونوں مخبروں کو حراست میں لیکر کہا کہ کیا تم اپنی طور پر تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کی اور خان جہاں سے کہا کہ واقعی ٹکسال کے بعض شریر

بے جیتل سے کم قیمت سکے، غلوس (پیسے) کہلاتے تھے لیکن کوئی سکے جیتل کی قسم کا اس سے کم قیمت نہ تھا، اس نے چاندی اور تانبہ لاکر نہایت چھوٹے چھوٹے سکے اور پانچ جیتل کی قیمت کے اور رائج کئے۔ سہ غالباً اس لفظ کی حقیقت ”بھیک“ رہی ہوگی یعنی وہ سکے جو گداگروں کو بھیک میں آسانی سے دیا جاسکے

آرمیوں نے سکے میں کچھ کھوٹ ملا دی ہے۔ خان جہاں یہ سن کر خاموش ہو گیا اور پھر کچھ سوچ کر حکم دیا کہ سناروں کو بلا کر بادشاہ کے سامنے اس طور سے جانچ کر آئی جاوے کہ وہ سکے کے کھرے ہونے کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ کبر شاہ نے سناروں سے حالات بیان کئے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ بادشاہ کے سامنے بغیر کسی سامان کے برہنہ طلب کئے جائیں لیکن تھوڑی سی چاندی کسی کوئلہ کے اندر رکھ کر سوراخ یا شگات کو مون سے بند کر دیا جائے۔ جب ہم سکے نکلائیں گے تو اس کوئلہ کو بھی اس میں ڈال دیں گے اور اسکی چاندی سکے کی چاندی سے ملکر وزن کو پورا کر دے گی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مجمع عام میں بادشاہ کے سامنے سکے کی جانچ کی گئی۔ چونکہ اس ترکیب سے کسی کو کھوٹ کا پتہ نہ چلا اور سکے کا وزن صحیح نکلا اس لئے بازاروں میں عام اعلانی کر دیا گیا کہ جانچ سے ششگانی بالکل کھرا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ کبر شاہ کو خلعت دیا گیا اور مخبروں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن بعد خان جہاں نے کسی اور بہانے سے کبر شاہ کو علیحدہ کر دیا۔

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں کس قابلیت کا وزیر تھا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ معاملات سلطنت میں فیروز شاہ کیسا امین اور متدین تھا۔

جب بادشاہ نے بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد شہر حصار فیروزہ کی بنیاد ڈالی (جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے) تو اس نے اس نواح کی زمین کو (جس میں فتح آباد اور حصار فیروزہ دونوں داخل تھے) بہت آباد کیا اور نہریں جاری کر کے تمام قصبات و دیہات (جس میں ہالنسی، جنید اور دہاترہ بھی شامل تھے) کی پیداوار کو بہت بڑھایا۔ بادشاہ کو آبادی اٹاک کا اس قدر خیال تھا کہ بارش کے زمانہ میں وہ خاص خاص سرداروں کو متعین کرتا کہ نہروں کے کنارے پھر کر دیکھیں کہ سیلاب کہاں تک پہنچتا ہے اور وہ بہت محوش ہوتا جب اسے معلوم ہوتا کہ کاشتکار نہروں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فیروز شاہ کے یہی انتظامات تھے جنھوں نے نہ صرف اس کی جاگیر بلکہ سارے ملک کو آباد و خوش حال بنا دیا تھا۔ فیروز شاہ کے عہد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی تعمیرات ہیں جنھوں نے ایک طرف ملک کو پر رونق بنانے میں مدد دی تو دوسری طرف رفاه عام میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ اس کو تعمیرات کا غیر معمولی شوق تھا اور آثار قدیمہ کی طرف توجہ کرنے میں اولیت کا فخر اسی بادشاہ کو حاصل ہے۔

۱۔ ان اضلاع میں تقریباً ۱۰۰ کو سو تک نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی تھی اور کوئی حصہ زمین زراعت سے خالی نہ تھا۔

۲۔ اس سے مراد غالباً وہی بنید ہے جہاں آج کل ایک سکھ خانہ ان فرما رہا ہے۔

۳۔ فیروز شاہ کے عہد میں ملک غازی شہنہ، میر تعمیرات تھا جو اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا اس کا شاہ ایک شخص عبد الحق تھا جسے جاہر سونہ ہار بھی کہتے تھے چوب تراشوں، سنگ سازوں، آہنگروں، وغیرہ کی جماعتیں الگ الگ تھیں اور ہر ایک جماعت پر ایک شخصہ یا داروغہ مقرر تھا۔

جب کوئی عمارت زیر تعمیر ہوتی تو دیوان وزارت کے سامنے نقشہ پیش کیا جاتا اور وہ اسکو دیکھنے کے بعد خزانہ سے ضروری رقم پیش کر کے پیشکش کو دیتا۔

تعمیرات بلات و محلات نصیب یافتہ حضرات یا قریب و نزدیکان اور اہل اہل کار و جہاں آبادی کے لیے کیا

علاوہ فتح آباد و فیروزہ حصار کے اس نے سب تفصیل ذیل اور نئے شہر تعمیر کئے:-

فیروز آباد۔ فیروز آباد ہارنی کھیترا، تغلق پور کا سنہ، تغلق پور ایک کھوت اور جو پور، اس نے محلات بھی کثرت سے تعمیر کرائے جس میں فیروز کوشک، نزول کوشک، مہندواری، کوشک حصار فیروزہ، کوشک فتح آباد، کوشک جو پور، کوشک شکار (جسے اب فیروز شاہ کا کوٹکہ کہتے ہیں) اور جو دلی سے نظام الدین جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے، کوشک بند فتح خاں، کوشک سامورہ، خاص شہرت رکھتے تھے۔

۱۔ جب فیروز شاہ سندھ سے دہلی کی طرف عنان حکومت ہاتھ میں لینے کی غرض سے چلا اور سرتی سے گزر کر منزل الہ آباد میں پہنچا تو وہاں اسکے لڑکاپیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور وہیں اس مسرت کی یادگار میں ایک شہر فتح آباد کے نام سے تعمیر کرایا۔

۲۔ جب بادشاہ، بنگال کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی آیا اور انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے اسی سلسلہ میں حصار فیروزہ کی بھی تعمیر کی جہاں حصار طیار کیا گیا وہاں پہلے ایک گاؤں (لہر اس بزرگ) آباد تھا پانی یہاں تقریباً معدوم تھا اور عراق و خراسان کی طرف سے جب مسافر یہاں آکر ٹھہرتے تھے تو انھیں ایک گھڑے پانی کے لئے چار چار صتیل ادا کرنا پڑتا تھا۔ فیروز شاہ نے اس جگہ کو پسند کیا اور حصار کی تعمیر شروع کرادی۔ تمام ملوک امراء کو خدمتیں تقسیم کر دیں اور چند سال میں یہ حصار (جو پھر اور چونے سے بنایا گیا ہے) مکمل ہو گیا اور اس کا نام حصار فیروزہ کہا اس کے بعد چاروں طرف خندق کھدوائی اور اس کی مٹی سے حصار کے گرد دوسرے بنوایا۔ حصار کے اندر ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کرایا۔ جس کے پانی سے خنوق بھی ہر وقت بہرہ ریز رہا کرتی تھی یہیں اس نے ایک بہت بڑا قصر بھیل بھلیاں کی طرح تعمیر کرایا اور متعدد دیگر محل بنوائے۔ پہلے صدر مقام تحصیل مالکذاری کے لئے ہاشمی مقرر تھا لیکن جب یہ شہر مکمل ہو گیا تو صدر مقام اس نواح کا حصار فیروزہ کر دیا گیا۔

۳۔ فیروز آباد کی تعمیر دہلی سے پانچ کوس کے فاصلہ پر شروع ہوئی اور تقریباً ۱۰ دیہات کی زمین اس میں داخل کر لی گئی خاص خاص دیہات کے نام یہ تھے: امر پت، سرانے، ابو بکر طوسی، کھیتواڑہ، جہرور (غالبا موجودہ جہرولی یا قطب صاحب) مقبرہ رضیہ سلطان کی زمین بھی اس شہر کے اندر آگئی تھی۔

اس شہر میں اس کثرت سے عمارتیں بنوائی گئیں کہ انر پت سے لیکر کوشک شکار رھے اب کوٹہ فیروز شاہ کہتے ہیں) تک ۱۰ کوس میں ایک چر زمین بھی ایسی نہ تھی جہاں کوئی نہ کوئی عمارت نہ ہو۔ تمام مکانات پختہ اور وسیع تھے۔ ۸ مسجدیں صرف نماز جمعہ کے لئے تھیں وسیع بنوائیں کہ ہر مسجد میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ یہ مسجدیں امراء نے تعمیر کرائی تھیں جو انھیں کے نام سے موسوم کی گئیں دکھا جاتا ہے کہ دہلی کی موجودہ کالی مسجد اور مسجد ترکمان دھوا انھیں مسجدوں میں سے ہیں) جب تک فیروز شاہ زندہ رہا، دہلی اور فیروز آباد کے درمیان کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور ہر وقت اس پانچ کوس کے اندر میلا سا لگا رہتا تھا۔ صبح نماز کے وقت سے ادلت، گھوڑے، خچر، گاڑیاں، چمکڑے، بالکلیاں، طیار رہتی تھیں اور لوگ دہلی سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دہلی تک آیا جایا کرتے تھے۔ گاڑی کا گرایہ چار صتیل، اونٹ کا ۶ صتیل، گھوڑے کا بارہ صتیل، پالکی کا نصف تنگ تھا۔

۴۔ جب فیروز شاہ دوبارہ لکھنوتی کی مہم پر گیا اور قنوج و اوڈھ ہوتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں اب جو پور ہے تو یہاں اسے مناسب جگہ دیکھ کر ایک شہر آباد کرنا چاہا پانچ اس نے ساحل گومتی پر ۱۰ ماہ کے اندر ایک شہر تعمیر کرایا اور اپنے آقا و برادر عم زاد سلطان محمد تغلق کے نام پر (جسے جو نال خاں بھی کہتے تھے) اس کا نام جو ناپور رکھا جو بعد کو کثرت استعمال سے جو پور ہو گیا۔ یہ شہر بعد میں مشرقی سلطنت کا پایہ تخت ہو گیا جس کا حال آپ آئندہ معلوم کریں گے۔

اس نے پانی کے بند بھی کثرت سے بنوائے۔ ان میں ”بند فتح خاں“ ”بند بالچا“ ”بند مہیا پور“ ”بند شکر خاں“ ”بند سالورہ“ اور ”بند وزیر آباد“ بہت مشہور ہیں اور چھوٹے چھوٹے بندوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔

دہلی اور فیروز آباد میں اس نے ایک سو بیس خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کرائیں یہ ہمیشہ مسافروں سے بھری رہتیں اور بادشاہ کی طرف سے سب کو کھانا وغیرہ دیا جاتا تمام مصارف خزانہ شاہی سے نقد دئے جاتے تھے اور ایک امیر ان کا متولی تھا۔

فیروز آباد میں اس نے اپنے دربار کے لئے تین محل تیار کئے تھے ایک کا نام ”محل صحن گلی“ اس کو محل انگریزی کہتے تھے۔ دوسرے کا نام ”محل چھبہ چوبیس“ تھا اور تیسرے کو ”محل بارعام“ کہتے تھے (صحن مہانگی اس کا دوسرا نام تھا) پہلے محل میں صرف خوانین، ملوک، امراء اور خاص خاص اہل قلم سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوسرا محل گویا خلعتگاہ تھا اور نہایت ہی مخصوص امراء کے ساتھ وہاں نشست ہوتی تھی، تیسرا محل عام دربار کے لئے تھا۔

فیروز شاہ کو باغوں کا بھی بہت شوق تھا، دہلی کے قریب اس نے بارہ سو باغات نصب کرائے اور علاؤ الدین کے زمانہ کے تیس باغات کو بھی از سر نو آباد کر کے بہت ترقی دی۔ اسی طرح سلورہ کے قریب اس نے ۸۰ باغ طیار کرائے اور چتر میں چوالیس تمام باغوں میں علاوہ اور میوہ دار اور پھلوں کے صرف انگریزات قسم کے پیدا ہوتے تھے اور بحساب فی سیر ایک جہتیل فروخت کئے جاتے تھے۔ اٹنی ہزار تنہ صرف ان پھلوں کی آمدنی تھی۔ جب حصار فیروزہ میں نہر کا پانی آنے لگا تو یہاں بھی کثرت سے باغات نصب کرائے۔

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں جو رفاہ عام سے متعلق ہیں سب بڑا اور اہم کام نہروں کا اجراء تھا۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حصار فیروزہ جس جگہ بنایا گیا تھا وہاں پانی کی بہت تنگائی تھی اس لئے اس نے، مصیبت دور کرنے کے لئے اور نیز مزارعین کو فائدہ پہنچانے کے لئے دو نہریں بنوائیں۔ ایک نہر اس نے دریائے جموں سے نکالی جس کا نام اس نے رحیرا (رجیواہ) رکھا اور دوسری نہر دریائے ستلج سے جس کا نام الف خانی تھا۔ یہ دونوں نہریں کرنال کے قریب ہو کر گزرتی تھیں اور ۸۰ کوس کے بعد دونوں ملکر شہر فیروزہ حصار میں پہنچتی تھیں۔

لے فیروز شاہ نے دہلی کا قیام ترک کر دیا تھا اور فیروز آباد ہی میں رہا کرتا تھا۔ جب دربار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان محلات میں آتا تھا۔ دربار میں تمام امراء کی جائے نشست مقرر تھی۔ خان جہاں وزیر تخت سے متصل داہنی جانب بیٹھتا تھا اور سراج عقیف (مصنف تاریخ فیروز شاہی) بھی کبھی کبھی دربار میں شریک ہوتا تھا۔ سہ قبل اجراء نہر فیروزہ حصار میں ہوجہ قنات آب صرف خریف کی فصل ہوتی تھی اور وہ بھی ناقص لیکن جب نہر جاری ہو گئی تو ربیع و خریف دونوں فصلیں نہایت اچھی ہونے لگیں۔ ان نہروں سے ہزاروں بیگہ زمین کی آبپاشی ہوتی تھی اور وہ وسیع رقبہ جو نہروں کے قرب و جوار میں تھا چند دن کے بعد درجہ زرخیز اور آباد نظر آنے لگا۔ سہ اصل عبارت سراج عقیف کی یہ ہے: ”یک جوئے از لب آب جون کشیدہ“ جوئے دوم از وہان لب آب ستلج آوردہ از لب آب جون چنانچہ رجیواہ جوئے الف خانی وہاں ایس ہر دو جوئے از اتصال کرنال بیرون آوردہ میان ہشتاد و کردہ کردہ در شہر حصار فیروزہ بردہ۔“

نہر جیواہ جس کا اوپر ذکر ہوا اب بھی موجود ہے اور پورے ۲۰۰ میل کے رقبہ زمین میں اس وقت بھی آبپاشی ہوتی ہے
اسی طرح نہر ستلج اب بھی روپر اور سرمنہد کے درمیان موجود ہے۔

۱۸۳۳ء میں کرنل کالون نے نہر جیواہ کے متعلق تحقیق کی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ اس نہر کی تعمیر اس جگہ سے شروع
کی گئی تھی جہاں سے جتنا نکلی ہے (اب اس مقام کا نام بادشاہ محل ہے) اور چچرولی، بورہ، ہوتی ہونی کرناں تک آئی تھی اور
یہاں سنیدولی کے قریب دریائے چٹانگ کی مشرقی شاخ سے مل کر ہانسی اور حصار تک چلی گئی تھی۔

اس نہر کا ثبوت عہد اکبری کی ایک سند (۱۵۹۷ء) سے بھی ملتا ہے جس کے شروع میں لکھا ہے کہ ”دریائے چٹانگ سے
۲۱۰ سال ہوئے سلطان فیروز شاہ نے نہر نکالی تھی۔ نالوں وغیرہ کا پانی بہتا ہوا سادھورہ کے قریب ہانسی، حصار کی پہاڑی
کے دامن میں پہنچتا ہے۔“

علاوہ ان نہروں کے فیروز شاہ نے اور بھی متعدد نہریں جاری کی تھیں جن میں سے ایک کا ذکر تیمور نے اپنی ملفوظات
میں قلعہ دہلی کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”قلعہ کوئی دریائے جتنا اور ہندوؤں کے درمیان واقع ہے۔
ہندوؤں حقیقتاً ایک بڑی نہر ہے جسے فیروز شاہ نے دریائے کالی ندی سے نکال کر فیروز آباد کے محاذ میں جتنا سے ملا دیا تھا۔
ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کو عمارات اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف بہت توجہ تھی اور اس نے
کثرت سے اس قسم کی عمارتیں بنوائیں جن سے پہلک کو فائدہ پہنچے۔“

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا خیال سب سے پہلے سلطنت ہند میں فیروز شاہ کو پیدا ہوا اور اس خیال کے ماتحت جن جن
عمارتوں کی اس نے مرمت کرائی ان کا ذکر خود اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۔ ”پرانی عمارتیں جو خراب و
ویران ہو گئی تھیں میں نے ان کی مرمت کرائی اور ان کی آبادی کو میں نے اپنے محلات میں تعمیر پر مقدم جانا۔ چنانچہ:-

- (۱) دہلی کی جامع مسجد جو سلطان معز الدین سام نے تعمیر کرائی تھی اور کھنگی کے سبب سے خراب ہو گئی تھی میں نے اس کو بالکل
نیا کر دیا۔ (۲) سلطان معز الدین سام کے مقبرہ کی مغربی دیوار بوسیدہ ہو گئی تھی میں نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور نقشِ محراب
صندل کی لگوادیں۔ سلطان معز الدین کا مینار بھی بجلی سے گر پڑا تھا میں نے اس کو پہلے سے بھی زیادہ بلند بنوا دیا۔
- (۳) حوضِ شمسی (سلطانِ آفتاب کے حوض) میں بعض شہریر آدمیوں نے پانی آنے کی راہیں بند کر دی تھیں، میں نے ان لوگوں

۱۔ دریائے چٹانگ، ہندوؤں کے تبرک دریاؤں میں سے شمار ہوتا ہے

۲۔ اس نہر سے بعد کو سترھویں صدی عیسوی میں علی مردان خاں نے ایک شاخ دہلی کے اندر پہنچائی۔

۳۔ سادھورہ ضلع انبالہ کا ایک قصبہ جو جتنا سے ۲۰ میل جنوب مغرب واقع ہے۔ اس کے قریب مرکزِ اندی بہتی ہے لیکن چٹانگ دریا
کے چشمے بھی اس سے آٹھ میل کے فاصل پر پائے جاتے ہیں۔

کو سزا دی اور پاتی کے منبع پھر جاری کر دیئے۔ اسی طرح حوض علانی (سلطان علاء الدین کا حوض) مٹی سے بھر گیا تھا۔ اور وہاں کھیتی ہونے لگی تھی میں نے اس کو بھی صاف کرایا۔ (۴) سلطان لقمش کا مدرسہ (جو لقمش کے مقبرہ سے ملحق تھا) بالکل خراب ہو گیا تھا میں نے اُسے بھی از سر نو بنایا اور صندل کے دروازے اس میں لگوا دیئے جو ستون گر گئے تھے ان کو پہلے سے زیادہ اچھا بنوایا، مقبرہ کا صحن مدور نہ تھا میں نے اُسے مدور کرایا۔ چاروں برجوں کا پشتہ گر گیا تھا وہ بھی میں نے وسیع کر دیا۔ (۵) سلطان شمس الدین کے بیٹے معز الدین سام کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل کھنڈر ہو گیا تھا اور قبر کا کہیں نشان نہ تھا میں نے از سر نو برج کی تعمیر کرائی۔ اور احاطہ کی دیوار کچھو کچھو قبر کا چبوترا بنوا دیا۔ (۶) سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان رکن الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل خراب ہو گیا تھا میں نے اس کی دیوار احاطہ کھنچوائی اور نیا گنبد بنوا کر ایک خانقاہ بھی دیپہ تعمیر کرا دی۔ (۷) سلطان علاء الدین کے مقبرہ کی مرمت کرائی اور صندلی دروازے اس میں لگوا دیئے آبدار خانہ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد تھی اس کی مغربی دیوار بنوائی اور چوپڑ کا فرش طیار کرایا۔ (۸) سلطان قطب الدین کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کے بیٹوں، خضر خاں، شادی خاں، فرید خاں، سلطان شہاب الدین، سکندر خاں، محمد خاں، عثمان اور اس کے پوتوں اور پرپوتوں کے مقبروں کی مرمت کرائی اور از سر نو تعمیر کرایا۔ (۹) شیخ الاسلام نظام الدین (اولیا) کے مقبرہ کے دروازہ اور قبر کی صندلی جا لیاں خراب ہو گئی تھیں ان کی مرمت کرائی اور چاروں محرابوں میں سونے کے جھاڑ طلائی زنجیروں سے آویزاں کر دیئے ایک مجلس خانہ بھی بنوا دیا جو اس سے قبل نہیں تھا۔ (۱۰) سلطان علاء الدین کے وزیر اعظم تاج الملک کا فوری کی قبر ہموار ہو گئی تھی اور گنبد گر پڑا تھا میں نے اس کی بھی از سر نو تعمیر کرائی۔ (۱۱) دارالامان (یہ بڑے بڑے آدمیوں کے دفن ہونے کی جگہ تھی) میں تھے دروازے صندل کے لگوائے اور مشہور آدمیوں کی قبروں کے خلاف اور پردے بنوائے۔ (۱۲) سلطان محمد تغلق نے ”جہاں پناہ“ کی بنیاد ڈالی تھی میں نے اُسے مکمل کر دیا کیونکہ سلطان محمد تغلق میرا مربی اور استاد تھا۔ (۱۳) دہلی میں اگلے بادشاہ شاہوں نے جتلی قلعے اور حصار بنوائے تھے ان سب کی میں نے مرمت کرائی۔ (۱۴) ان مدرسوں و مقبروں کی تعمیر کا خرچ ان کی قدیم املاک و اوقاف کی آمدنی سے کیا گیا۔ بعض عمارتیں ایسی بھی تھیں جن کے فرش، روشنی اور مسافریں و زائرین کی جہاں نوازی کے لئے کوئی آمدنی نہ تھی، میں نے ان کے لئے دیہات وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی سے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ (۱۵) نامور سلاطین اور اولیاء کے مقابر کے لئے دیہات وقف تھے میں نے ان کو بدستور قائم رکھا اور بعض جدید مقابر و مزارات کے لئے بھی زمین وقف کر دی۔ (۱۶) میں نے دارالشفار بھی تعمیر کرایا۔ اس میں

۱۷ اس وقت مزارات اولیاء کے ساتھ مجلس خانوں کی تعمیر کا عام رواج تھا شیخ صلاح الدین (عہد محمد تغلق کے مشہور بزرگ) کا مقبرہ جو موضع کھڑکی میں بنایا گیا تھا اس میں بھی مجلس خانہ شامل تھا۔ (آثار قدیمہ دہلی اسٹیشن)

۱۸ سلطان محمد تغلق نے قلعہ علانی سے قلعہ رائے پتھور تک (جو سلطان جلال الدین فیروز غلجی کے وقت پرانی دہلی کے نام سے مشہور تھا) دو دیواریں شہر پناہ کے انداز پر بنائی تھیں ایک سران دیواروں کا قلعہ علانی یا قلعہ سیری سے ملا دیا تھا اور دوسرا قلعہ رائے پتھور سے اور اس کا نام ”جہاں پناہ“ رکھا تھا (آثار قدیمہ دہلی)

ادنے والے تمام طبقوں کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اطباء حاذق تشخیص امراض و معالجہ کے لئے مقرر ہیں اور غذا و دوا وغیرہ سب جایز و موقوفہ کی آمدنی سے مہیا کی جاتی ہے۔

فیروز شاہ نے جو مدارس قائم کئے تھے ان میں سے ایک فتح خاں کے مقبرہ کے پاس تھا جسے ”قدم شریف“ کہتے ہیں۔ اسی کیسٹھا ایک مسجد بھی تھی اور ایک حوض بھی۔ فتح خاں، فیروز شاہ کا بہت محبوب فرزند تھا اور یہ مدرسہ مع مسجد کے اسی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا۔

دوسرا مشہور مدرسہ فیروز آباد میں تھا جو ”فیروز شاہی مدرسہ“ کے نام سے مشہور تھا۔ ضیاء برنی نے لکھا ہے کہ ”یہ مدرسہ بہ لحاظ عمارت و تعلیم اپنی نظیر نہ رکھتا تھا“

اس مدرسہ کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس کے گنبد بڑے شاندار تھے۔ یہ مدرسہ ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع تھا ہر وقت سیکڑوں طلبہ اور کثیر علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے تھے اور سارا باغ ان کے لئے وقف تھا۔ یہاں ان کی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، عبادت و تفریح کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی کے ساتھ تالاب کے کنارے باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے صیقل کئے ہوئے فرش پر اپنے مشاغل علمیہ میں منہمک نظر آتے تھے۔

اس مدرسہ سے متعلق ایک جہان خانہ بھی تھا جہاں سیاح آکر قیام کرتے تھے اور مسجد مدرسہ کے ساتھ ایک لشکر خانہ یا خیرات خانہ بھی تھا جس سے تمام غریب اور مساکین کو امداد ملتی تھی۔

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں سے سب سے زیادہ اہم اور موجودہ تہذیب کے نقطہ نظر سے بے انتہا قابل قدر کام یہ ہے کہ اس نے قدیم عہد کے دو سنگین مینار میرٹھ اور خضر آباد کے قریب سے اکھڑا کر کوشک شکار میں نصب کرائے یہ دونوں مینار ۲۰ سال قبل مسیح کے ہیں۔ جن پر پالی حروف میں اسو کا (بدھ مذہب کے بہت بڑے مبلغ) کے احکام مذہبی منقوش ہیں جب یہ دونوں مینار دہلی پہنچے تو فیروز شاہ نے تمام پنڈتوں کو جمع کیا لیکن کوئی منقوش عبارت کو نہ پڑھ سکا۔

۱۔ قدم شریف موجودہ دہلی کے ”لاہوری دروازہ“ سے ڈیڑھ میل جانب جنوب واقع ہے۔

۲۔ مسٹر اسٹیفن نے دہلی کے آثار قدیمہ پر ریویو کرتے ہوئے ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ ”۱۳۵۳ھ میں فیروز شاہ نے ایک مدرسہ، حوض علانی کے قریب تعمیر کرایا تھا اب یہ عمارت مدرسہ شکستہ حالت میں ہے اور گاؤں کے لوگ وہاں رہتے ہیں اس مدرسہ کے متولی سید محمد سفت بن جمال نے ۱۳۸۸ھ میں انتقال کیا۔“ یقیناً یہ مدرسہ ”مدرسہ فیروز شاہی“ سے علاحدہ تھا کیونکہ حوض علانی کسی باغ کے اندر نہ تھا اور ”فیروز شاہی مدرسہ“ کا باغ کے اندر پایا جانا ثابت ہے۔ حوض علانی اب بھی موجود ہے اور اس کے مشرقی جانب متعدد عمارتیں ہیں انہیں میں مقبرہ فیروز شاہ کی عمارت بھی (معاذ اللہ) مسجد و مدرسہ کے پائی جاتی ہے۔ ۳۔ تاریخ فیروز شاہ برنی۔ ۴۔ اب مسٹر جمیس پرنسپ نے جو آثار قدیمہ کے مشہور ماہر ہیں ان کتبوں کو پڑھ لیا ہے ان میں بودھ مذہب کی کچھ ہدایات درج ہیں اور خاص خاص مذہبی اصول بتائے گئے ہیں۔

ہر چند یہ دونوں مینار ہندو یا بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فیروز شاہ نے بے انتہا کاوش و سعی محنت و صرف سے ان دونوں میناروں کو اپنی دار الحکومت میں منتقل کرایا۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا فطری ذوق رکھتا تھا اس مسئلہ میں بھی وہ مذہبی تعصب سے کام نہ لیتا تھا۔ بالکل ممکن تھا کہ وہ ان دونوں میناروں کو مسمار کر کے تباہ کر دیتا یا یہ کہ وہ انکی حفاظت نہ کرتا اور وہ خود ٹوٹ کر پامال و معدوم ہو جاتے لیکن فیروز شاہ نے ایسا نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ احسان ایسا معمولی نہیں ہے جسے آثار قدیمہ اور بودھ مذہب فراموش کر سکے۔

اس قدر بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ فیروز شاہ کو عمارات کا بڑا شوق تھا۔ ہمارے پاس کوئی مکمل فہرست ان تمام

لے ٹھٹھ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد فیروز شاہ نے دوران سیر و شکار میں خضر آباد کے قریب (جو دہلی سے ۹۰ کوس کے فاصل پر واقع ہے) ایک گاؤں (توبرہ) میں ایک سنگین منار پہاڑی پر نصب دیکھا اور ارادہ کیا کہ اسے دہلی لے جائے چنانچہ اس نے قرب و جوار کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور فوج کو بھی طلب کیا اس کے بعد اس نے سیل روئی منگو کر مینار کے گرد لپیٹی، زمین پر چاروں طرف موٹے موٹے ٹیکے اس روئی کے زمین پر بچھو اور اُسے اوپر پھر زمین کھدوا کر مینار کو اس نرم جگہ پر ٹاڈا۔ اس کی بنیاد کے نیچے ایک بڑا چوکور پتھر تھا اسے بھی کھود کر نکالا۔ خیر یہاں تک تو کوئی ایسا دشوار کام نہ تھا، لیکن بڑی دقت اس مینار کو دہلی تک لیجانے میں تھی، بادشاہ نے اس غرض کے لئے ایک چھکڑا ۲۲ پھیول کا طیارہ کرایا اور ہر پھیوے کے دھڑے میں مضبوط رستے بندھوائے اور ہر رستے پر ۲۰ آدمی کھینچنے والے متعین کئے۔ اس طرح وہ ساحل جمنا تک لایا گیا یہاں بڑی بڑی کشتیاں (جن میں سات سات ہزار من غلہ لاد جاتا تھا) مہیا کی گئیں اور ان پر یہ مینار نہایت احتیاط سے بار کر کے فیروز آباد تک لایا گیا۔ بادشاہ خود اس اہتمام کے وقت موجود تھا، یہاں جامع مسجد کے قریب پتھر چرنے کی ایک عمارت پایہ دار بنائی گئی جب ایک پایہ بن جاتا تو مینار اس پر چڑھایا جاتا پھر دوسرا پایہ بن جاتا تو اس پر رکھا جاتا اس صورت سے وہ اوپر تک پہنچا یا گیا۔ اس کو سیدھا کرنے میں بڑی محنت صرف کی گئی اس کے سرے میں رستا بانڈھا گیا اور رستے کا دوسرا سرا چرخ میں بانڈھ کر اس کو گھمایا گیا۔ جب مینار آدھ گز بلند ہو جاتا تو اسکے نیچے سیل روئی کے ٹیکے رکھے جاتے اور وہ بلند کیا جاتا اسی طرح جب وہ سیدھا عمود کی طرح کھڑا ہو گیا تو بنیاد میں پہلے دہی چوکور پتھر رکھا گیا اور اسکے بعد وہ مینار نصب کیا گیا۔ مینار کے گود سنگ مرمر اور عباسی کا کام کیا گیا چوٹی پر سونے کا کلس لگایا گیا (اس لئے اس کو مینار زرین کہتے تھے) اب بھی یہ مینار دہلی میں کوشک فیروز شاہ کے اندر (جسے کوٹک کہتے ہیں) موجود ہے۔ سراج عقیف نے لکھا ہے کہ اس کا طول ۳۲ گز تھا (۸ گز زمین کے اندر اور ۲۴ گز باہر) مگر اب اس کا طول ۲۴ فٹ، ۷ انچ ہے جس میں سے چار فٹ ایک انچ زمین کے اندر ہے۔

دوسرا مینار میرٹھ میں تھا لیکن یہ کچھ چھوٹا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی نہایت احتیاط سے منتقل کر کے کوشک شکار میں نصب کیا۔ جب وقت یہ مینار نصب ہو گیا تو بادشاہ نے بڑا جشن کیا اور پہلک کو عام اجازت اسکے دیکھنے کی دی گئی۔ شربت کی سبیل قائم کی جو کوئی دیکھنے آتا اسے شربت پلایا جاتا۔ فرخ سیر کے عہد میں بارود اڑانے کی وجہ سے اسکے پانچ ٹکڑے ہو گئے لیکن انگریزوں نے اس کو جوڑ کر پھر ہندو راؤ کے بارٹھ میں نصب کیا جہاں وہ اب تک موجود ہے۔

عمارت کی نہیں ہے جو فیروز شاہ نے تعمیر کرائی۔ البتہ فرشتہ نے اور صاحب طبقات اکبری نے حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:-
 ۵ بند جن سے آب پاشی ہوتی تھی۔ ۴۰ مسجدیں۔ ۳۱ مدارس جن کے ساتھ مسجدیں بھی تھیں۔ ۲۰ خانقاہیں۔
 ۱۰۰ محل۔ ۵۰ شفا خانے۔ ۱۰۰ مقبرے۔ ۱۰ حمام۔ ۵۰ اکوئیں۔ ۱۰۰ اہل

فہرست مرتبہ طبقات اکبری:- ۵ بند (غالباً ۵۰)۔ ۴ مساجد (غالباً ۴۰)۔ ۳۰ مدرسے۔ ۲۰ خانقاہیں۔
 ۱۰۰ محل۔ ۲۰۰ رباط (کاررواں سرائے)۔ ۳۰ شہر۔ ۴ حوض۔ ۴ شفا خانے۔ ۱۰۰ مقبرے۔ ۱۰ حمام۔
 ۱۰ مینارے۔ ۵۰ اکوئیں۔ ۱۰۰ اہل۔ باغوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں ہے ان میں سے ہر عمارت کے لئے اس نے جایداد
 وقف کی تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے اور اس کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔

مدارس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے، تاثر رحیمی میں پچاس مدرسے درج ہیں۔ فقیر محمد لکھتے ہیں کہ طبقات اکبری
 اور تاریخ فرشتہ میں تیس کی تعداد درج ہے، اگر ان میں سے کوئی تعداد صحیح نہ ہو تو بھی اس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسنے
 متعدد مدرسے قائم کئے۔

ان شفا خانوں کا جو انتظام تھا اس کا حال خود فیروز شاہ نے اپنی فتوحات میں لکھ دیا ہے اور جسے ہم درج کر چکے ہیں۔
 غراب کے فائدہ و سہولت کے لئے اس نے دیوان خیرات بھی قائم کیا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جن غراب و مساکین کی
 لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں اور بوجہ افلاس ان کی شادی نہ ہو سکتی ہو، انھیں مدد دی جائے۔ پچاس سے بیس تن تک، ہر شخص
 کی مدد کی جاتی تھی۔ سراج عقیق لکھتا ہے کہ ”اس سلسلہ میں ہزار آدمیوں کی اعانت کی گئی اور خدا جانے کتنی ناکھدا
 لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔“

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علماء و مشائخ کے لئے اس نے ۳۶ لاکھ تنکے کے وظایف مقرر کئے (مقابلہ کے لئے ایک لاکھ
 تنکے اسکے علاوہ تھے) لیکن اس نے خدمتِ علم صرف اسی حد تک نہیں کی، بلکہ تصانیف کی طرف بھی خاص توجہ کی جب سلطان
 نے نگر کوٹ فتح کرنے کے بعد وہاں کے راجہ کو بدستور حکمران قائم رکھا تو اس نے چند دن وہاں قیام بھی کیا۔ اس دوران میں اس سے
 لوگوں نے کہا کہ جب سکندر ذوالقمرین یہاں آیا تھا تو برہمنوں نے نوشاہ (سکندر بنی بنی) کا بت طیار کر کے اسکی پرستش

لے تاثر رحیمی کا مصنف محمد عبدالباقی الرحیمی النہادندی تھا۔ یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں اور عبدالرحیم خان خاناں کے متوسلین خصوصی
 میں سے تھا۔ اس کتاب میں سلاطین دہلی کی تاریخ درج ہے اور خصوصیت کے ساتھ عہد اکبری کے امراء و ملوک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے گئے
 ہیں۔ جلد رحیم خان خاناں کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض لوگوں نے اسکو خان خاناں ہی کی سیرۃ قرار دیدیا۔ چونکہ یہ کتاب عبدالرحیم
 خان خاناں کے ہم منصب اسی نے اس کا نام تاثر رحیمی رکھا گیا۔ لہٰذا فتح کے بعد نگر کوٹ کا نام اسنے سلطان محمد تغلق کی یادگار میں رکھنا کہ تغلق یہاں آیا
 تھا محمد آباد رکھا۔ لہٰذا نگر کوٹ آئے۔ فیروز شاہ، سرہند کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اور وہاں اس نے ایک قلعہ فیروز پور کے نام سے تعمیر کرایا تھا۔

دیوان خیرات کا قیام

علم پروری و تصنیفات

شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہاں کے لوگ اسی مجسمہ کو پوجتے ہیں، علاوہ اس کے فیروز شاہ سے یہ بھی کہا گیا کہ مندر میں ۳۰۰ کتابیں
 قدیم زمانہ کی رکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فیروز شاہ اس بُت خانہ میں جس کو "جوالاکھی" کہتے تھے گیا اور وہاں تمام علماء کو طلب کر کے بعض کتابوں
 کا ترجمہ کرایا، انھیں کتابوں میں سے ایک کتاب حکمت نظری و عملی کی تھی جس کو اعرالدین خالد خانی نے (جو اس وقت کے مشہور شعرا میں سے تھے)
 نظم کر کے دلائل فیروز شاہی نام رکھا، ایک کتاب عروض علم موسیقی کی اور ایک فن پڑے بازی کی بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس سے
 معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں حاکم و محکوم کے درمیان ایسے تعلق پیدا ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کی زبان کو سمجھتا تھا اور حسبِ بری
 حد تک مٹ چکا تھا۔ ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی (جس میں عہد فیروز شاہی کے ابتدائی دس سال کے حالات بھی درج ہیں) اسی کے عہد میں ختم ہوئی
 تفسیر تارخانی فتاویٰ تارخاں (جو فن تفسیر و فن فقہ کی بے مثل کتابیں ہیں) اور عین الملکی بھی اسی عہد کی مشہور تصانیف ہیں۔

۱۔ جوالاکھی، کوہ آتش فشاں کو کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر میں کوئی آتشکدہ قائم تھا اور وہاں آتش پرستی روتی تھی۔ ۱۲۸۔
 ۲۔ غیاث الدین خلجی کے عہد میں خراسان کے فرمانروا نے ملتان اور دہلی پر حملہ کیا اسکی بیوی بہت خوبصورت تھی جس سے وہ ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہو سکتا تھا
 اور ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ چنانچہ حملہ ملتان کے وقت بھی وہ ہمراہ تھی یہیں اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب سلطان تغلق نے مغلوں کو شکست دی اور فرمانروا
 خراسان بھاگا تو اضطراب میں یہ لڑکا یہیں رہ گیا۔ محمد تغلق نے اسکی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی اور اس کا نام تارملک رکھا وہ ابھی کمسن ہی تھا کہ سلطان
 محمد تغلق کا انتقال ہو گیا۔ لیکن محمد تغلق نے بھی اس کی تربیت کا خاص خیال رکھا بعد کو تارملک نے اپنی قابلیت سے بہت جلد مناسب ہیلہ حاصل کیے فیروز شاہ کے
 عہد میں تارخاں کا خطاب ملا۔ اس کو علم کی طرف بہت شغف تھا اور خود بھی ایک فاضل شخص تھا اس نے اس عہد کے تمام اکابر علماء و فقہاء کو جمع کر کے تفسیر
 میں ایک کتاب تفسیر تارخانی اور ایک کتاب فقہ میں فتاویٰ تارخانی مرتب کرائی۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے چند سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔
 ۳۔ عین الملک کا نام عین ماہر و بھی تھا۔ یہ نہایت قابل و ذہین شخص تھا سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک بار اس کے بھائیوں کی طرف سے کوئی نامناسب حرکت
 سرزد ہوئی تھی تو سارے خاندان پر زوال آگیا تھا لیکن اسکے بعد ایک بار محمد تغلق دربار کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ عین پر پڑی۔ وہ محمد تغلق اسکی ذاتی قابلیت سے واقف
 تھا اس لئے اس کا قصور معاف کر کے پھر دربار میں اس کو جگہ دی۔ اس نے محمد تغلق اور فیروز شاہ کے عہد میں متعدد تصانیف کیں انہیں میں سے ایک عین الملکی ہے۔
 فیروز شاہ کے عہد میں یہ اشرف الملک کے درجہ تک پہنچ گیا تھا لیکن کسی بات پر خان جہاں وزیر اور اسکے درمیان کچھ نا اتفاقی ہو گئی اور یہ اختلاف اس
 حد تک پہنچ گیا کہ فیروز شاہ نے مجبور ہو کر اسے ملتان بھجوا دیا۔ سوستان کی جاگیر دیگر دربار سے چلے جانے کا حکم دیا۔ عین الملک نے کہا کہ میں صرف اس شرط سے اس جاگیر کو قبول
 کرتا ہوں کہ اس کا حساب خان جہاں کے پاس نہ بھیجوں گا۔ بادشاہ نے یہ بھی منظور کیا جب اور درباریوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ ڈرے کہ کہیں خان جہاں ان پر بھی حملہ نہ کرے
 اس لئے انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ خان جہاں کے حوصلوں کا اس قدر وسیع کر دینا مناسب نہیں ہے اور عین الملک دربار سے علیحدہ رہنا خلاف مصلحت ہے چنانچہ وہ
 ابھی صرف ۲۰ کوں گیا ہوگا کہ فیروز شاہ نے اسے طلب کیا اور خلوت میں بلا کر خان جہاں کی بابت مشورہ کیا اور لوگ بھی موجود تھے سب نے یہی رائے دی کہ خان جہاں کو غارت
 علیحدہ کر دینا چاہئے لیکن عین الملک نے اسکی مخالفت کی اور فیروز شاہ سے کہا کہ خان جہاں سے زیادہ مناسب شخص اور کوئی اس عہد کے لئے نہیں ہو سکتا اسکا ہٹا دینا
 سلطنت کے لئے بہت مضر ہوگا۔ فیروز شاہ اسکے اس انصاف پسندی سے بہت خوش ہوا اور بعد کو خان جہاں اور اسکے درمیان صفائی کر دی۔ جب خان جہاں کو یہ
 معلوم ہوا کہ عین الملک نے باوجود دشمن ہونے کے بادشاہ سے اسکی تعریف کی تو وہ بہت گرویدہ ہو گیا اور عین الملک کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

فیروز شاہ کے عہد میں بڑے بڑے علماء پائے جاتے تھے ان میں سے ایک مولانا جلال الدین رومی تھے جو مدرسہ فیروز شاہی کے پرنسپل تھے۔ دوسرے مولانا عالم آندہ تھی جن کی نسبت مولانا عبدالحق دہلوی نے لکھا ہے کہ فتاوائے تاتارخانی کے مشہور ثنوی کے مصنف مولانا روم دوسرے تھے۔ مولانا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کی تاریخ حقی مشہور کتاب ہے اس میں سلاطین ہند نام خاندان سے لیکر اکثر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ ۹۹۶ھ میں (جب اکبری تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا) مرتب ہوئی مصنف کے آباؤ اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ مصنف بادشاہ نامہ لکھتا ہے کہ جب تیمور دہلی کی تاخت سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس گیا تو اسکے ساتھ ولید سے کچھ لوگ یہاں رہ گئے تھے اور انھیں میں سے کسی کی اولاد میں عبدالحق ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق دہلی کتاب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ میر جلالی آغاز تک علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں دہلی آیا۔ آغاز تک کلپوتا اور راء انہر چلا گیا تھا اور پھر وہاں سے تیمور کے ساتھ آیا۔ مسطر طحکان نے اپنے مسودہ تاریخ دہلی میں لکھا ہے کہ انکا مورث اعلیٰ بخارا سے دہلی آیا اور یہاں شاہی دربار سے متعلق ہو گیا ہر حال اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالحق کے آباؤ اجداد بخاری تھے۔ اس نے مولوی عبدالحق کے بیٹے ”دہلوی البخاری“ کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولوی عبدالحق کے والد ایک بزرگ آدمی تھے جن کی تعریف مصنف نے کی ہے۔ مولوی عبدالحق بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے اور قرآن بھی حفظ کیا (بادشاہ نامہ عبدالحق حمید لاہوری) دوران تعلیم کا حال بیان کرتے ہوئے وہ خود اپنی مشہور تصنیف اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ وہ دونوں وقت مدرسہ جایا کرتے تھے اور صرف کھانا کھانے کے لئے تھوڑی دیر کو گھر آتے تھے ان کا گھر مدرسہ سے دو میل کے فاصل پر تھا اسکے شوق تعلیم میں یہ روزانہ ۸ میل کا سفر کیا کرتے تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ تک ملا عبد القادر بدایونی، فیضی اور نظام الدین مولف طبقات اکبری کے ساتھ فتحپور سیکری میں رہے (تاریخ بدایونی) لیکن بعد کو کسی اختلاف کی بنا پر علیحدہ ہو گئے اور حج کو چلے گئے بعد فرنگ حج عرب میں عرصہ تک قیام رہا اور مدینہ و مکہ کے علماء سے بہت کچھ فیضان حاصل کیا۔ اصول تصوف، مذہب، سیاحت، تفسیر وغیرہ کی بہت سی کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔ خود انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔ ان میں سے مدینہ سکینہ، مدارج النبوت، جذبات القلوب (تاریخ مدینہ) اور اخبار الاخیار بہت مشہور ہیں۔ مولوی عبدالحق ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ انھوں نے حوض شمس کے پاس اپنا مقبرہ اپنی ہی زندگی میں طیار کر لیا تھا۔ چنانچہ یہیں مدفون ہوئے یہ مقبرہ اب بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے) مولوی عبدالحق بہت صحیح و توانا شخص تھے مولف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ شمس علیہ السلام میں جبکہ ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی ان کے قوا، نہایت اچھے تھے اور اپنے مشاغل تصنیف و تالیف میں اسی طرح مصروف تھے جیسے عالم شباب میں۔ مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں عنیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھ کر پیدا ہوا چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات تھے اس لئے بعد کے سلاطین کے حالات انھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ سام سلطان بہادر گجراتی سے مدد لیکر بھلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ ان بادشاہوں کا حال بھی لکھنا چاہئے جن کی طرف عنیاء برنی نے اعتناء نہیں کیا ہے۔ اس غرض سے انھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخر الدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بھلول لودی کے وقت سے عہد اکبری کے حالات انھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں۔ انھوں نے سلاطین بنگال، جوہور، ماندار، ماتوہ دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن نہایت جمل و مختصر۔ تاریخ حقی کیا ہے اور ہندوستان میں اسکے قلمی نسخے شادوناد کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ایک نسخہ بڑا قیمتی ہے اور دوسرا اصل ایشیا ٹک سوسائٹی لکھنؤ میں

کی ترتیب میں انہیں کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ ان کے مولانا خواجگی (قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاد) مولانا احمد تھانوی اور قاضی عبدالقادر (جو علاوہ فاضل ہونے کے بے مثل شاعر بھی عربی و فارسی کے تھے اور جنہوں نے لامعۃ العجم کا جواب لکھ کر شہرت دوام حاصل کر لی ہے) ملک احمد ولد امیر خسرو اور مولانا مظہر کڑوی اور قاضی عابد بھی اپنی اپنی جگہ بے مثل علماء و صاحبان کمال میں شمار کئے جاتے تھے۔

۱۔ سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جو پورے عہد میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے عروج حاصل کیا، قاضی صاحب اپنے عہد کے آخر و خشدہ تسلیم کئے جاتے تھے اور اس وقت کے تمام علماء انہیں ”ملک الحکماء“ کہا کرتے تھے کیونکہ ان سے زیادہ صاحب فضل و کمال اور کوئی شخص نہ تھا۔ قاضی صاحب کی تصانیف متعدد ہیں جن میں حواشی کافیہ (جو ان کی بہترین تصنیف کہی جاتی ہے) ارشاد، بدیع البیان خاص شہرت رکھتی ہے۔ ۲۔ ملک حملا میر خسرو کے صاحبزادے تھے اور مذاق شعری نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کوئی دیوان ایسا نہیں پایا جاتا، لیکن شعرا و متقدمین کے کلام میں جو اصلاحیں انہوں نے دی ہیں وہ کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ بدایونی نے چند مثالیں لکھی ہیں مثلاً ظہیر کا شعر ہے :-

کلاہ گوشہ حکم تو از طریق نفاد
ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

انہوں نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا۔ بخیل کی ہجو میں ایک شعر مشہور ہے :-

ایں سہل سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست
گرتان خوابہ خواستے آن راہ کردمی

ملک صاحب نے بجائے گوگرد سرخ کے آب حیات کر دیا۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے :

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرغ
نرخ گہرہ طعن خریدار نشکند

ملک احمد نے پہلے مصرعہ کو یوں کر دیا :- ”گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرغی“ (بدایونی ۶۷) - (شعر انجم ۲-۱۳۴)

۳۔ مولانا مظہر کڑوی کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں مولانا مظہر کی اولاد لکھنؤ میں موجود تھی۔ مولانا دربار فیروز شاہ میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ۵۱ ہزار اشعار کا تھا۔ لیکن چونکہ اُن پر زہر و علم کا دنگ زیادہ غالب تھا اس لئے اُن کا دیوان کے نزدیک اُن کے اشعار زیادہ پر لطف اور بامزہ نہ ہوتے تھے۔

۴۔ قاضی عابد شاعر بھی تھے چنانچہ ان کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور حقیقتاً نہایت خوب ہے :-

دوستان گویند عابد با چنین طبع لطیف
چیت کا شعاع غزل از تو فراوان برخواست

ماکر اشعر و غزل گویم چوں در عہد ما
شاہد موزدن و مدوحی ز رافشاں برخواست

یہ قطعہ بالکل ترجمہ معلوم ہوتا ہے عربی کے اس قطعہ کا۔

قالا ترک الشکر قلت ضرر کا
باب الدواعی والبواعث مغلق

قلت الی یاس فلا کریم یسما تجا
عبد الزوال ولا ملیح یعشق

روگ مجھ سے بد جتنے ہیں کی تو نے شعر گوئی ترک کر دی۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ہاں، کیونکہ اسباب شعر گوئی ناپید ہیں۔ کوئی ایسا سخن ہے جس کی مدح میں شعر کہے بخشش کی توقع قائم کی جائے اور نہ کوئی ایسا سبزہ رنگ معشوق ہے جس کی محبت شعر کہنے پر مجبور کر دے۔

فیروز شاہ کو تمام فنون کے ساتھ دلچسپی تھی چنانچہ استادوں کے ماتحت اس نے اپنے غلاموں کی بڑی تعداد کو مختلف پیشوں اور حرفوں کی تعلیم دلائی۔ اور لوگوں میں مختلف نئی نئی چیزیں بنانے کا ولولہ پیدا کر دیا اس عہد کے ایک مشہور ایجاد طاس گھڑ پال ہے جس سے نمازوں کے اوقات روزہ کھولنے کا وقت سایہ کا حال، شب و روز کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ فیروز آباد میں جہاں یہ گھڑ پال لگا تھا وہاں اس کے دیکھنے کے لئے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس ایجاد کو خود فیروز شاہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہر جشن کے موقع پر جو سال میں چار بار (عیدین، نوروز و شبِ برات) ہوتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد داستان گو گوئے ماہرینِ رقص، پہلوان اور کرتب دکھانے والے جمع ہو کر اپنا کمال اور تماشہ دکھایا کرتے تھے۔ اور بادشاہ سب کو انعام دے کر رخصت کرتا تھا۔

فیروز شاہ کو قدیم اور نادر چیزیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اشوکا کے سنگین ستونوں کا فیروز آباد میں نصب کرنا بھی اسی ذوق کی بنا پر تھا۔ اس نے ایک خاص مکان اس لئے تعمیر کرایا تاکہ وہاں ایسی عجیب و غریب چیزیں رکھی جائیں۔

سراجِ عقیق نے لکھا ہے کہ اس عجائب خانہ میں ایک پستہ قد شخص ایسا تھا جو صرف ایک گز لمبا تھا لیکن اس کا سر تین آدمیوں کے برابر تھا۔ دو آدمی دراز قامت تھے۔ یہ اتنے لمبے تھے کہ اس وقت کا طویل سے طویل قدر کھنے والا آدمی ان کی کمر تک پہنچتا تھا۔ دو عورتیں ایسی تھیں جن کی داڑھی بالکل مردوں کی طرح تھی۔ ایک بکری تین پاؤں کی تھی جو خوب دوڑتی تھی۔ ایک سیاہ کوا سرخ چونچ کا، ایک سپید طوطی سیاہ منقار کی ایک گائے جس کے سُم گھوڑے کی طرح تھے۔ اور علاوہ ان کے اور بہت سی چیزیں اس عجائب خانہ میں تھیں۔ آدمیوں اور ہاتھیوں کی وہ ہڈیاں بھی اس عجائب خانہ میں رکھی ہوئی تھیں، جو سرستی اور ستلج کے درمیان پشتہ زمین کھودنے سے برآمد ہوئی تھیں۔ بعض ہڈیاں ایسی تھیں جو نصف پتھر ہو گئی تھیں۔

جب فیروز شاہ، دہلی آکر انتظامِ سلطنت میں مصروف ہوا تو خداوندِ زادہ (سلطان محمد تغلق کی بہن) معہ اپنے شوہر کے وہیں ایک محل میں رہتی تھی، فیروز شاہ ہر جمعہ کو اس محل میں جاتا۔ ملک خسرو آگے کھڑا رہتا اور ملک داؤد (خداوندِ زادہ کا بیٹا) ماں کے پیچھے بیٹھتا۔ جب بادشاہ رخصت ہونے لگتا تو خداوندِ زادہ پان دیتی۔

ہر چند خداوندِ زادہ، فیروز شاہ کی تخت نشینی پر راضی ہو گئی تھی، لیکن حقیقتاً وہ اس سے خوش نہ تھی ایک بار اس نے فیروز شاہ کو قتل کر دینے کی سازش کی اور محل کے اندر جبروں میں زرہ پوش سپاہیوں کو چھپا کر تاکید کر دی کہ جب ”میں اپنے سر پر دو پٹے کو درست کرنے لگوں تو فیروز شاہ کا کام تمام کر دیں“

جب فیروز شاہ، حسب معمول آیا تو داؤد ملک نے جو اس سازش میں شریک نہ تھا بادشاہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا یہ کچھ سمجھ کر فوراً وہاں سے چلا گیا۔ خداوندِ زادہ رد کرتی رہی مگر یہ کوئی عذر کر کے چلا آیا۔ اس کے بعد جب خداوندِ زادہ کے محل کا محاصرہ کیا گیا تو زرہ پوش سپاہی گرفتار ہوئے اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا۔ بادشاہ نے خداوندِ زادہ کو صرف یہ یہ سزا دی کہ

وہ گوشہ نشین ہو جائے اور اپنا وظیفہ لیتی جائے اور اس کے شوہر خسرو ملک کو جلا وطن کر دیا۔

جب بادشاہ اول مرتبہ بنگال کی مہم پر گیا تو تاتار خاں بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ کبھی کبھی شراب کا شغل کیا کرتا تھا۔ ایک دن صبح کو اتفاق سے تاتار خاں اس کے خیمے میں پہنچ گیا۔ فیروز اس وقت اسی شغل میں مصروف تھا فوراً شراب کا سامان پٹنگ کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن تاتار خاں نے دیکھ لیا اور بادشاہ کو نہایت سختی سے زجر و توبیخ کی۔ بادشاہ بہت نادم ہوا اور آئندہ کے لئے عہد کیا کہ میں تمہارے موجودگی میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔

تاتار خاں صرف ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن یہ فیروز شاہ کی حدودِ رحمت و انصاف پسندی اور سلامتِ طبع تھی کہ اس نے اپنے ایک معمولی امیر کی جھڑکی سن لی اور جواب میں سوائے انفال و ندامت کے اظہار کے اور کچھ نہ کہا۔

بہلول لودی

بہلول لودی مذہب کا سخت پابند اور بے انتہا سخی و شجاع بادشاہ تھا۔ رحم و رافت اس کی فطرت تھی اور احکامِ شرع کی پابندی اس کا نصب العین۔ وہ اکثر علماء و مشائخ کو اپنی صحبت میں رکھتا اور غریب و مساکین کے حالات ہمیشہ تحقیق کرتا رہتا۔ اس نے کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کیا۔

وہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا اور لوگوں کی شکایتیں خود سکر فیصلہ کیا کرتا تھا۔ وہ بے انتہا دانشمند تھا اور صد درجہ غور و تامل لطف و مہربانی سے کام لے کر انصاف کرتا تھا۔ (جو کچھ روپیہ، اسباب وغیرہ) اُسے ملتا وہ سب فوج کو تقسیم کر دیتا تھا، اور خود صرف خشک روٹی پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوستانہ صحبتوں میں وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ رؤساء کو اپنے سامنے کھڑا رہنے دیتا۔ وہ سب کو اپنے برابر جگہ دیتا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا تو اس کے خوش کرنے کے لئے بعض اوقات یہاں تک ایشار سے کام لیتا کہ اس کے قدموں پر گپڑی تک ڈال دیتا۔

اس کی تحت نشینی سے پہلے دہلی کے پٹھانوں میں یہ رسم تھی کہ مردہ کے سیوم میں مٹھائی، شربت اور پان وغیرہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس نے اس رسم کو بالکل ممنوع قرار دیا کیونکہ اس رسم میں فضول مصارف ہوتے تھے۔

اس کے ضبط کی عجیب و غریب شان وہ ہے جب ایک دن جامع مسجد کے اند ایک گلانے اس کو اور اس کے خاندان والوں کو صاف طور پر ذریاتِ شیطان سے تعبیر کیا اور اس نے ہنس کر صرف یہ کہا کہ ”ملا صاحب ہم سب تو بندگانِ خدا ہیں“ تعمیرات کا بھی اسے شوق تھا، لیکن اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ تاہم اگر یہ جدید تحقیق صحیح ہے کہ آگرہ کی بنیاد دہلی

اس نے رکھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی اس نے اپنے کو غیر فانی بنادیا لیکن تمام موزنین اگرہ کی بنیاد سکندر لودی
 جسے سو ب کرتے ہیں۔
 مائثر جمعی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس بھی قائم کئے۔ بہلولی سکھ جو پیسہ کے قائم مقام رائج ہوا
 اسی کی یادگار ہے۔

سکندر لودی

سلطان سکندر لودی، اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے جس قدر حسین و جمیل تھا اُس قدر اس کا باطن پاکیزہ تھا۔ وہ اپنے
 باپ کی طرح حد درجہ سادگی پسند تھا اور کبھی شاہانہ تکلفات میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا تھا۔ اس کی فطرت نہایت سلیم اور اسکی
 طبیعت رافت و عطوفت کی طرف از بس مائل تھی وہ خدا سے ڈرتا تھا اور بندگان خدا پر ہمیشہ رحم کرتا تھا۔
 جیسا وہ شجاع تھا ویسا ہی عادل بھی تھا۔ انتظام سلطنت، تصفیہ معاملات میں وہ ہندو مسلمان، قوی و ضعیف
 کو برابر سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ سب کو انصاف سے احراز نہ ہو۔
 بادشاہ ضبط اوقات کا بے انتہا پابند تھا اور جو معمول اس نے اپنے پاس کسی اور کے لئے مقرر کر دیا، اس میں کبھی تبدیلی
 پیدا نہیں کی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلس علماء میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ
 ادا کر کے حرم سرا میں جاتا اور ایک گھنٹہ وہاں قیام کر کے خلوت خاص میں جاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنتا اور سلطنت

سے (1989) LXXIV. 1271 Cal Review Keen's Article medieval India

تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ اگرہ نے شہر کی حیثیت سکندر لودی ہی کے زمانہ میں اختیار کی۔ اس سے قبل وہ صرف ایک گاؤں تھا۔ ہندوں
 کا بیان ہے کہ راجہ کنس فرزند اے متھرا کے عہد میں اگرہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور یہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے
 ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے اگرہ کو بھی تباہ کیا جسے کہ وہ ایک معمولی گاؤں رہ گیا۔ اس کے بعد پھر سلطان سکندر لودی کے عہد سے اس میں
 دوبارہ ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ آگرہ کے زمانہ میں دہلی دار الحکومت قرار پایا۔ (تاریخ داؤدی (ایڈٹ) ۴ - ۴۵۰۔)

Promotion of Learning India

ک روپے کے چالیس بہلولی پیسہ ملا کرتے تھے۔ ایک بہلولی کا وزن ایک تولہ یا ۴۸ رتی ہوا کرتا تھا۔ بہلولی کو دآم بھی کہتے تھے۔
 مصنف تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا متحیر رہ جاتا تھا۔

کی اصلاح کرتا۔ قرآن تحریر کرتا اور سلاطین محاصر کے نام خطوط لکھتا۔ رات کو بہت کم سوتا۔ بڑے جید اقدار بدست مستر عالم خلوت خاص میں اس کے پاس رہتے اور نصف شب تک مذہبی احکام وغیرہ ان سے دریافت کرتا رہتا۔ اس کے بعد کھانا پینا جاتا اس کی ساری عمر گزر گئی لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں ہوا۔

وضع داری و بیدار مغزی

اس کی وضع داری اور پختگی انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبدالغنی جو پوری بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کے لئے جو کھانا آیا اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے ۶ شیشے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جازن میں آئے، لیکن شربت کے قرا بے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر گزر جاتی اسی طرح پیش کرتا اور اس میں سرو تفاوت نہ ہوتا۔

اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر تدرین شخص سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خاں شخص ہر وقت لبراز رہتا تھا اس طرح اس کی دیانت و سیر چشمی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اس کے سامنے رکھی جاتی تو وہ خلاف احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

سکندر معمول

جب لشکر کو وہ کسی ہم پر روانہ کرتا تو روزانہ دو فرمان عسکر کے نام پہنچتے۔ ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں، سرائیوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت طیارہ رہتی۔ اگر لشکر ۵۰۰ کوں پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔ روز اس کے سامنے کل اشیاء کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا اگر کوئی نامناسب بات اُسے نظر آتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں بہت ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

الذاتی خیال

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور جاسوس متعین تھے جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر پہریات کے ٹک بٹیا رہے، کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کر کے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچتا رہتا۔

فضیلا و علماء کا تصور

اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے تجربہ جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہنچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا کہ بسا اوقات لوگوں کی وہ باتیں جو انتہائی خلوت سے متعلق ہوتیں اس کو معلوم ہو جاتیں چنانچہ عام طور سے ان لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔

خبر جاسوس

وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراموش و دانائی سے کام لیکر حقیقت تک پہنچتا۔ چنانچہ

صاحب طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ :-

”گوآلیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہو گئے۔ ایک لڑائی میں انھیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ ایک اس دولت پر قانع ہو کر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصرتھا۔ جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کر کے کہا کہ میری بیوی کو دیرینا۔ جب یہ گوآلیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیدیں لیکن لعل نہ دیا جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔ اس نے انکار کیا۔ الغرض یہ معاملہ میاں بھوراک پہونچا جو دربار سکندر لودی کے امراء کبار میں سے تھے اور وہاں کے میر عدل بھی تھے انھوں نے گواہ طلب کئے خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے، اور میاں بھوراک نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ ”لعل بیوی سے وصول کر لینا چاہئے“ یہ غریب بہت پریشان ہوئی اور سیدھی آگرہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں پہونچی۔ بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اُس عورت کو نہیں دیا گیا۔ لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا آخر کار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا کہ جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت و مقدار موم کے ذریعہ سے ظاہر کرو۔ جب یہ دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونہ سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کوئی مناسبت نہ تھی بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا جس سے حقیقت واضح ہو گئی۔“

افصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیر دار نے اس کی زمین چھین لی ہے۔ بادشاہ نے میاں بھوراک کو تحقیقات کا حکم دیا۔ لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آ گئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے میاں بھوراک کو بلا کر کہا کہ کیوں اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ آج اسوقت عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے جب تک یہ معاملہ طے نہ ہو جائے۔ چنانچہ تمام علماء و متین پہرات گئے لیکن بیٹھے رہے اور اسی وقت بادشاہ کو نتیجہ سے اطلاع دی گئی جو مستغیث سید کے حق میں تھا۔ بادشاہ نے میاں ملک جاگیر دار کو بلا کر دریافت کیا کہ کیوں تم نے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف و املاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔ میاں ملک نے منفعیل ہو کر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سبکے سامنے اعتراف جرم کر کے نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی۔

ملک اور

۱۔ اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھوہ اور بعض نے بھورا لکھا ہے۔ — بطعہ طبقات اکبری — ۱۷۲ — فرشتہ ۱۸۹ —

۲۔ تاریخ داؤدی (الہیٹ) ۴ — ۴۵۴ —

وہ فطرتاً ہی انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا۔ ایک بار سنبھل کے شعلے میں کسی شخص کو زمین ۵۰۰۰ اشرفیوں کا دھینچہ مل گیا۔ لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل نے اس سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً دھینچہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔

حاکم سنبھل نے عرضداشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ ”اے بیوقوف جس نے اس کو یہ دھینچہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے۔“ اسی طرح ایک بار اجڑھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دھینچہ برآمد ہوا اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے جن پر سکندر کی مہر ثبت تھی۔ علی خاں حاکم لاہور دھینچہ پورے شیخ کو لکھا کہ یہ دھینچہ میرے حدود حکومت کے اندر برآمد ہوا ہے اس لئے میرے پاس بھیج دو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خاں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ:-

”اجودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دستیاب ہوا ہے۔“

بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھ دیا کہ:-

”تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتنا کرتے ہو۔“

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے، لیکن اس نے واپس کر دیے اور کہا کہ:-

”تمہیں رکھو، ہمیں تمہیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے۔“

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افغانہ اور واقعات مشتاقی میں بھی درج ہے۔

اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کر دیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔

ایک بار اس نے ملک بدر الدین کا وظیفہ سات لاکھ تنگہ مقرر کر کے ایک بار گنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اس کی آمدنی ۹ لاکھ تنگہ ہو گئی اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ”زائد دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہوتا ہے“ بادشاہ نے کہا کہ:- ”تم رکھ لو“ دوسرے سال

لے تاریخ داؤدی (ایڈ) ۲۵۲ - ۲۵۳ - ۲۵۴ واقعات مشتاقی کا مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۱۹۹۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۹۸ء میں اس کا انتقال ہوا مخزن افغانی میں اس کو صرف مولانا مشتاقی لکھا ہے۔

اس کے باپ کا نام شیخ سعد اللہ تھا۔ مولانا مشتاقی کو کمسنی سے علماء کی صحبت کا بہت شوق تھا اور اس طرح اس نے بہت فائدہ اٹھایا جو کچھ واقعات و حالات گزشتہ زمانہ کے اس کو علماء و مشائخ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے تھے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ آخر کار اس کے احباب نے مجبور کیا کہ وہ ان تمام حالات کو قلمبند کرے چنانچہ اس نے اپنے تمام تاریخی معلومات و تحقیقات کو یکجا فراہم کر دیا اور اس کا نام واقعات مشتاقی رکھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

سیرت کی مثال

استغفار

وضو اور

گیارہ لاکھ آمدنی ہونی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا۔ تیسرے سال آمدنی پندرہ لاکھ ہو گئی اس نے پھر عرض کیا۔ بادشاہ نے کہا:۔
 ”جاگیر تمھاری ہے اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمھاری ہی ہو سکتی ہے مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو؟“
 چونکہ نود بادشاہ کی نیت اچھی تھی اس لئے تمام امراء و جاگیردار بھی ایسے ہی دیانت دار و امین تھے۔ جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اس وقت کہ اگر کسی جاگیردار پر کوئی قصور ثابت ہو جائے تو اس صورت میں اسکی جاگیر لے لیتا۔ لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

وہ حرص و طمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ ایسے جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۴ ربیع الاول کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایا لے مالگزار ہی کے ذہب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

ذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس نے اسی سلسلہ میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے، مولانا مشتاقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیر داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا۔

اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک ہاروب کش مقرر کیا جن کو ماہوار تنخواہ

(باقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۳)

مولانا عبدالحق نے اپنے تاریخ حقی اور شیخ نورالحق (عبدالحق کے بیٹے) نے اپنی زبدۃ التواریخ میں مولانا مشتاقی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے سیاح تھے انھوں نے اپنے عصر کے بڑے بڑے علماء، مشائخ اور صاحبان فضل و کمال کی صحبت سے فائدہ اٹھایا وہ خود بھی بڑے فاضل شخص تھے اور غلام تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاق اور ہندی میں راجن تھا، ہندی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف ”پیماں جب نرغین“ اور دیگر رسائل ہندی زبان میں بہت مشہور ہیں۔

مولانا مشتاقی کے آٹھ بھائی تھے جو سب کے سب قابل تھے۔ ان کا دادا شیخ فیروز علاوہ صاحب سیف ہونے کے مشہور اہل قلم بھی تھا۔ اس نے سلطان بہلول اور سلطان حسین شرقی کی باہمی جنگ کا حال ایک طویل نظم میں تحریر کیا تھا جو مولانا عبدالحق کے پاس تھی لیکن بعد کو گم ہو گئی۔ شیخ فیروز کا انتقال ۸۶۲ھ میں ہوا۔

واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودی سے ابتدا کی گئی ہے اور سلسلہ دار عہد اکبری کے حالات لکھ کر شیر شاہ، اسلام شاہ، سلطان محمود علی غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور سلطان مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے اور صرف دو نسخے اس وقت اس کے موجود ہیں۔ ایک مسٹر الیٹ کے پاس تھا جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا، دوسرا لکھنؤ کے کتب خانہ موتی محل میں — لے تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ — ۵۳۴ھ — رسول اللہ کی تاریخ رحلت —

ہتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور شالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول کے مہینوں میں مساکین و مستحقین کو ہدیہ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر شاہی پرسلطنت کے تمام غریب و مساکین کی فہرست پیش کی جائے۔ جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ ان کو اس قدر روپیہ دیتا کہ چھ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں بدخیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کر کے بادشاہ تک خبر پہنچاتے اور خزانہ شاہی سے روپیہ نیکرا انھیں تقسیم کرتے۔

وظائف

چونکہ بادشاہ کو اس طرف بہت توجہ تھی اس لئے تمام اہلکار اراکین، خوانین و لوک نے سبھی غریب و مساکین کے وظایق مقرر کر رکھے تھے چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مر جاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دی جاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقراء کو تقسیم کر دی جاتی۔

ریحانہ اطمینان

اس کے عہد میں زراعت کثرت سے ہوتی تھی۔ چیزیں بہت ارزاں تھیں تاہم خوش حال تھے اور تمام اہل پیشہ اپنے اپنے مشاغل میں نہایت اطمینان کے ساتھ مصروف نظر آتے تھے۔ سلطنت میں کہیں بدحواسی اور رہزنیوں کا پتہ نہ تھا اور قافلے نہایت امن و سکون کے ساتھ رات دن سفر کیا کرتے تھے۔ سکندر شاہ کو مغربی موزین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا لیکن اس سے نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو عند اللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں وہ اپنے بھائی بابرک شاہ سے لڑ رہا تھا ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا کہ ”فتح تیری ہے“ بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا اور جواب دیا کہ ”دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ اس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور میں آئے جو بہتر و مناسب ہو۔“

رواداری

قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھا نیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشران کرتے ہیں اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجدوہنی نے جو بڑے جتید عالم تھے کہا کہ:-

”ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا ان کی کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے۔“

سکندر نے یہ سن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آگیا۔

وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دار الحکومت تھا) علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ شعراء و ادباء کامرکز ہو گیا تھا۔ فارس و عرب، ہند و بخارا کے تمام صاحبان کمال کھنچ کھنچ کر آگرہ چلے آئے تھے اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالا مال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحث کا اسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کر کے وہ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک عہد

نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علماء کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔
شعر و سخن کا بھی اُسے ذوق تھا گل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا اور شیخ جمال کنہوہ سے جو بڑے پایہ کا شاعر
تھا اصلاح لیا کرتا تھا۔

اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعراء بھی رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا جو عربی و فارسی کا عالم ہونے
کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔
ملائے برائیونی، عہد سکندر لودی کے بعض مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

”شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس
علماء (مثلاً جمال خاں دہلوی، شیخ لودی، سید جلال الدین برائیونی وغیرہ) شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے نکل کر
اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقولات کا رواج شیخ عبداللہ کے وقت سے ہوا اور اس سے
قبل علم منطق و کلام میں صرف شرح شمسہ اور شرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں۔“

سکندر شاہ، مولانا شیخ عبداللہ کا حد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہنچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونہ میں جا کر
بیٹھ جاتا۔ تاکہ درس و تدریس میں حرج واقع نہ ہو جب وہ فارغ ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آ جاتا۔
شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سی مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے، انھیں کے شاگردوں میں
میاں قاسم سنبھلی تھے۔

لے ان علماء کی فہرست حسب روایت فرشتہ یہ تھی:- میاں قادر بن شیخ خواجو۔ میاں عبداللہ۔ سید محمد بن سعید خاں دہلوی۔ ملا قطب الدین و ملا
الداد صالح سرہندی۔ سید بابا۔ سید برہان۔ سید احسن قنوجی۔ سید صدر الدین۔ میاں عبدالرحمن۔ میاں عبدالرحمن۔ میاں عبدالعزیز سنبھلی
(فرشتہ ۱۸۲)۔ ملائے برائیونی نے یہ غزل اس کی منتخب لتواریخ میں درج کی ہے:-

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدنتش	روح ست مجسم کہ دراں پیرہنتش
مشک فتن چہیت کہ صد ملکیت چین	در حلقہ آل زلف شکن درکننتش
در سوزن مژگاں بکشم رشتہ جاں را	تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنتش
گل رخ چہ کند جو ہر دندان ترا و صف	ہمچوں و در سیراب سخن در دہنتش

سے عہد سکندر شاہ یہ شیخ جمال بڑا مشہور شاعر تھا اور بادشاہ اس سے بہت مانوس تھا اور مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ شیخ جمال کا یہ ایک شعر فرشتہ اور ملائے برائیونی نے
نقل کیا ہے۔ ماراز خاک کویت پیرہنے ست برتن، آنہم ز آب دیدہ صد چاک تاہد امن
سیرا عارفین اسی کی تصنیف ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ۹ ہزار سے زائد اشعار کا تھا۔

اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم شیخ الہ دیا بھی تھے جنہوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلد میں تحریر کی ہے علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر ان کے حواشی اور شرح کافی شہرت رکھتے ہیں اس زمانہ میں ان کی یہ تمام کتابیں درسیات میں داخل تھیں۔

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علماء کو جمع کر کے ایک جانب شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز کو، دوسری جانب شیخ الہ دیا اور ان کے بیٹے بھکاری کو کر کے مباحثہ سنا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں دے سکتے۔

الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت علمی چرچا ہوا کرتا تھا اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کے علوم حاصل کرنے شروع کئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قائم ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک مین کلکٹر ریویو میں ظاہر کرتے ہیں کہ ”ہندوؤں نے سولہویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی ایک صدی گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہو گئے۔“

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودی نے قصداً ہندوؤں میں یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انہیں سلطنت میں انتظامی عہدے دے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خوان ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں۔ انھوں نے انکار کیا تو چیتروں سے کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہل سیف ہیں اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی لیکن اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا آخر کار کالیستھوں نے اسے قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کر لی کہ وہ مسلمانوں کے علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت میں بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امراء کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ اگر کرہا ویدک، جو فن طب کے متعلق سنسکرت کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طب سکندی کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطباء ہند نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔

۱۔ شیخ عبداللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا۔ ۲۔ منتخب التواریخ - ۸۶ -

Cal Review ۳۳۱۴ (Kern's medieval India, Cal Review ۳۳۱۴)

۳۔ ذاتیات مشتاقی کا مصنف اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ ”میاں بودہ نے جو خواص فنا کے جانشین ہوئے تھے خراسان سے بہت سی کتابیں فراہم کیں اور تمام علماء ہند و ایران کو طلب کر کے طب سکندری کو مرتب کرایا تھا۔ میاں بودہ بڑا علم دوست امیر تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال اسکے دربار میں موجود رہتے تھے اور یہ ان سے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کرایا کرتا تھا۔“

ہندوؤں کی توجہ فارسی کی طرف
ہندو مسلمانوں کے تعلقات
ہندو اور فارسی زبان
تصانیف

بادشاہ کو دیگر فنون و صناعات کے علاوہ جن کے کارخانے کثرت سے قائم تھے۔ موسیقی کا بہت ذوق تھا وہ دربار عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اسوقت صرف سید فتح اللہ اور سید ابن رسول جو مقربان خصوصی میں سے تھے، اسکے خیمہ کے قریب ہوتے اُسے سُنا اور شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگیناں، مالکوس، کلیان، کانرا اور حسینی بجائی جائیں۔

سلطان ابراہیم

سلطان ابراہیم نے کل ۹ سال سلطنت کی (جس کو فرشتہ نے خدا جانے کس حساب سے بیس سال تحریر کیا ہے) اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں، غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہ آئیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوئی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ سکندر لودی کے وقت میں بھی ارزانی بہت تھی، لیکن نہ اس قدر۔ اس کے عہد میں ایک بھلوی سکہ کا دس من غلہ آتا تھا، پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بھلوی تھی۔ علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے وہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دیدیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے۔ جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیرداروں کو مجبور کر دیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک روز آدمی مع اپنے خاندان کے پانچ تنکے ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی سوار دہلی سے آگرہ کا سفر کرتا تو صرف ایک بھلوی سکہ اس کے، اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا۔

عہد حکومت کی چند خصوصیات

۱۔ یہ بیان تاریخ داؤدی کا ہے۔ واقعات مشتاقی میں ان چار راگینوں کا نام گورا، کلیان، کانرا، مقام حسینی تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار (مصنف سلاطین افغنہ) بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کے چار غلام تھے جو موسیقی کے ماہر تھے ایک چنگ نہایت خوب بجاتا تھا، دوسرا قانون تیسرا طنبورہ کا ماہر تھا اور چوتھا مین کا۔ یہ غلام حسن صورت کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔ ۲۔ تانبہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر۔

۳۔ سوار کی تنخواہ بیس سے تیس تنکے تک تھی اور اس سے اُس عہد کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ تاریخ داؤدی (الیٹ) - ۴ - ۴۵ - ۴۶ -

علوم اسلامی پر ایک مورخانہ نظر

علوم عرب قبل اسلام ہر چند ہمیر پرگشتال (مشہور جرمن مستشرق) کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ عرب اور عربی لٹریچر کی صحیح تاریخ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب وہاں آفتاب رسالت طلوع ہوا لیکن قاطباً اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قبل عہد اسلام، عرب میں کسی علم کا رواج ہی نہ تھا اور ”زمانہ جاہلیت“ علمی نقطہ نظر سے بالکل تاریکی و ظلمت میں مدفون تھا۔

علامہ شہرستانی نے اپنی مشہور تصنیف الملل والنحل میں لکھا ہے کہ قبل اسلام، عرب میں خصوصیت کے ساتھ چار علوم کا زیادہ رواج تھا: (۱) علم الانساب (۲) تاریخ (۳) تعبیر الرؤیا اور (۴) علوم النجوم۔ شاہان حیرہ و غسان نہ صرف علوم و فنون کی قدر کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ان میں سے بعض اچھے شاعر تھے۔

منذر، اپنی سیاسی ذہانت کی وجہ سے، تاریخ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور اس کے بیٹے عمرو کے دربار میں المناس اور طرہ دو مشہور شاعر رہا کرتے تھے، جن میں سے موخر الذکر تعلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا۔ منذر کے جانشین نعمان نے جس سیر چمپی سے نابغہ اور لبید شعراء کی قدر کی، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔

بنو غسان کا آخری بادشاہ، جبکہ ابن الاہم، جو خلیفہ ثانی کے عہد تک زندہ رہا، اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا، اور فرمانروایان عرب کی صف میں امرؤ القیس کو جو مرتبہ شاعری کے لحاظ سے نصیب ہوا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج دنیا میں وہ شاعر ہی کی حیثیت سے مشہور ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ حیرہ کا تاجدار بھی تھا۔

حیرہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فن تحریر کو رواج دینے میں یہی رہنمائے اولین تھے، کیونکہ اہل حجاز نے اس فن کو حیرہ یا انبار ہی سے حاصل کیا تھا اور پھر جب ایک صدی بعد خلیفہ ثانی کے عہد میں کوفہ کی بنیاد قائم ہوئی، تو یہ فن وہاں بھی رائج ہو گیا۔ جسے آج بھی کوئی خط سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے قبل اس مسئلہ میں اختلاف تھا کہ عربوں میں فن تحریر کا رواج کب سے ہوا اور بعض لوگ اس کی قدامت ثابت کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے، لیکن اب یہ واقعہ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ قدیم ترین عربی تحریریں وہ ہیں، جو عہد رسالت سے ایک صدی قبل لکھی گئی تھیں۔ اس سے پہلے کسی

تحریر کا پایا جانا یا اس فن کا رائج ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قبل اسلام کی جو تحریریں پائی گئی ہیں، ان میں قصاید کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو اظہارِ تفاخر میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا اس لئے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ عہد رسالت سے پہلے ایام جاہلیت میں مذاق شعری، اعراب میں پوری طرح پایا جاتا تھا اور سوسائٹی کا پورا طبقہ ایسا نہ تھا، جو اس سے متاثر نہ ہو، چنانچہ قبیلہ ہذیل کی نظموں کا مجموعہ یا حماسہ وغیرہ کافی شہادت اس امر کی ہے۔

علم الانساب بھی، حسب بیان شہرستانی، ان میں رائج تھا، لیکن جہاں تک معلوم ہوتا ہے اس کی طرف پوری توجہ حضرت عمر کے عہد سے ہوئی، جب مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کرنے کے لئے اسم نویسی کی ضرورت لاحق ہوئی، اس سلسلہ میں بلاذری کی انساب لاشراف خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

علاوہ شاعری اور علم الانساب کے اہل عرب میں قبل ظہور اسلام قصہ گوئی کا بھی کافی ذوق پایا جاتا تھا۔ چنانچہ ابو عبیدہ عہد جاہلیت کے مشہور اور بے نظیر داستان گو سمجھے جاتے تھے۔

جب آنحضرت نے تبلیغ اسلام شروع کی تو بنی مصلاب کا راسخا آپ کو کڑا پڑا، وہ سب پر نظر ہے اور ایسی صورت میں جبکہ لاکھوں افکار آپ کے پیش نظر

تھے، علوم و فنون کی طرف کوئی توجہ نہ ہو سکتی تھی، تاہم جب آپ کے پیش نظر کوئی ایسا موقع آیا تو آپ نے ضرور فائدہ اٹھایا، چنانچہ اپنے بزرگ قیدیوں کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ پھر اسکے ساتھ اگر رسول اللہ کی احادیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کن کن طریقوں سے لوگوں کو علوم و فنون سکھانے کی طرف رغبت دلائی ہے۔ رسول اللہ کے بعد خلیفہ اول کا عہد شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت کم رہا۔ خلیفہ دوم نے نسبتاً طویل زمانہ پایا، لیکن آپ کو حکومت اسلام کی بنیاد ہی استوار کرنے سے فرصت نہ ملی تھی کہ قدرت نے اس عجیب و غریب مہستی کو اپنے پاس بلالیا۔ خلیفہ ثالث کا عہد بے شک طویل تھا، لیکن آپ کی صداقت اور نیکی سے لوگوں نے اس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا کہ آخر کار اندرون ملک میں انتشار و افراق کی آگ مشتعل ہو گئی، جس کی چنگاریاں صدیوں بعد تک تمام اکناف عالم میں اڑتی رہیں۔ خلیفہ چہارم نے باوجود اسکے کہ حد درجہ برامنی کی حالت میں عثمان خلافت ہاتھ میں لی اور حکومت اسلام کے دو حصے آپ کے عہد ہی میں ہو گئے، تاہم آپ علم کی طرف سے غافل نہیں رہے اور آپ ہی کے اشارہ سے الاسود الدؤلی نے زبان عربی کو صحیح لکھنے اور صحیح پونے کے قواعد مرتب کئے۔ اس کے بعد خلیل نے علم عروض کے قواعد مرتب کئے اور آخر کار بصرہ و کوفہ مسلمانوں کی ادبی تحریکات کا مرکز ہو کر اُٹھے جن سے کسائی اور سیبویہ کی مشہور ہستیوں کو کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔

عہد بنی امیہ کے ساتھ ہی حکومت اسلام کا رنگ بدل گیا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مذہبی حکومت، عہد بنی امیہ جو خلفائے راشدین کے عہد میں پائی جاتی تھی، مفقود ہو گئی اور اس کے بجائے دنیاوی جاہ و جلال کے مناظر ہر طرف نمودار ہونے لگے، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ بنو امیہ نے ترقی تعلیم و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی حقیقتاً انصاف کا خون کھینچ

اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ”اسپرٹ آف اسلام“ کے مصنف نے کیونکر ایسا غلط الزام بنو امیہ پر لگا کر اپنی عصبیت کو اس بُری طرح سے ظاہر کرنا پسند کیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خاندان بنی امیہ کے بعض افراد (مثلاً ولید ثانی، یزید ثالث اور مروان ثانی) ایسے تھے جن پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے، لیکن کیسا سریخ ظلم ہے کہ ان بعض افراد کے حال پر قیاس کر کے سارے خاندان بنی امیہ کی نسبت تو یہ حکم لگا دیا جاتا ہے لیکن خاندان بنی عباس میں (جس کی علم پروری کے افسانے اس قدر مشہور ہیں) مستنجد اور مقتدر کے واقعات کو پیش نظر رکھ کر سارے خاندان عباسیہ کو علم و تہذیب کا دشمن قرار نہیں دیا جاتا۔

امیر معاویہ، جو خاندان بنی امیہ کے موسس اولین ہیں (اُن کی نسبت خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے) لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ بڑے دل والے اور سیر چشم آدمی تھے۔ آپ نے اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ جس سلوک کو رد کر رکھا اگر اس کو بازنطائن فرمانروایان کے طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ امیر معاویہ کس قدر فراخ دل رکھتے تھے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ آپ ہی نے ایک مسیحی طبیب ابن اثل کو اپنے دربار میں بلا کر حکم دیا تھا کہ طب کی کتابیں، عربی میں ترجمہ کرے اور آپ ہی نے عابد کو صفار سے طلب کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہانِ مین کی تاریخ کو ایک جگہ کتابی صورت میں محفوظ کر دے۔

امیر معاویہ کا بیٹا اور جانشین، یزید بھی اچھا شاعر تھا اور شعراء کی قدر کیا کرتا تھا اور خالد بن یزید کو تو علوم کی طرف خاص شغف تھا چنانچہ اُس نے متعدد آدمی متعین کئے تھے کہ وہ مختلف کتابیں، عربی زبان میں منقل کریں اور اگر ابنِ ندریم اور ابنِ ابی عصبیہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے، تو خالد کے اکتسابات علمیہ کا درجہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

عمر ابن عبدالعزیز، مقرر کے گورنر ہی تھے کہ یونانی علوم کی طرف آپ کو توجہ ہوئی، چنانچہ ابنِ الجبر سے جو اسکندریہ میں یونان کے علوم فلسفیہ کا بہت بڑا ماہر تھا، آپ نے ملاقات پیدا کی اور یہ مراسم اس حد تک مستحکم ہو گئے کہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ابنِ الجبر کو سارے محکمہ حفظانِ صحت کا منظم بنا دیا۔

ابن ابی عصبیہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کے عہد میں یونان کے بہت سے علوم و فنون مقرر سے انطاکیہ اور حران میں منقل ہوئے اور وہاں سے دیگر بلادِ اسلامی میں۔

ہشام بن عبدالملک، اک اعلیٰ درجہ کا محارب ہونے کے ساتھ ہی جیسا قابل و فاضل خلیفہ تھا، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔ اُس کا وزیر کاتب خصوصی وہی سالم تھا جو اپنے عہد کا بڑا مشہور زبانداں تسلیم کیا جاتا تھا اور جسے ارسطاطالیس کی متعدد کتابوں کو عربی زبان میں منقل کیا۔ سالم کے بیٹے جب نے بھی متعدد تاریخی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

ابنِ ندریم نے بیان کیا ہے کہ اکا سرہ عجم کا جو علمی خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا اس میں ایک تاریخِ ایران بھی تھی جو نہایت بسیط و مفصل ہونے کے علاوہ مصور بھی تھی، چنانچہ خلیفہ ہشام نے ۱۱۳ھ میں اس کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ جسے مسعودی

نے خود بمقام امپراطور ۳۰۳ھ میں دیکھا تھا۔

عبدالقاسم حماد، جس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بار ایک نشست میں ۲۹۰۰ قصیدے شعراء جاہلیت کے سنا دیے، ولید ابن عبدالملک اور ہشام ہی کے دربار کا شخص تھا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھیں خلفاء کی کوشش تھی جس نے قدیم شعرا کے کلام کو محفوظ رکھا ورنہ آج ایک الفاظ بھی عہد قدیم کے لٹریچر کا نظر نہ آتا۔

ہر چند ہشام کے ساتھ ہی عہد بنی امیہ کے عروج کا بھی خاتمہ ہو گیا، تاہم اس وقت تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ بھی کم نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد کو بنو عباس نے اپنی عمارت قائم کی اور اگر اسی کے ساتھ اسپین کی اموی خلافت قرطبہ کو بھی سامنے رکھا جائے جس نے قرون وسطیٰ میں اپنے علم و تہذیب کے کارناموں سے دنیا کو متحیر کر دیا، تو شاید خاندان بنی امیہ کے احسانات علمیہ کا کوئی استقصاء ہو ہی نہیں سکتا۔

عہد بنی عباس جب بنو عباس کا عہد شروع ہوا، تو انھوں نے عہد بنی امیہ کے علمی باقیات الصالحات کو نہ صرف محفوظ رکھا، بلکہ اس میں ترقی پیدا کرنے کی کوشش تمام کی۔ چونکہ حکومت بنی عباس کے اصول بنو امیہ سے الگ تھے اور ان کے امیال و عواطف زیادہ تر عجمی عنصر سے متعلق تھے اس لئے ان کوششیں بھی جدا تھیں اور علمی مساعی کے حدود بھی بنو امیہ سے ذرا مختلف تھے۔

اس زمانہ میں نہ صرف تاریخ پر توجہ کی گئی، بلکہ علم الفقہ، فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ کی طرف بھی کافی اعتناء کیا گیا اور چونکہ اس عہد میں یونانی تہذیب کے ساتھ عجمی مذاق بھی مل گیا تھا، اس لئے انھوں نے شائستگی کی طرف نہایت سرع قدم اٹھایا لیکن اسی کے ساتھ انحطاط و زوال کے وہ جراثیم بھی پیدا ہو گئے جو دنیاوی جاہ و جلال، مادی دولت و ثروت اور انسانی تہذیب شائستگی کے اجزاء لازم ہیں اور جنہوں نے آخر کار دولت عباسیہ کا شیرازہ منتشر کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا فرود گذشتہ نہیں کیا۔

عرب میں، یونانی علوم و فنون کا رواج تین ذرائع سے ہوا۔ اسکندر اعظم کے وقت سے وجہ و فرات کے درمیان کا حصہ تمام تر یونانی تہذیب سے متاثر تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ اسپارٹا کے دربار میں گراسس کی موت کی خبر پہنچی، تو اس وقت وہاں یورپس (یونان کا نہایت مشہور شاعر و ڈراما نگار) کا ایک ڈرامہ جو ٹریجڈی سے متعلق تھا، دیکھا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ۷۰ھ میں ساسانی بادشاہ خسرو انوشیروان نے خوزستان میں جند شاپور کے مقام پر ایک اکیڈمی (مجلس علمیہ) قائم کی، جو ساسانی حکومت کے زوال کے بعد بھی تین صدی تک قائم رہی۔ یہاں یونانی طب و فلسفہ کی بھی تعلیم دیتا تھا۔

اس کے بعد شامیوں نے دو آب و جہ و فرات میں عربوں کے اندر یونانی فلسفہ کا مذاق پیدا کیا اور یہ مذاق ان میں اس حد تک

رچ گیا کہ مذہب عیسویت کے متعلق جو خیالات انھوں نے قائم کئے وہ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس طرح حکومت بازنطائین نے جو فائدہ اس سے اٹھایا وہ تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے۔

چونکہ حکومت بازنطائین کے زیر اثر، یونانی اور رومن حکماء سے اہل عرب کو تبادلہ خیالات کا بہت موقع ملتا تھا، اس لئے وہ اقلیدس، افلاطون اور ارسطاطالیس کی کتابیں عام طور سے پڑھتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ علاوہ اسکے انطاکیہ اور موصل کے درمیان شامی عیسائیوں کی جماعتیں خانقاہوں کے اندر یونانی کتابیں عربی میں منتقل کر رہی تھیں، اور اس طرح علوم یونانی کے ساتھ ساتھ مسیحی خیالات بھی آہستہ آہستہ عربوں میں پھیلتے جاتے تھے۔

حران کے رہنے والے (شام کی یہی جماعت ایسی تھی جو اپنے اصلی مذہب پر قائم رہی) بھی خاص ذریعہ ہیں جن سے عربوں نے یونانی تہذیب کو حاصل کیا، چونکہ اہل حران، عربی زبان نہایت اچھی جانتے تھے اس لئے جو تراجم ان کے ذریعہ سے ہوئے وہ نہایت مکمل تھے۔

خاندان عباسیہ کے عروج کا بنیادی پتھر منصور نے رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے عہد میں زبان عربی کو بہت ترقی حاصل ہوئی، سیبویہ، کسائی، خلیل اسی عہد کے درخشندہ گوہر تھے اور اسی نے کسائی کو اپنے بیٹے مہدی کی تعلیم کے لئے، حیثیت اتالیق مقرر کیا تھا۔ اُصمتی بھی اسی زمانہ میں ہوا ہے، جو اپنی قوت حافظہ کے لحاظ سے تاریخ عرب کی ایک نہایت ہی شہرہ رکھتی ہے۔ ذہبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۳ھ میں علماء اسلام نے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں مدون کرنا شروع کیں۔ چنانچہ ابن جریر، مکہ میں اور امام مالک (صاحب موطا) مدینہ میں، اوزاعی، شام میں، ابن ابی عروہ، حاد، ابو سلمہ، بصرہ میں، معمر، یمن میں اور ثقیان، انشوری، کوفہ میں مصروف تصنیف و تالیف تھے۔

جب ۱۷۸ھ میں خلیفہ منصور، بیمار ہوا اور اُس کے دربار کے اطباء نے جواب دیدیا، تو اُس نے جارج کو جو جند شاپور کی مجلس علمیہ کا مہتمم تھا، طلب کیا اور اس کے علاج سے فائدہ ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد سے دربار خلیفہ میں متعلقین اکیڈمی کا اثر قائم ہو گیا اور بعد کو جارج کا پوتا (جبریل) ہارون الرشید کے دربار کا طبیب خاص مقرر کیا گیا۔

منصور کے عہد میں ایک اور شخص ابن مقفی بھی تھا، جو عربی اور فارسی کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ اس نے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ عربی زبان میں کر کے سب سے پہلے عربوں میں رومان کا مذاق پیدا کیا، جس کی ارتقائی صورت الف لیلیٰ نظر آتی ہے۔ ابن مقفی نے شاہنامہ کا ترجمہ بھی عربی میں کیا اور یہی وہ تصنیف تھی جو بعد کو شاہنامہ فردوسی کی بنیاد قرار پائی۔

معقولات کو جن کی ابتداء حسن بصری سے ہوئی تھی، ابتداء عہد عباسیہ میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور خلیفہ منصور نے غیر مذاہب کی کتابوں کا بھی ترجمہ عربی میں کرایا، چنانچہ تعلیمات مانی کی کتابیں بھی اسی عہد میں ترجمہ کی گئیں۔ اسکے علاوہ سنسکرت کی کتابوں پر بھی توجہ کی گئی، جن میں سے ایک سدھنتا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت، معقولات کا رواج زیادہ ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ معقولات کو بھی پیشیت

نہیں ڈالا جاسکتا تھا اور ان کا اثر اس قدر قائم تھا کہ مامون بھی خلقِ قرآن کے مسئلہ کو عام طور سے رائج نہ کر سکا۔
 عہد عباسیہ کے ابتدائی دس سال کے اندر علمِ اقلیہ شروع ہو کر مرتب ہو گیا، عہد منصور میں ابو حنیفہ، عہد ہارون میں مالک و شافعی اور عہد مامون میں احمد ابن حنبل وہ ہستیاں تھیں جن سے آج بھی ہر مسلمان اچھی طرح واقف ہے۔ خلیفہ مہدی کا زمانہ چنداں قابلِ ذکر نہیں، کیونکہ اس نے علوم عقلیہ کی سخت مخالفت کی، لیکن اس کے بعد ہارون نے اس کی بہت کچھ تلافی کر دی۔
 ہارون نے اک بیتِ الحکمہ ہی صرف اس لئے قائم کیا تھا کہ وہاں نہ صرف پہلی کتابیں محفوظ رہیں بلکہ اور جدید تصانیف، مختلف علوم کی شائع کی جائیں۔ فضل ابن نوبخت کو فارسی کتابوں کا مہتمم بنایا گیا، اور وہ یونانی کتابیں جنہیں ہارون، ایشیائے کوچک کی طرف سے لایا تھا، یوحنا ابن ماسویہ کے سپرد کی گئیں۔ ہارون الرشید اپنے علم پروری کے لحاظ سے عجیب و غریب خلیفہ گزرا ہے۔ اسی نے ایک ہار سفیان ابن عیینہ کو ایک لاکھ درہم اور اسحاق موصلی کو دو لاکھ درہم بطور علمی انعام کے دیدئے اور یہی وہ خلیفہ تھا، جس نے مروان ابن ابی حفصہ کو صرف ایک نظم کے صلہ میں پانچ ہزار دینار، ایک خلعت زریں، ایک گھوڑا اور دس یونانی کنیزیں ایک وقت میں بخش دیں۔

الغرض اس کا دربار علماء، شعراء، حکماء، فضلاء کا مرکز تھا اور اُس کی قدر دانی علم کی شہرت تمام اطرافِ عالم میں پھیل گئی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ معقولات و منقولات کی تطبیق کا سخت مخالف تھا۔

اس کے بعد جب مامون کا عہد آیا تو مذہبی آزادی زیادہ بڑھ گئی اور اس نے خلقِ قرآن کے مسئلہ کو خود پیش کر کے علماء عصر کی تصدیق کرائی چاہی، جس میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

مامون، لٹریچر، فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کا بہت بڑا قدر شناس تھا اور اس کے عہد میں علوم اسلامی نے اس قدر ترقی کی کہ اس کی نظیر کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں مل سکتی۔

چونکہ مامون کی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسب تھیں اور علاوہ اس کے اس کا ابتدائی زمانہ مرو میں بسر ہوا تھا جہاں ایرانی تہذیب کے مناظر کثرت سے نظر آتے تھے، اس لئے اُس کے عہد میں ایرانیوں کو بہت درخور حاصل ہو گیا اور اس نے اپنے تمدن کو ساسانی بادشاہوں کے انداز پر قائم رکھنا چاہا، جو بظاہر بہت خوشنما بات تھی، لیکن وہی آخر زوالِ خلافت کا باعث قرار پائی۔

ہارون الرشید کے عہد میں جو بیتِ الحکمہ قائم ہوا تھا، اُس کو مامون نے اور زیادہ ترقی دی اور اُس نے قیصر روم کے پاس سے یونانی کتابیں منگو کر عربی میں اُن کا ترجمہ کرایا۔ حنین اور یعقوب کندی مخصوص طور پر یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے، ان کے علمی کارنامے اس قدر ہیں کہ اُن کے ظاہر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

مامون کو علم ہیئت و نجوم کی طرف بھی خاص رجحان تھا، چنانچہ اُس کے اشارے سے یحییٰ ابن ابی منصور المامونی نے جو الزیج الممتحن اور کتاب العمل کا مصنف ہے، بغداد و دمشق کے قریب رصد گاہیں قائم کیں۔ لیکن مامون کی بے وقت موت کی وجہ

سے یہ کام انجام کو نہ پہنچ سکا۔ محمد ابن موسیٰ بن شاہر کا زمین کی پیمائش کی طرف متوجہ ہونا بھی مامون ہی کے حکم سے ہوا تھا۔ مامون کے بعد المعتصم کا عہد شروع ہوا، جو ایک سپاہی مزاج خلیفہ تھا، اس نے علوم و فنون کا وہ سیلاب جو مامون کے عہد میں رونما ہوا تھا، اس کے عہد میں رُک گیا اور تقریباً دس سال تک اسی حالت میں رہا۔

جب ۲۲۷ھ میں واثق سر پر آئے خلافت ہوا تو پھر وہی علمی بیداری ہر جگہ نظر آنے لگی، جو عہد مامون میں باقی بنا، تھی۔ اس کے عہد میں بھی کثرت سے غیر زبانوں کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مذہبی آزادی بہت بڑھ گئی۔ یوحنا ابن ماسوہ اس کا دست راست ہو گیا اور بے شمار انعامات اس نے حاصل کئے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واثق نے اس کو تین لاکھ درہم اٹھا کر دے دئے۔

اس کا جانشین، المتوکل بن حنیفہ ایسا علم دوست نہیں تھا، تاہم ترجمہ و تالیف کا کام اس کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ متوکل کے بعد خاندان عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا لیکن اب بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ علوم و فنون کا جلال رہا یہاں تک کہ شروع سے لیکر زوال خلافت عباسیہ تک بغداد کی سر زمین میں جو کچھ ہو گیا وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو ایک مستقل تصنیف مرتب ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کی تاریخ پانچ دور میں تقسیم ہوتی ہے، اس کا بہترین زمانہ جسے عہد زریں کہنا چاہئے، مامون پر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد دوسرا دور وہ تھا جب جماعت اتر آ کر دوزخ حاصل ہوا، یہ زمانہ ۳۲۲ھ تک قائم رہا۔ تیسرا دور ابھی خاندان کے اثر و اقتدار کا تھا، چوتھا سلاجقہ کی قوت کا اور پانچواں وہ جب انحطاط کی آخری منازل شروع ہوئیں اور آخر کار مغلوں نے آ کر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہر چند ۲۸۱ھ کے بعد سے ۶۵۶ھ تک کا زمانہ انتشار و انشقاق کا ہی تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں قائم ہو کر، وہ مرکزی اقتدار جاتا رہا تھا جو مامون کے عہد تک پایا جاتا تھا، تاہم علم دوستی کا وہ مذاق جو اس سے قبل پیدا ہو چکا تھا، مفقود نہیں ہوا اور جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہیں علوم و فنون کی قدر کی گئی۔

اس لئے اگر آپ خلافت عباسیہ کے سارے عہد کو پیش نظر رکھ کر (جس میں تمام چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بھی شامل ہیں) صرف یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس تمام زمانہ میں کتنے علماء گزرے ہیں تو ان کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم ہو سکتی۔ لیکن اگر صرف مشاہیر و اکابر ہی کو لیا جائے تو ان کی فہرست مرتب کرنے کے لئے بھی اک دفتر درکار ہے۔

فارابی، ابوبکر الرازی، ابوالبشر بوعلی سینا، ابن رشد، غزالی، فخر الدین رازی وغیرہ بہت سی ایسی مشہور ہستیاں ہیں جو اس عہد میں رونما ہوئیں اور اپنے نقوش، صفحات تاریخ پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر گئیں۔

فارابی، ترکستان میں پیدا ہوئے اور مختلف زبانیں انھوں نے حاصل کیں، جس وقت یہ بغداد گئے تو ابوالبشر کے خطبات فلسفہ میں شریک ہوئے اور اسکے بعد قرآن جا کر، ابویحنا، ابن خیلان سے فلسفہ مسیحیت سیکھا، جب وہ بغداد واپس آئے تو یہاں خود فلسفہ کی تعلیم لوگوں کو دینے لگے۔ ان کو فلسفہ کی طرف اس قدر رجحان تھا کہ انھوں نے ارسطو کا لیس کی بعض

بعض کتابیں چالیس چالیس مرتبہ پڑھیں اور پھر بھی اپنی عمر کی طرف سے بیوفائی کی شکایت نہ گئے۔

ان کی بہت سی تصانیف، جو ان کی شہرت کا باعث ہوئیں، بغداد ہی میں لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ دمشق چلے گئے اور وہاں سے مصر۔ مصر سے واپس آنے کے بعد وہ سیدھے شام آئے اور اُس جماعتِ علماء میں داخل ہو گئے جو سیف الدولہ حاکم حلب کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ سیف الدولہ بڑا علم دوست شخص تھا، اس نے اس کی بہت قدر کی اور جب دمشق گیا تو انھیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ابو بشر، منطق میں فارابی کا استاد تھا۔ یہ عیسائی تھا اور بغداد اس کا مسقط الرأس تھا، منطق میں اس کو بڑا تجربہ حاصل تھا اور اسی علم کی خدمت کرتے کرتے اس نے اپنی عمر تمام کر دی۔ طبقات الحکماء میں اس کے تصانیف کی ایک طویل فہرست موجود ہے ابو بکر الرازی، خلیفہ مقتدر کے دربار کا طبیب خاص تھا۔ اس نے چھپک پر اک عجیب و غریب رسالہ لکھا، جو اب لایت میں مع ترجمہ و عواشی کے شائع بھی ہو چکا ہے۔

سامانی فرمانروا، منصور ابن نوح نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی جس کے لئے اس نے رسالہ طب پر المنصور ہی کے نام سے تحریر کیا تھا۔

حکمت عملی کے سلسلہ میں حسن ابن حسین، ابوالوفاء اور ابن یونس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور حکمت نظری کے لحاظ سے غزالی اور فخر الدین رازی اپنے عہد کے بے نظیر علماء میں سے تھے۔ غزالی نے نظام الملک طوسی کی سرپرستی میں ترقی کی اور اس قدر شہرت حاصل کر لی کہ خود اُن کے استاد ابو علی سینا کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہر چند خلفاء عباسیہ کا سیاسی اقتدار امتدادِ زمانہ کے ساتھ کم ہوتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ علمی ذوق و شوق میں انحطاط ہو رہا تھا (یہاں تک کہ الرازی باقیہ خلیفہ تھا جس نے ممبر پر کھڑے ہو کر قابل ذکر خطبہ دیا اور اپنے دربار و نظام حکومت کے لحاظ سے فی الجملہ خلیفہ کہا جاسکتا تھا) تاہم یہ عجیب بات ہے کہ خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی مختلف خود مختار اسلامی حکومتوں نے علم و حکمت کی قدر دانی کو ترک نہیں کیا۔

اسرالدولہ نے علوم و فنون کی ترقی میں جس قدر حصہ لیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالرحمن مشہور علم ہیئت اسکے دربار کا جوہر تابندہ تھا۔ اسی طرح المنصور سامانی، سیف الدولہ حمادی نے فارابی کی سرپرستی کر کے اپنی فضل شناسی کا جو ثبوت پیش کیا وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نظام الملک طوسی (الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر) سے کون واقف نہیں ہے کہ اُس نے کیسے کیسے اہل کمال کو یکجا کر دیا تھا اور سب جانتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت میں ہمیشہ بہاؤ الدین، قاضی الفضل اور امام الدین کا تب ایسے نفیس رہا کرتے تھے۔

کوئی اسلامی حکومت ایسی نہ تھی جہاں کتب خانے اور دارالعلوم کثرت سے قائم نہ ہوئے ہوں اور ہر حکومت دوسری حکومت سے اس میں بڑھ جانے کی کوشش نہ کرتی ہو۔

بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق، مصر اور ادھر سارے عجم میں گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں اہل کمال کے فضلاء خطبات سے گونجا کرتی تھیں اور ممالک اسلامی کے ذرے ذرے سے علم و فضل کا دریا اُبل رہا تھا۔

کیا بصرہ کی تاریخ، واصل بن عطاء اور جماعت اخوان الصفا کو کبھی فراموش کر سکتی ہے؟ کیا وہاں کی مسجدیں اس لذت کو کبھی فراموش کر سکتی ہیں کہ علم و ادب، فلسفہ و ریاضی، ہدیت و نجوم کے کیسے کیسے اہم مسائل انھیں کی چار دیواریوں کے اندر حل ہوتے تھے؟ کیا قدیم قاہرہ، جامع الازہر پر بجا طور سے فخر نہیں کر سکتا جہاں سے ہزاروں ہستیاں فضل و کمال کا بہترین طرہ امتیاز حاصل کر کے باہر نکلیں؟

کیا مسجد دمشق اُن واقعات کو بھول سکتی ہے کہ ابن ہشام المخزومی روزانہ وہاں علمی مباحث جاری رکھتے تھے؟ کیا کوفہ کی مسجد سلمیٰ کے اُن دروس قرآنی کو بھول جائے گی، جن سے روزانہ اس کے درو دیوار گونجا کرتے تھے؟ اور کیا کوئی شخص دارالعلوم نظامیہ اور مستنصریہ کو کبھی فراموش کر سکتا ہے؟ یہ حال تھا خاص خاص درسگاہوں کا ورنہ یوں تو ممالک اسلامی میں استفادہ کثرت سے مدارس جاری ہوئے کہ آج کوئی اُن کا شمار بھی نہیں کر سکتا پھر اس کے ساتھ جب آپ اس حقیقت پر غور کریں گے کہ شوق علمی صرف مردوں ہی میں نہ تھا بلکہ عورتیں بھی اس میں حصہ دار تھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی لہریں ممالک اسلامی کے مخفی ترین حصوں میں دوڑ گئی تھیں اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ان سے فیضیاب نہ ہو۔

ازراویہ کا دارالحکمت، نورالدولہ کی بیٹی ہی نے قائم کیا تھا اور دمشق میں بھی دو اکیڈمی ایک خاتون ہی نے قائم کی تھیں جس کا نام ست اشم تھا۔

مصر میں فاطمین اور فرمانروایان مملوک نے بھی خاندان عباسیہ سے کم علم کی قدر دانی نہیں کی۔ علامہ سیوطی نے حکومت مصر حسن الحافریہ میں تفصیل کے ساتھ اس عہد کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ المفرد اور اس کے بعد تین فرمانرواؤں نے ترقی علم و تہذیب کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں اور بعض اوقات تو خلفاء فاطمین کے مساعی اس باب میں خلفاء عباسیہ سے بھی سبقت لے گئے۔ چنانچہ الحاکم بامر اللہ کا قائم کردہ دارالحکمت، تمام اسلامی ممالک کے مدارس سے زیادہ وسیع تھا۔

اسپین کی حکومت اسلام پر جب آپ مورخانہ نگاہ ڈالیں گے، تو یہاں بھی آپ کو عجیب و غریب علمی مناظر نظر آئیں گے۔ حکومت اسپین اور آپ کو حیرت ہوگی کہ کیونکر ایسے دور و دراز ملک میں پہنچ کر مسلمانوں نے اس قدر ترقی کر لی اور کس طرح انھیں مسیحی دشمنوں کے درمیان رہ کر اس قدر فرصت نصیب ہوئی کہ علوم و فنون کو بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسپین کا مشہور مصنف، ابن سعید لکھتا ہے کہ ”قواعد اور علم بیان اور معانی میں، اونس والوں کو اس قدر انہماک تھا، کہ انھوں نے فلیل اور سیویہ کے عہد کو بھی شرمادیا“ پھر اسی کے ساتھ دیگر فنون میں بھی انھوں نے کم ترقی نہیں کی۔

ابن زہری کی کتاب لتیسیر (جو علم طب کی بے مثل کتاب ہے اور جس کا ترجمہ اب یورپ کو تمام زبانوں میں ہو چکا ہے) زہرا دی کی تصنیف فن تشریح پر، یحییٰ کی کتاب علم الادویہ پر، دولت بہرہ کی عہد حکومت کے خاص کارنامے ہیں۔

حکم ثانی کے زمانہ کو دیکھئے تو معلوم ہو سکتا ہے، کہ اس وقت علم کا کیسا چرچا تھا۔ یہ کتابوں کا حد درجہ شایق تھا اور اُسے تمام ممالک مشرق میں آدمی بھیج بھیج اس قدر نادر نسخے فراہم کئے تھے، کہ اُن کی فہرست صرف چالیس جلدوں میں مرتب ہوئی تھی ابن بابہ اور ابن رشد اُسی کے عہد میں رونما ہوئے جن کے علمی کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

اسپین کے مسلم عہد حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عورتیں حد درجہ مہذب و شائستہ ہو گئی تھیں۔ ولادہ (المستکفی کی بیٹی) اپنے عہد کی بڑی زبردست شاعرہ تھی اور علم بیان و روانی میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی، اسی طرح عائشہ (شاہزادہ احمد کی بیٹی) اس قدر فاضلہ تھی کہ اُس کے خطابات، قرطبہ کے دارالعلوم میں پڑھے جاتے تھے اور لوگ اُن سے مضاحت و بلاغت کا درس لیا کرتے تھے۔ یہ حال طبقہ امراء کی عورتوں کا تھا لیکن معمولی طبقہ بھی اس سے محروم نہیں تھا۔ چنانچہ لبنی، قرطبہ کے ایک معمولی خاندان کی لڑکی تھی، لیکن ادب و فلسفہ میں مشکل سے کوئی مرد بھی اُس کے سامنے بروئے کار آ سکتا تھا اور خلیفہ حکم نے اس کے انھیں اکتسابات بلند کو دیکھ کر اپنے پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ دیدی تھی، جو اس سے قبل و بعد کبھی کسی عورت کو نصیب نہیں ہوئی اسی طرح ایک خاتون، مریم (یعقوب بلال انصاری کی لڑکی) تھی جو ادب و شعر کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتی تھی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ہسپانیہ میں، اس وقت ستر کتب خانے موجود تھے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان فرمانرواؤں کو علم کا بہت ذوق تھا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذاق علم وہاں پبلک میں بھی عام ہو گیا تھا۔ یہ تھا کہ عام تبصرہ مسلمانوں کے ذوق علمی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے کارنامے کیا کیا تھے اور شاہان اسلام کی سرپرستی میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوئے اور علوم و فنون کا کیسا معتد بہ ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

حاجی خلیفہ نے بارہ سو، صرف تاریخی کتابوں کا نام اپنی فہرست میں درج کیا ہے اور اس میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جن کا پتہ اُسے نہیں مل سکا۔

مورخ ابن ہشام سے لیکر (جو خلیفہ منصور کے عہد میں پائے جاتے تھے) ابن خلدون کے زمانہ تک (جو تیمور کا ہم عصر تھا) جتنی تاریخی کتابیں مدون ہوئی ہیں، اگر آج وہ سب دستیاب ہو جائیں تو کئی کتب خانے صرف تاریخ کی کتابوں سے بھر سکتے ہیں۔ تمام مورخین میں سے آج بھی صرف طبری، ابن اثیر، مسعودی، بلاذری، ابن قتیبہ، خلدون، ابن خلکان وغیرہ کے چند نام معلوم ہیں، اور نہیں کہہ سکتے کہ اور کتنے تھے جن کے کارنامے آج دنیا کے سامنے موجود نہیں۔

اسی طرح فرج جغرافیہ میں ہمیں ابن خردادبہ، حماد، مقدسی، یاقوت، ابوالفداء وغیرہ سے اور دیگر علوم میں بھی صرف مخصوص افراد سے آگاہی حاصل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف علوم اسلامی کی مفصل تاریخ لکھنے بیٹھے تو باوجود اس کے کہ لاکھوں کتابیں منقود ہو گئی ہیں، ہزاروں مصنفین کے نام و ناموں سے محو ہو گئے ہیں، اپنی پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی وہ اس فرض سے عہدہ برائ نہیں ہو سکتا۔

حکومت اسلام اور سنسکرت

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں پہلا وہ شخص جس نے سنسکرت حاصل کی، فیضی تھا، لیکن درست نہیں۔ آکبر نے جس فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ، علوم و فنون کو قدر کی اور جس بے تعصبی کے ساتھ اس نے اپنی ہندو رعایا کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی، اس کا اقتضا یہ نہیں تھا کہ صرف فیضی ہی سنسکرت کی طرف توجہ کرتا۔ یہ واقعہ ہے کہ دربار اکبری میں متعدد نفوس ایسے تھے، جو سنسکرت کے عالم خیال کئے جاتے تھے، اس لئے اولیت کا فخر فیضی کے لئے مخصوص کر دینا حسن ظن سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔

ان لوگوں کی فہرست میں، جنہوں نے عہد اکبری میں، سنسکرت کی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، علاوہ فیضی کے عبدالقادر، نقیب خاں، ملا شاہ محمد، سلطان حاجی، حاجی ابراہیم وغیرہ کا بھی نام نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں کہیں اس نوع کے ترجمہ کا ذکر آیا ہے وہاں مورخین نے یہی لکھا ہے کہ ”ہندی سے ترجمہ کیا گیا“، لیکن ادنیٰ غور سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندی سے مراد ان کی سنسکرت تھی۔ ملا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ عبدالقادر نے متعدد کتابوں کا ترجمہ، ہندی سے فارسی میں کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی محقق ہے کہ انہوں نے راماین اور سنگھاسن تنجی کا ترجمہ کیا تھا اور اس لئے اغلب گمان یہی ہے کہ وہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان ہی سے کیا گیا ہوگا۔

عبدالقادر اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ مہا بھارت کا ترجمہ بھی ہندی سے فارسی میں کیا گیا تھا، بدایونی کا بیان ہے کہ کچھ ترجمہ انہوں نے کیا اور کچھ نقیب خاں نے۔ فرشتہ، فیضی کی طرف منسوب کرتا ہے (سیر المتاخرین میں مہا بھارت کے ترجمہ کو بدایونی سے منسوب کیا ہے، یہاں بھی قیاس یہی چاہتا ہے کہ اصل سنسکرت زبان سے ترجمہ ہوا ہوگا۔ دوسری جگہ بدایونی نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کر کے اتھروید کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے ملا عبدالقادر نے عذر پیش کیا۔ اور ابراہیم سرہندی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان سے کیا جاتا تھا اور نہ اس قدر اشکال پیش آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے حضرت ابیر خسرو نے عشیقہ اور شادی میں سپہر میں صاف طور

پر ظاہر کر دیا ہے کہ ہندی سے مراد سنسکرت زبان تھی جس میں خود انھیں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔
یہ ذکر تو عہدِ اکبری کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بہت قبل سنسکرت سے آشنا ہو چکے تھے اور
اس زبان کی طرف انھیں بہت پہلے سے توجہ تھی۔

عہدِ مامون الرشید میں، جو علمی نقطہ نظر سے مسلمانوں کے انتہائی عروج کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے، جبر و مقابلہ میں
محمد بن موسیٰ کار سالہ اور فن طب پر متعدد رسائل سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ اگر زیادہ غور و تامل سے کام
لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے بھی قبل چرک اور سنسکرت کا ترجمہ عربی میں ہو چکا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں میں
ہندوستانی طب کی طرف بہت پہلے سے خیال تھا۔

علاوہ اس کے ابتدائے عہدِ خلافت میں نجوم، موسیقی، ہیئت، علم التعمیر، علم الاصلنام، مذہب، زراعت، سمیات
قیافہ، فراست الید وغیرہ کے بہت سے رسائل سنسکرت زبان سے عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔

اگر مخصوص طور سے ہندوستان ہی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کے قدم اچھی طرح
جھے بھی نہ تھے کہ انھیں یہاں کے علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی کے حالات سے دنیا
واقف ہے کہ اس نے ہندوستان کی زبان اور یہاں کے علوم کو اس قدر محنت کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ وہ نہایت قلیل
زمانہ میں سنسکرت کی نہایت دقیق کتابوں کا ترجمہ عربی، فارسی میں اور عربی، فارسی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں
نہایت آسانی سے کرنے لگا۔ محمد بن اسرائیل التستوخی نے ہندوستان کا سفر ہی صرف اس لئے کیا تھا کہ وہ یہاں کے علم نجوم کو
حاصل کرے۔

جب فیروز شاہ تغلق کو تسخیر نگر کوٹ کے سلسلہ میں سنسکرت کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تو اس نے حکم دیا کہ فلسفہ پیشینگوئی
اور شگون کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے۔ چنانچہ عزالدین خالد خانی نے اس کی تعمیل کی اور اس مجموعہ کا نام دلائل فیروز شاہی
رکھا۔ اسی کے بعد اس نے ہیئت کی ایک کتاب سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کی۔

ایک اور کتاب فن بطرہ پر سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی گئی۔ جس کے دیباچہ میں مترجم نے لکھا ہے کہ ”یہ کتاب غیاث الدین
محمد شاہ خلجی کے حکم سے ۷۱۳ھ میں ترجمہ کی گئی“ بغداد میں اس سے قبل ایک کتاب اسی فن پر سنسکرت سے ترجمہ
ہو چکی تھی، جس کا نام کتاب البیطرہ تھا۔

صاحبِ مجمل التواریخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے قدیم فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں دیکھا جو
۷۱۳ھ میں کسی دینی سردار کے حکم سے ابو الحسن علی بن محمد الجلی نے کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے اندر ادایت کا فخر فیضی کو حاصل نہیں ہے۔
بلکہ اس سے بہت قبل قرونِ اولیٰ میں عربوں کو اس طرف توجہ ہو گئی تھی۔

عجم کے کارنامے اسلام کے عہدِ زریں میں

اگر خالص مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی معنی میں اسلام کا عہدِ زریں تو وہی تھا جب تک ہانی اسلام اس عالم آب و گل میں بقید حیات رہے لیکن اگر اس خیال سے قطع نظر کر کے علوم و فنون کے ارتقاء، مدنیت و حضارت کے عروج کو پیش نگاہ رکھا جائے، تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ زمانہ ۱۳۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب عہدِ عباسیہ کا اولین فرمانروا خلیفہ رونما ہوا اور پوری ایک صدی کے بعد ۲۳۲ھ پر ختم ہو جاتا ہے، جب قدرت نے عنانِ خلافت، متوکل (دسویں خلیفہ) کے سپرد کی۔

جن لوگوں نے تاریخ کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد صرف ایرانی النسل لوگوں کی مدد سے قائم ہوئی اور انھیں کی اعانت و مشورت نے اس خاندان کی حکومت کو انتہائے عروج تک پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بنو امیہ نے نہایت اہتمام و شان کے ساتھ حکومت کی، فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا، اور اسلام میں مادی دولت کا بھی کافی اضافہ ہوا، لیکن بنو امیہ کی حکومت خالص عربی النسل لوگوں کی حکومت تھی، اور چونکہ اعراب، فطرت سے درشت و خشن طبیعت لیکر آئے تھے، اس لئے باوجود بنو امیہ کی وسعتِ فتوحات و ملک گیری کے ان کی طبائع میں وہ لچک پیدا نہیں ہوئی جو حضارت و تمدن کے لئے ضروری ہے اور جس سے یہ لوگ بالکل نا آشنا تھے۔

جب بنو عباس کی خلافت کے ساتھ ساتھ، ایرانی اثر نظامِ حکومت میں غالب ہوا اور عربوں کا اقتدار کم ہونے لگا تو تمام وہی خصوصیات جو کسی وقت اکا سرکہ عجم کی حکومت میں پائی جاتی تھیں، آہستہ آہستہ ان میں بھی پیدا ہونے لگیں، علوم و فنون کی طرف توجہ، تمدن و معاشرت کے لوازم کی فراہمی، ظاہری شان و شوکت، معاشرت کی رفعت و پاکیزگی، مذہبی وسعت نظر، یہ سب وہ باتیں تھیں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئیں۔ آلِ برمک نے دربارِ خلافت میں جو اثر اپنا پیدا کر لیا تھا وہ حقیقتاً ایک انتقام تھا ۱۳۶ھ برمک حقیقتاً کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ یہ ایک لقب تھا جس سے بلخ کے مشہور تشکدہ لوبہار کا محافظ پکارا جاتا تھا، مسعودی کا بیان ہے کہ وہ شخص، جس کے سپرد یہ خدمت ہوتی تھی، بے انتہا معزز و ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اور جو دولت، ہدایا کی صورت میں جمع ہوتی تھی اس کا بھی انتظام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

جو عجم سرزمین عرب سے لے رہا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی آخری حد کیا ہوتی، اگر درمیان میں ترکوں کی جماعت اس اثر کو ٹٹا کر ہوا کا رخ نہ بدل دیتی۔

ایرانیوں یا آل برک کے اقتدار کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ دربار خلافت، علمی جلوؤں سے معمور ہو گیا اور ایک گروہ ایسے علماء کا پیدا ہو گیا جو نقل و عقل کو مطابق کرنا چاہتا تھا اور جسے اب معتزلہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، معتزلہ نے کیا کیا، کس حد تک انھوں نے اسلام کی خدمت ادا کی، اپنے اخلاق و اصول کے لحاظ سے یہ لوگ کیسے تھے، اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یہاں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر معتزلہ کا وجود نہ ہوتا، تو اسلام فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی نگاہوں سے گر گیا ہوتا اور ایک الہامی دین کی حیثیت سے اس کو نہایت سخت آزار پہنچ جاتا، لیکن ترکوں کے عروج کے ساتھ ہی ایک طرف ایرانیوں کا اثر دربار خلافت سے کم ہو گیا اور دوسری طرف وہ مذہبی و علمی ترقی جو معتزلہ کی وجہ سے ہو رہی تھی دفعتاً رک گئی اور آہستہ آہستہ اس کی جگہ انھیں اصول نے لے لی، جو صرف ایک مسلمان ہی کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں اور جنہیں وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے جو پہلے سے اسلام کا ماننے والا ہو۔

ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ خلافت عباسیہ کی بنیاد ہی ایرانی ہاتھوں سے پڑی، اس لئے اگر اس عہد میں ان کا اثر غالب ہو گیا، ان کو امور سلطنت میں زیادہ درخور حاصل ہو گیا، تو جائے عجب نہیں، کیونکہ خلفائے عباسیہ قدرتی طور سے ان کی پاسداری پر مجبور تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے اہل بھی تھے۔

یوں تو عہد عباسیہ کے اول خلیفہ، سفاح ہی کے وقت سے ایرانیوں کا اثر اور اس کے ساتھ ان کی روشن خیالیاں نمایاں ہو چلی تھیں، لیکن اس کا شباب خلیفہ مامون کے عہد میں آیا جس کی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں، ہر چند خاندان برک قریب قریب بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ لیکن ایران کا دوسرا خاندان اور موجود تھا، جس نے اس کی جگہ لے لی اور عربوں کو جو

(بقیہ فط نوٹ صفحہ ۱۳۱)

قریبی نے بھی آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ترک اور ایرانی اس آتشکدہ کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ آتشکدہ کی لمبائی اور چوڑائی سو سو ہاتھ تھی اور بلندی اس سے کچھ زائد۔ اس کی حفاظت برآمدہ کے سپرد تھی، ہندوستان اور چین کے بادشاہ بھی یہاں آتے تھے اور برک کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر پرستش میں مصروف ہوتے تھے۔ یہ آتشکدہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب حضرت عثمان غنی کے عہد میں خراسان فتح ہوا۔ اس وقت خالد کا باب یہاں کا برک (یعنی مٹی) تھا۔ ۵۲۔ اس کا نام پوران تھا جو حسن بن سہل کی بیٹی اور فضل بن سہل (مامون کے وزیر) کی بھتیجی تھی۔

ابن خلکان اور ثعالبی نے تفصیل کے ساتھ اس شادی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمدن و معاشرت ارتقاء کے کس درجہ پر تھے۔ اور نمود و نمائش، شان و شوکت کس حد تک پہنچ گئی تھی۔

مامون کی ماں کا نام مراہل تھا، جو، ہرات کی رہنے والی تھی اور بصورت کیز، ہارون الرشید کے حرم میں داخل ہوئی تھی۔

مامون کے خلاف، امین کی طرف سے ایک قسمت آزمائش کر چکے تھے، بدستور دربار خلافت سے الگ ہی رکھا۔

خلیفہ کے بعد سب سے بڑا درجہ وزیر کا تھا اور وہ اس عہد میں قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ عہدِ عباسیہ سے قبل وزیر کا وجود نہ تھا بلکہ اس کے بجائے ایک شخص کا تب یا میسر کے نام سے موسوم ہوتا تھا، جو قریب قریب یہی خدمت انجام دیتا تھا۔ سب سے پہلے عہدِ عباسیہ ہی میں وزیر کا عہدہ ایجاد کیا گیا اور اس کے فرائض مقرر کئے گئے۔

ہر چند عہدہ قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا اور انھوں نے نہایت قابلیت سے اس خدمت کو انجام دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تھا حد درجہ خطرناک۔

چنانچہ ابوسلم جسے امین آل محمد کہتے تھے، جس بُری طرح قتل کیا گیا، تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور ابوسلم سے قبل جو وزیر (ابوسلمہ) تھا، اُسے خود ابوسلم نے سفاح کے حکم سے جس بُری طرح ہلاک کیا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ابوسلم کے بعد ابوالفتح وزیر ہوا اور اس کو بھی خلیفہ نے زہر دیا۔ جب اس پر زہر کا اثر شروع ہوا اور وہ مکرہ سے اُٹھ کر چلا تو خلیفہ نے پوچھا ”کہاں چلے؟“ اُس نے جواب دیا ”جہاں آپ مجھے بھیجنا چاہتے ہیں“

اس وزیر کے بعد آل برمک کا عروج ہوا اور نصف صدی تک اس طائفہ کے ساتھ انھوں نے وزارت کی کہ تاریخ مشکل سے کوئی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے۔ لیکن باوجود اس تمام اقتدار و اثر کے یہ بھی نہایت اعتیاد سے اور ڈرتے ہوئے کام کرتے تھے کہ مبادا اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جائے جس سے اُن پر مجبوری الاصل ہونے کی وجہ سے تعصب کرنے کا الزام عاید ہو۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ابویوب کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ ابوان کسریٰ کو منہدم کر کے اُس کے سامان سے دوسرا قصر طیار کرائے۔ جب خالد بن برمک سے ذکر آیا تو اس نے کہا کہ ”امیر المومنین، ایسا نہ کیجئے کیونکہ اس کو قلعہ رکھنا حقیقہً شام اسلام کے نشان اقبال کو قائم رکھنا ہے۔ آئندہ نسلیں جب دیکھیں گی تو کہیں گی کہ کیسی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں، علاوہ اس کے یہ وہ مکان ہے جہاں علی ابن ابی طالب نے نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر یہ باتیں قابلِ لحاظ نہ ہوں تو بھی اس کا مسامحہ کرنا اقتصادی نقطہ نظر سے مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے برباد کرنے میں جس قدر صرف ہو جائے گا، اس سے کم میں ایک نئی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔“ منصور نے یہ سن کر جواب دیا کہ ”اے خالد جب تو کوئی بات کہتا ہے تو ہمیشہ اس سے

لے اس لفظ کا ماخذ عام طور سے وزیر بتایا جاتا ہے چونکہ انتظامِ سلطنت کا تمام بار اسی عہدہ دار کے ذمہ ہوتا تھا اس لئے اُسے وزیر (بوجہ اُٹھانے والا ذمہ دار) کہتے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ معرب ہے پہلی لفظ وچیر کا جو مشتق ہے وی چیر (فیصلہ کرنا) سے یا گزیر کا جو تالمود میں پایا جاتا ہے، علامہ فخری کا بیان ہے کہ وزیر کا اشتقاق دُز سے بھی ممکن ہے جس کے معنی ہیں جائے پناہ کے۔

ایران کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے۔“

خالد بن سنان کو خاموش ہو گیا اور منصور نے مسامحہ کا حکم دیدیا، لیکن چند دن بعد ہی منصور کو معلوم ہو گیا کہ اسکے توڑنے میں اندازہ سے زیادہ صرف ہو رہا ہے اور خالد کا خیال صحیح تھا۔ اس لئے ایک دن اُس نے خالد سے کہا کہ میں بھی تمہاری رائے سے متفق ہوں اور ایوانِ کسریٰ کی مسامحہ کو میں نے بند کر دیا ہے۔ خالد نے یہ سن کر کہا کہ ”امیر المومنین اب اس کا مٹا دینا ہی مناسب ہے، کیونکہ جب آئندہ قومیں اسے نیم شکستہ حالت میں دیکھیں گی تو کہیں گی کہ خلیفہ منصور اُس چیز کو بگاڑ بھی نہ سکا جس کو ایک قوم نے بنایا تھا۔“ ہر چند خالد کی دونوں رائیں صائب تھیں، لیکن منصور نے کسی پر عمل نہیں کیا۔

الخضر عہدہ وزارت اُس زمانہ میں بے انتہا نازک تھا لیکن باوجود خطرات و خدشات کے ایرانیوں نے اس جگہ کو اتنے سے نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اُن کی تہذیب و معاشرت نے عربوں میں رسوخ حاصل کر لیا۔ پہلے مسلمانوں میں جشن نوروز کا رواج نہیں تھا، لیکن عہد عباسیہ میں ہر شمس سال کے پہلے دن جب آفتاب برج حمل میں جاتا ہے، یہ جشن منایا جاتا تھا۔ خلیفہ ہادی، بارہ دن اور مامون کے عہد میں ایرانیوں کے اثرات انتہائے عروج تک پہنچ گئے تھے اور مامون کے تو اکثر وزراء ایرانی یا ایرانی النسل تھے۔ بغداد میں ایرانی وضع عام ہوتی جاتی تھی۔ نوروز، مہرگان وغیرہ ایرانی تقریبات نہایت اہتمام سے عمل میں آتی تھیں۔ درباری لباس بھی ایرانی تھا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص بغیر قلنسوہ (مخروطی شکل کی لائے سیاہ ٹوپی) کے خلیفہ کے حضور میں آہی نہ سکتا تھا۔ ساسانی بادشاہوں کے بہت سے آداب داخل دربار ہو گئے تھے۔ خلیفہ المتوکل کا ایک سکا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ساسانی لباس میں رہا کرتا تھا۔

پھر یہ ایرانی اثر صرف انتظامی معاملات سلطنت تک محدود نہ تھا بلکہ علوم مذہبیہ میں بھی یہ لوگ صحت اول میں شمار کئے جاتے تھے۔

عہد جاہلیت میں عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے اور انھیں اپنے امی ہونے پر ناز بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شاعری اور فخر انساب اتنی بڑی دولت اُن کے پاس ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے دنیا میں پھر کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اُن کا خیال تھا کہ جو شخص شاعری کے علاوہ کسی اور فن یا علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اپنے حقیقی فرض کو سناٹے کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ جو قوم اپنے تیردکان، نیزہ و تلوار سے کام لینا جانتی ہے اُسے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ اپنے قوم کی پرانی تاریخ ادا اپنے خاندان کے قدیم انساب کو محفوظ رکھے۔

زادہ (جو قدیم ہندی شعراء کی آخری کڑی تھا) لکھنا جانتا تھا، لیکن اس نے ہمیشہ اس حقیقت کو چھپایا، کیونکہ عربوں میں فنِ تحریر کا جاننے والا لنگاہوں سے گرجاتا تھا۔

رسول اللہ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی عربوں کا یہی حال تھا اور وہ مطلقاً تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی کمی تھی، جس کا خیال کر کے رسول اللہ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ ان میں جو لکھنا جانتے ہیں وہ آزاد دیں، بشرطیکہ قریش کے بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ واقعہ کے حوالہ سے بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قریش کے افراد میں سے صرف ۱۷ آدمی لکھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، ابن الجراح، طلحہ، ابوسفیان اور امیر معاویہ بھی شامل تھے۔

ہر خلافت اس کے ایرانیوں کی یہ حالت تھی کہ قدیم ساسانی عہد میں بھی کوئی بادشاہ اس وقت تک مکمل طور سے سلطنت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ فن تحریر سے واقف نہ ہو۔ بھرہبی نہیں تھا کہ وہ صرف اپنی مادری زبان پر عبور رکھتے ہوں بلکہ (ظہور اسلام سے قبل ہی) وہ عربی زبان بھی حاصل کر لیتے تھے۔

چنانچہ بہرام گور جس کی تعلیم، اعراب حیرہ کے درمیان ہوئی تھی، علاوہ عربی، فارسی کے یونانی زبان بھی جانتا تھا اور ان تمام زبانوں کو اچھی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ عونی نے تو اس کے عربی شعر بھی اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ اسی طرح ایرانی گورنر یمن کا (خرامسرو) تو بالکل عرب ہی بن گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ الفرض ایرانی پہلے ہی سے عربی زبان سے مانوس تھے اور جب اسلام نے عرب و عجم کو یک کر دیا، اور اختلاف مذہب بھی مٹ گیا تو پھر کثرت سے انھوں نے عربی زبان حاصل کی اور اس قدر تیزی کے ساتھ وہ عربی سانچے میں ڈھل گئے کہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر صفحات تاریخ پر مل سکتی ہے۔

پہلی صدی ہجری ختم نہ ہوئی تھی کہ عجم نے عربی زبان کے بخوبی افدھرتی پیدا کر دیے، چنانچہ پیش گوئی (ایرانی) سب سے پہلے وہ شخص تھا جس نے ریت میں بیٹھ کر عربی زبان کے قواعد مرتب کئے۔ اگر ان قابل لوگوں کی فہرست مرتب کی جائے جو اسلام کے قدردان اولیٰ میں پائے جاتے تھے تو اُس میں اکثر نام عجمی لوگوں کے ہوں گے جو جنگی قیدی کی صیغہ عرب آئے اور جنھوں نے موآلی کی حیثیت سے اسلام کی نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ ابواسحاق کا دادا، جس کی سیرت نبوی، ابتدائے اسلام کی بہترین تاریخ ہے۔ ابوموسیٰ القیر جو تاریخ اندلس کا خاص شخص ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ جنھوں نے ادب و حکمت سیاست و مذہب کے علوم میں مخصوص شہرت حاصل کی، سب کے سب ایرانی یا ترک نسل کے تھے، جو بحیثیت موآلی کا عرب میں رہتے تھے۔ خلیفہ عبدالملک اور فقیہ الزہری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ، یمن، مصر، شام، عراق، خراسان، کوفہ اور بصرہ میں ہر جگہ عہدہ قضا موآلی ہی کے ہاتھ میں تھا اور کسی عرب کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ شایفہ کو اس پر تعجب ادا تو الزہری نے جواب دیا کہ ”امیر المؤمنین یہ تو خدا اور اس کے مذہب کی پیروی کا نتیجہ ہے جو مذہبی احکام پر عامل ہو گا وہی نرتی کر سکے گا“

اس میں شک نہیں کہ عرب نے ہمیشہ عجم سے نفرت کی اور باوجود اس کے کہ مذہب نے ان دروڑوں کو ایک طلحہ پر لا کر

کھڑا کر دیا اور تفریقِ قومی کو یکسر مٹا کر رکھ دیا تھا، تاہم اہل عرب نہ اہل عجم سے خوش تھے اور نہ اُن کے ساتھ اپنے تعلقات وسیع کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ موالی عجم اپنے فہم و فراست، اپنی قابلیت و ذہانت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے جا رہے تھے اور عہدِ بنو امیہ میں بھی جو خالص عربی حکومت کا دور تھا، اُنھوں نے نمایاں امتیاز حاصل کر لیا تھا اور زمانہ کی رفتار کے دیتی تھی کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جب عجم، عرب کو پس پشت ڈال کر خود بروئے کار آجائے گا۔ چنانچہ عہدِ عباسیہ میں یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہا اور ایرانیوں کے غیر معمولی عروج نے عربوں کو آتشِ زیر پا کر دیا۔

چونکہ عرب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا اور وہ غیر اعراب پر طعن و تشنیع سے باز نہ آتے تھے، اس لئے ان کے مخالف ایک اور گروہِ شعوبیہ پیدا ہو گیا، جس نے نہ صرف یہ دعویٰ پیش کیا کہ مذہبِ اسلام نے تمام قوموں کو برابر کر دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں کی قوم اکثر قوموں سے کمتر درجہ کی ہے۔

ایک بار ابوقحافہ نے خدیجہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اُسے قبیلہ طے کی مشہور ہستی حاتم سے تشبیہ دی تھی ورنہ نے شکر شاعر کو تنبیہ کی کہ آئندہ اسی جرأت نہ کرنا کہ امیر المومنین کے مقابلہ میں وحشی عربوں کا ذکر کر دے۔

شعوبیہ گروہ کی مختلف جماعتیں تھیں اور ہر جماعت اپنے اپنے ملک کی طرفدار ہی کرتی تھی، لیکن ان میں سب سے زیادہ ذی اثر ایرانی جماعت تھی اس عہد کے امراء ایران اپنے نسب ناموں کو بھی اسی طرح محفوظ رکھتے تھے جس طرح عرب۔ اور اسلئے شعوبیہ جماعت نے اس باب میں بھی عربوں پر حملہ کیا جو زیادہ بیجا نہ تھا اور اگر اس خصوصیت کو نگاہ رکھا جائے کہ وہ عربوں کے انساب کا بھی کافی علم رکھتے تھے بلکہ بعض اوقات عربوں کو اپنے آباؤ اجداد کے تاریخی حالات ایرانیوں سے دریافت کرنے پڑے تھے، تو ایرانیوں کا یہ فخر بالکل حق بجانب نظر آتا ہے۔

ایرانی بے انتہا ذہین تھے، وہ سمجھتے تھے کہ عربوں میں کیا کمزوریاں ہیں اور وہ اُن سے کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں چنانچہ یہ ذوق اس قدر بڑھ گیا کہ مختلف کتابیں عربوں کی تحقیر و تذلیل میں لکھی گئیں اور شعوبیہ جماعت نے عربوں کو سخت پریشان کر دیا اسحاق بن حسان الحمری، ابو عثمان، سعید بن حمید بن نبھگان۔ ابو سعید الرستمی اور ابو ریحان بیرونی خاص خاص لوگ شعوبیہ جماعت کے تھے، جنھوں نے عربوں کے خلاف مستقل تصانیف مرتب کر دیں۔

شعوبیہ جماعت کی یہ جنگ صرف انساب اور زبان کے معاملے تک محدود تھی، کیونکہ ان ہی دونوں باتوں پر عربوں کو فخر حاصل تھا اور اگر انصاف کیا جائے تو اس جنگ میں بھی ایرانی ہی کامیاب ثابت ہوئے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانی عربوں کی قدیم تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اس میں کہاں کہاں کمزوریاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ انھیں کو وہ نمایاں کر کے دکھاتے تھے برخلاف عربوں کے کہ وہ ایرانیوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے اور اُن کے پاس کوئی ذرا ذہن ایرانیوں کو نہ دینے کا نہ تھا۔

شعوبیہ میں ابو عبیدہ تمیم بن اُمیہ نہایت قابل اور مشہور شخص گزرا ہے جس نے بتایا ہے کہ عربوں کی زبان کس حد تک

ایران کی مثنوی ہے، اور انھوں نے ایرانی نصابوں، ایرانی اصول فصاحت و بلاغت سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔ حمزہ اصفہانی نے تو اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ وہ بہت سے عربی شہروں کے ناموں کو بھی فارسی زبان سے محفوظ بناتا ہے مثلاً بصرہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اصل میں یہ بس راہ (دور کا راستہ) تھا اسی طرح صاحب دستان نے کہہ کی حقیقت ماہ گاہ (چاند کی جگہ) ظاہر کی ہے۔

ہر چند اس قسم کی تاویلیں بالکل ساقط الاعتبار ہیں لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ شعوبہ نے عربوں کے خلاف کس قدر شدت و عصب سے کام لیا اور یہ غالباً انتقام تھا عربوں کے اُس نخوت و پندار کا جو وہ عجمیوں کے مقابلہ میں ظاہر کیا کرتے تھے شعوبہ کے خلاف عربوں نے بہت کچھ لکھا، کتابیں تصنیف کیں، اپنے دعاوی پیش کئے، ایرانیوں کے الزامات کا جواب دیا اور پوری طرح اپنی قوت بھجوا دی صرف کر دی، لیکن جس قدر شہرت شعوبہ کو حاصل ہوئی وہ انھیں حاصل نہ ہوئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایرانیوں میں علوم و فنون کا رواج تھا اور وہ اپنے وسیع معلومات کی وجہ سے مقابلہ زیادہ کامیاب ہوئے۔

جب اسلام کی فتوحات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور دیگر ممالک کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے جس چیز کی طرف انھیں توجہ کرنے کی ضرورت ہوئی وہ عربی زبان تھی، کیونکہ وہ قوم جس میں وہ آکر شامل ہوئے وہ کتاب جس کے ساتھ انھوں نے اپنی ساری زندگی وابستہ کر دی، عربی زبان سے متعلق تھی اور اس لئے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس زبان میں پوری ہمارے حاصل کرتے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک غیر قوم کو عربی زبان سیکھنے کے لئے صرف یہ غیبی ماننے کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ اس کی لغات معلوم کرنے کی۔ لیکن چونکہ عربی زبان بہت وسیع زبان ہے اس لئے اس کے لغات و قواعد سیکھنے کے لئے قدیم اشعار کا فراہم کر کے یاد کرنا ضروری ہوا اور عربی شاعری سمجھنے کے لئے اُن کے انشباع و اخبار اور ان کی گزشتہ تاریخ کا علم لازم تھا اس لئے زبان عربی سیکھنے کے ساتھ ہی ساتھ عجمیوں کو صرف و نحو، لغت و تاریخ، علم الانساب والا یام، جغرافیہ و تاریخ کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی جس کی عربوں کو چنداں ضرورت نہ تھی۔

اسی کے ساتھ جب آپ مذہب کی طرف آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن مجید اور احکام مذہب کے متعلق اقوال رسول اللہ کا استقصاء کرنے کی غرض سے، اصحاب رسول اللہ اور تابعین سے استفادہ کی ضرورت تھی۔ اگر وہ عام معاشرت کے متعلق رسول اللہ کے فرمان بتائیں، لیکن چونکہ ہر حدیث کو حدیث بنوی ماننے میں تاویل ہو سکتا تھا اس لئے ہر حدیث کی اسناد طلب کی جانے لگیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اسناد الرجال کا فن برپا ہو گیا جس کا اضافہ شعبہ تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی نے اول بار کیا اور آج تک کسی مذہب و مہرچ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

پہلی صدی ہجری میں کوئی کتاب ایسی مرتب نہ ہوئی تھی جو زبان و تاریخ سیکھنے والوں کو روکے ہوئے ہو۔ اس لئے جن کو عربی لکھنا ہوتا تھا وہ بدو یا ان صحرا نشین کے پاس جاتے تھے اور جنہیں احکام مذہب معلوم کرنا ہوتے تھے وہ اپنے

میں اصحاب رسول اللہ کی تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلب علم کے لئے مسلمانوں کو سفر و سیاحت زیادہ کرنی پڑی اور آخر کار یہ فوق و شوق اس قدر بڑھ گیا کہ کھولنے جو ایک صحری غلام تھے، تمام حجاز، عراق اور شام کا سفر صرف اس لئے کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ کی کوئی صحیح حدیث معلوم کریں اور آخر کار زیاد بن جابر تہامی سے انھیں ایک حدیث ایسی دستیاب ہوئی جو حبیب بن مسلمہ الفہری سے روایت کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک وقت یہ بھی تھی کہ تمام مذہبی علوم صرف زبانی حاصل کئے جاتے تھے۔ چنانچہ سب سے قدیم مذہبی کتاب شرکاء صرف ابن اسحاق کی سیرۃ نبوی تھی، جسے ابن ہشام نے زیادہ مہذب و مکمل صورت میں پیش کیا۔

پہلی صدی ہجری میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر ابن العاص، الزہری، حسن بصری وغیرہ چند نفوس ایسے تھے جنہوں نے اپنی معلومات کو نوٹ کی شکل میں مرتب کیا تھا، لیکن مرتے وقت وہ انھیں بھی تلف کر گئے۔ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے سے انحراف دوسری صدی ہجری تک برابر قائم رہا۔

چنانچہ عبدالرحمن بن سہیلہ سلمیٰ کو مشکل سے اُن کے اُمتاد نے اجازت دی کہ وہ احادیث کو لکھیں۔ اس قدغن کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا، ممکن ہے کتب احادیث کی ایسی عزت نہ کی جائے، جس کی وہ مستحق ہیں اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کہیں لوگ صرف احادیث ہی کو اپنا معمول بنا کر کلام مجید کو نہ چھوڑ بیٹھیں۔

یہ خیال صرف مذہبی کتابوں سے متعلق تھا ورنہ دیگر فنون کی کتابیں عہد بنو امیہ میں مرتب ہو چکی تھیں اور اکثر لوگوں نے اس طرف کافی توجہ کی تھی۔ ان میں سے وہب بن منہ (ایرانی النسل) عبید بن شریہ، ابوالخنف بن یحییٰ، الزہری ان کے شاگرد عبدالرحمن العماری موطا کا مصنف اسد بن موسیٰ بن ابراہیم، محمد بن شیریں کتاب الجوامع کا مصنف محمد بن علی بن عمر السالمی کتاب الاشارة کا جامع خالد بن یزید (اموی شاہزادہ) علم الکیمیا کا ماہر اور اس کا شاگرد جابر حیان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ مصنفین عہد بنو امیہ کے تھے لیکن عہد عباسیہ میں ان کی تعداد بڑھ گئی اور ان میں عنصر غالب ایرانی النسل لوگوں کا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عجم نے عرب کی کس قدر خدمت کی ہے، چنانچہ ابن المقفع (جو مجوسی النسل تھا اور ابن خلدون و ابن مقفع کے نزدیک بھی عربی زبان کا بڑا ماہر تھا) عیسیٰ بن عمر و دانشقنی (جس نے سب سے پہلے عربی قواعد کو مرتب کیا

۱۔ یہ دونوں صناعہ کے رہنے والے تھے، عبید کا انتقال خلیفہ عبدالملک کے عہد میں ہوا اور وہب کا خلیفہ ہشام کے زمانہ میں۔

۲۔ اس کے تاریخی افسانے بہت مشہور ہیں، حکومت بنو امیہ اور اس کا خاتمہ ساتھ ہی ساتھ ہوا۔

۳۔ یہ بھی خلیفہ ہشام کے زمانہ میں تھے۔

۴۔ امام مالک کی موطا بعد گو لکھی گئی ہے۔

۵۔ یہ کتاب الزہری کا مصنف تھا۔

اور خلیل بن احمد اور سیبویہ کو درس دیا) امام ابو حنیفہ (جو ایرانی نسل تھے) حماد بن شاپور (سبطہ معلقہ کا جامع) بشار بن برد (ایرانی نسل اور عربی کا مشہور نابینا شاعر) سیبویہ (مشہور نحوی) علی بن حمزہ الکسانی (مامون و امین کا اتالیق) ابو نوّاس (دربار ہارون کا مشہور شاعر) الفراء (کسانی کا مشہور شاگرد) ابن قتیبہ (مشہور مورخ) اخفش (سیبویہ کا مشہور شاگرد) قسطلی بن لوقا (بعلبک کا عیسائی اور اپنے عہد کا بڑا زبردست ریاضی و ہیئت دان) وغیرہ سب غیر اعراب تھے جنہوں نے اپنی قابلیت اور فضل و کمال کے غیر فانی نقوش تاریخ میں ثبت کر کے، یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام کی مساوات نے عرب و عجم دونوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا اور شریعت حقہ کے نزدیک وہی شخص مستحقِ عزت تھا جس نے اپنے اندر کوئی کمال پیدا کیا اور صرف فخرِ انساب کو ذریعہ امتیاز قرار نہیں دیا

ایک دن خلیفہ ہارون الرشید اور وزیر جعفر برکی دونوں گھوڑوں پر سوار بغداد سے باہر جا رہے تھے کہ راستہ میں انہیں اونٹوں کی ایک قطار ملی جن پر سونا لدا ہوا تھا جو خزانہ خلافت میں داخل کیا جانے والا تھا

خلیفہ نے سالارِ قافلہ سے پوچھا ”یہ اونٹ کہاں سے آرہے ہیں“ اس نے جواب دیا کہ ”یہ اونٹ خراسان سے آرہے ہیں اور علی ابن عیسیٰ عامل خراسان نے تحفہً امیر المومنین کی خدمت میں بھیجے ہیں

خراسان میں اس سے قبل جعفر برکی کا بھائی فضل برکی گورنر تھا، لیکن ہارون الرشید نے اسے معزول کر کے، علی ابن عیسیٰ کو اس کی جگہ مامور کر دیا تھا

بادشاہ نے سالارِ قافلہ کا یہ جواب سکر جعفر سے طنز یہ انداز میں پوچھا کہ: ”تمہاری بھائی فضل کے زمانہ میں یہ سونا کہاں تھا“

جعفر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ ”ان لوگوں کے گھروں کے ازر جو اس کے جائز مالک و حقدار تھے“

شاہجہاں اورنگ زیب کا ضبط اوقات

یورپ کے مکائد سیاسی نے مشرقی روایات کو جس بیدردی کے ساتھ تباہ و برباد کیا ہے، وہ تاریخ کا ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اگر عہد حاضر کی برقی روشنی میں بھی اس کی نظیر تلاش کی جائے، تو شاید کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے اخلاق، ہمارے اطوار، ہماری تہذیب، ہماری سیاست، ہماری حکومت حتیٰ کہ ہماری مستی بھی، غربت کے نزدیک فطرت کی بدترین پیداوار سمجھی جاتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حقیقت کو کس حد تک پامال کرنے کے بعد آسودہ ہو سکے گی۔

ایک یورپین مورخ، جس وقت ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی تصویر کھینچنے بیٹھ جاتا ہے، تو اس کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ واقعات تاریخ اور اقتضائے انصاف سے ہٹ کر جتنی ممکن صورتیں اس تصویر کے منجھ کر سکنے کی ہو سکتی ہیں، ان سب کو پروئے کار لے آئے اور اس کے ہر روشن پہلو پر گہرے سے گہرا سیاہ پردہ ڈالنے میں سارا زور قلم صرف کر دے۔ ہر چند یہ ایسی کمزور اور بے بود کوشش ہے کہ ہر شخص بہ ادنیٰ تاہل اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ خود ہم لوگ اپنے حالات سے واقف نہیں ہیں اور ہندوستان کا نزاع قومی خود باہد گرد دوسرے کی نکتہ چینی و عیب جوئی سے مسرور ہوتا ہے، اس لئے نہ ہم مغرب کی چالوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ وہ ہماری انشقاق و تفریق کی زیریں فرصت کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے، جس کا کھلا ہوا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں کے بیان پر یقین کریں اور اسی یقین کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے چلے جائیں۔

یورپین مورخ کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی مشرقی بادشاہ کا حال لکھتا ہے، تو اس کو اس قدر ہیبت ناک بنا دیتا ہے کہ ہر شخص دیکھ کر متنفر ہو جائے اور مشرق کے اخلاق سے بیزار۔ اس کے نزدیک مشرقی بادشاہ ایک ایسی جابر و ظالم ہستی ہے جسکو سوائے خونریزی اور ستم رانی کے کسی اور کام سے واسطہ ہی نہیں ہے یا پھر وہ حرم کے اندر ایک ایسا ہوس پرست دیوتا ہے جو حسن کی قربانیوں میں کسی حال میں آسودہ نہیں ہوتا، وہ انتظام سلطنت سے بیزار ہے، رعایا کی طرف سے بے پروا و غافل ہونے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، سفاکی و بیرحمی اس کا شعار زندگی ہے اور قتل و غارت اس کی حیات کا تنہا نصب العین۔ آج محمود کی بت شکنی اور اورنگ زیب کی عبیدیت، اسکول کے ہر لڑکے کی زبان پر ہے اور یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اسی محمود نے راجہ کالچر کے منہ کیا سلوک کیا اور اورنگ زیب کا طرز عمل ہندوؤں کے ساتھ کس قدر منصفانہ و روادار نہ تھا۔

پھر چونکہ اب یورپ کے وسائل سیاسی ایک ایک کر کے بے نقاب ہو رہے ہیں، چونکہ اب مشرق، مغرب کی سسٹم آلود

تہذیب و شائستگی سے متنفر ہو چلا ہے، اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ خود بھی تنقید سے کام لے اور معلوم کرے کہ اس وقت تک کس لکرو فریب میں ہیں مبتلا رکھا گیا ہے۔

آج یورپ، اپنی پابندی اوقات پر ناز کرتا ہے اور کابلی صرف شاہانِ مشرق کے لئے مخصوص سمجھتا ہے، لیکن اگر انصاف سے کام لیا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلم فرمانروایانِ ہند کا ضبط اوقات اس عہدِ روشن میں بھی قابلِ تقلید ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جاہل و ظالم، کابل و پٹنہ، احمد نگر پرست، سوئی ہوئی، ہستی، کیونکر اس قدر صحیح تقسیم اپنے اوقات کی کر سکتی ہے؟

شاہجہاں

اس کا معمول تھا کہ صبح طلوعِ آفتاب سے دو گھنٹہ قبل بیدار ہوتا اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز تہجد ادا کرتا۔ اس کے بعد وہ رو بہ قبلہ ہو کر کلام مجید پڑھنے میں مصروف ہو جاتا، یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت آ جاتا اور قلعہ کے اندر کی مسجد میں نماز پڑھ کر وظایف وغیرہ سنبھالنے سے فارغ ہوتا۔

نماز فجر سے فارغ ہو کر، سوچ نکلنے کے پورے ۴۸ منٹ بعد وہ ”جھروکہ درشن“ میں آ جاتا، جو قلعہ آگرہ کے شمالی دیوار میں اب بھی بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے نیچے زائرین کا ہجوم ہوتا، جو بادشاہ کو دیکھ کر سلام کرتا اور ہر شخص نہایت زادی سے اپنے معروضات پیش کر سکتا۔ اس لئے وہ لوگ جو نہایت ضروری شکایتیں خود بادشاہ کے حضور میں پیش کرنا چاہتے تھے، صبح کو

”جھروکہ درشن“ کے نیچے کھڑے ہو جاتے تھے اور بادشاہ اُن کے عریض پر اُسی وقت مناسب احکام لکھوا دیتا تھا۔ جھروکے پر ایک جماعت پنڈتوں کی حاضر رہتی تھی جنہیں درشنی کہتے تھے۔ یہ اس وقت تک نہ کچھ کھاتے تھے اور نہ کوئی کام کرتے تھے، جب تک بادشاہ کا چہرہ انہیں نظر نہیں آ جاتا تھا۔ اس درشن کے بعد میدانِ صاف کر دیا جاتا تھا، افواج شاہی باقاعدہ قائم ہو جاتیں امراء و اراکین صف بستہ حاضر ہوتے اور مست ہاتھیوں کی جنگ کا نظارہ کیا جاتا۔ یہ تفریح صرف بادشاہ کے لئے مخصوص تھی اور ولی عہد بھی اُس کا مجاز نہ تھا۔ شاہجہاں اس تفریح کا مخصوص طور سے نہایت شائق تھا۔ دہلی کے ساحل پر فوجی ہاتھیوں اور

سواروں کی باہم مصنوعی جنگ بھی اسی وقت ہوتی جسے بادشاہ نہایت دلچسپی سے معائنہ کرتا اور تقریباً ایک گھنٹہ اس میں صرف ہو جاتا۔ اس کے بعد پونے آٹھ بجے، بادشاہ، دیوانِ عام کی عمارت میں آتا۔ اکبر اور جہانگیر بھی دربارِ عام کیا کرتے تھے، لیکن

دیوانِ عام ۱۶۶۸ء میں شاہجہاں نے ایک چوبی عمارت اس غرض سے بنوا کر اس کو زر کار کر دیا اور دس سال بعد ۱۶۸۳ء میں موجودہ دیوانِ عام کی عمارت طیار کرادی۔ یہ عمارت سنگِ سرخ کی ہے اور چالیس ستونوں پر قائم ہے، تین طرف سے کھلی ہوئی ہے اور چوتھی جانب دروازے میں سنگِ مرمر کا چوترا ہے، جہاں بادشاہ مٹھی گدوں پر بیٹھا کرتا تھا۔

بادشاہ کے داہنے بائیں شہزادے ہوا کرتے تھے، جو بغیر اجازت بیٹھ نہیں سکتے تھے اور باقی اطراف میں امراء و اراکین وغیرہ صف بستہ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ امراء جو بادشاہ کے ذاتِ خاص سے وابستہ تھے شہنشین کے قریب داہنے بائیں ستونوں کے پاس

کھڑے ہوتے تھے اور ان کا منہ بادشاہ کی طرف ہوتا تھا۔ الغرض اس طرح یہ ساری عمارت (۲۰۱ فٹ لائی اور ۶۷ فٹ چوڑی) آدمیوں سے بھر جاتی تھی۔ دیوان عام کی عمارت کے آگے صحن میں زرکار خیمہ نصب ہوتے تھے اور یہاں دوسرے درجہ کے امراء کھڑے ہوتے تھے۔

جب سب درباری حاضر ہو جاتے، تو سات بجکر چالیس منٹ پر بادشاہ شہ نشین پر برآمد ہوتا اور کام شروع ہو جاتا۔ سب پہلے میر بخش افواج، افسران فوج کے (جنہیں منصبدار کہتے تھے) عرایض پیش کرتا اور ان پر اُسی وقت احکام صادر ہوتے۔ وہ افسران جو حال ہی میں کسی عہدہ پر یا باہر کے صوبوں میں متعین ہوئے ہیں، اپنے اپنے افسروں کے ذریعہ سے پیش ہوتے تھے۔ ان افسروں میں میر اسٹش (توپ خانہ کا افسر) فنگ بردار سواروں کا بخش، اور بخشی دستہ اعدیان (شرفاء کی فوج امدادی کہلاتی تھی) ہوا کرتے تھے، جو بادشاہ کے حضور میں مناسب الفاظ کے ساتھ اپنے ماتحت افسروں کو پیش کیا کرتے تھے۔ جو افسر پیش ہوتا وہ بھٹک کر مجرا عرض کرتا اور بادشاہ کی طرف سے اسے خلعت، گھوڑا یا اسلحہ وغیرہ عطا ہوتے اس کے بعد شاہی جاگیر اور خزانہ خاص کے افسران جنہیں میر سامان اور دیوان بیوتات کہتے تھے اپنے اپنے کاغذات پیش کر کے احکام حاصل کرتے۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد خاص خاص امراء ان عرایض اور ہدایا کو پیش کرتے جو شاہزادوں، باہر کے فوجداروں، دیوانوں اور بخشوں کی طرف سے موصول ہوتے تھے، شہزادوں اور خاص خاص امراء کے خطوط کو بادشاہ کبھی خود پڑھتا اور کبھی پڑھوا کر سنتا، باقی عرایض کا مفہوم بتا دیا جاتا، اس کے بعد صدر اعظم، صوبہ کے عاملوں (گورنروں) کے عرایض پیش کر کے خاص خاص معاملات پر توجہ دلاتا اور اسی وقت علماء، فضلا، شیوخ، سادات وغیرہ کے مناصب و وظائف کے متعلق کاغذات پیش کر کے احکام مناسب حاصل کرتا۔

اس کے بعد وہ تمام احکام جو اس سے قبل مناصب و جاگیر عطاء، نقد وغیرہ کے متعلق نافذ ہو چکے ہیں، بعد تحریر مکرر پیش پیش کئے جاتے۔ اس وقت ایک خاص افسر، جسے داروغہ عرض مکرر کہتے تھے، ہر کاغذ کے پیش ہونے کے وقت بادشاہ کو یاد دلاتا جاتا۔

جب بادشاہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو جاتا تو اسطبل شاہی کے افسران، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو معہ ان کے راتب کے پیش کرتے۔ یہ رسم اکبر نے جاری کی تھی تاکہ ملازمین راتب میں کمی نہ کر سکیں، اگر کوئی جانور دُبل نظر آتا، تو افسر کو سخت تہذیبیاتی اسی طرح وہ، امراء کے تمام گھوڑے جو افواج شاہی میں داخل ہو کر داغ ہو چکے ہیں، پوری شان کے ساتھ سامنے لائے جاتے اور اس کے بعد دربار ختم ہو جاتا۔ اس میں کم و بیش دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔

دیوان عام کے عرایض سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ دس بجے سے کچھ قبل دیوان خاص میں آ جاتا (عام دیوان خاص طور سے اسے غسل خانہ کہتے تھے کیونکہ اکبر کا غسل خانہ اسی کے قریب تھا) اور تخت پر جلوہ افروز ہوتا۔ پہلے وہ تمام اہم خطوط و عرایض کو پڑھ کر خود اپنے قلم سے جواب لکھتا۔ باقی عرایض دلیبر یا دیگر امراء مخصوص کے ذریعہ سے پیش کی جاتیں

اور بادشاہ کے الفاظ میں فرامین کا مسودہ تیار کیا جاتا، ان مسودوں کو بادشاہ خود دیکھتا اور ان میں ضروری اصلاح کرا کر اسکے بعد جب وہ صاف ہو جاتے تو حرم کے اندر، ازکب شاہی (دُہر) ثبت ہونے کے لئے بھیج دئے جاتے۔ جو ممتاز محل کے پاس ہی محفوظ رہتی تھی۔

تحریر فرامین کے بعد محکمہ مال کے افسران اعلیٰ اپنے اپنے کاغذات پیش کرتے، اور اسکے بعد صرف خیر کے کاغذات پیش ہوتے (سالگرہ کے دن سونا، چاندی، جواہرات وغیرہ بادشاہ کے ہوزن خیرات کے لئے نکالا جاتا تھا اور امرابھی لہنی اپنی حیثیت کے مطابق تصدق کی رقم پیش کرتے تھے۔ اس کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا تھا، جو محتاجوں اور مسکینوں کے لئے آذوقہ وغیرہ مقرر کرتا تھا)۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دستکاروں کے کام پیش ہوتے اور پھر عمارات کے نقشے وغیرہ ملاحظہ کے لئے لائے جاتے اس وقت محکمہ تعمیر کے خاص خاص افسران بھی موجود رہتے اور آصف خاں صدر اعظم، ہلیت شاہانہ کے مطابق ان پر نوٹ لکھتا۔ اس کے بعد بادشاہ شکاری جانوروں (بازچیتا وغیرہ) کا شکار کرتا اور خاص خاص گھوڑے سامنے صحن میں نکالے جاتے۔ دیوان خاص میں بادشاہ کو تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے، اور اس کے بعد ساڑھے گیارہ بجے، بادشاہ **شاہ برج** میں آجاتا۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں بادشاہ سارے دن کے معاملات طے کرتا اور سوائے مخصوص لوگوں کے کوئی شخص وہاں باریاب نہ ہو سکتا تھا۔ وزیر اعظم تمام اہم معاملات پر طے کیا کرتا تھا، جس میں کم و بیش ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا۔

اب دوپہر کا وقت ہو جاتا تھا اور بادشاہ حرم میں داخل ہو کر کھانا کھاتا اور ایک گھنٹہ قیام کرنے کے بعد **حرم کے اندر** نماز سے بھی فارغ ہوتا۔ حرم کی زندگی مسرور آرام و آسائش کی زندگی ہوتی ہے، لیکن شاہجہاں یہاں بھی کام کیا کرتا تھا۔ حرم کے اندر غریب عورتیں، بیوائیں، یتیمیں، مفلس و نادار، علماء و فقہاء کی لڑکیاں، ممتاز محل کے حضور میں تہنیت کے ذریعہ سے پیش کی جاتیں، اور ممتاز محل، بادشاہ سے عرض کر کے ان کے لئے وظائف، پنشن، انعامات، جاگیر، اور سامان جبر و غیرہ کے احکام حاصل کرتی، الغرض حرم کے اندر بھی روزانہ مصروف خیر کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری رہتا تھا۔

تین بجنے کے بعد بادشاہ نماز عصر سے فارغ ہو کر کبھی دیوان عام میں پھر آجاتا اور دن کے بقیہ کام یہاں سپرکاردار **سپرکاردار** پرے کرتا۔ اس موقع پر محافظین قصر (جنہیں چوکیدار کہتے تھے) کی جماعت مسلح حاضر رہتی، اور بادشاہ انکا معائنہ کرتا۔ اس کے بعد بادشاہ نماز مغرب جماعت سے ادا کرتا۔

مغرب کے بعد جواہر کار خانوں دیوان خاص میں روشن کئے جاتے اور دو گھنٹہ تک عام **دیوان خاص اور شاہ برج** انتظامات سلطنت کے مسائل طے کرنے کے بعد بادشاہ گانا سنتا۔ اس وقت میں صرف مخصوص لوگ شریک ہوتے تھے۔ بچے عشا کی نماز کے بعد پھر شاہ برج میں جاتا اور صدر اعظم و نجاشی وغیرہ کو طلب کر کے بقیہ نماز کے کاغذات طے کئے جاتے، یہاں تک کہ سلطنت کا کوئی کام باقی نہ رہ جاتا۔

موسیقی اور خواب شب ساڑھے آٹھ بجے، وہ پھر حرم میں چلا جاتا اور ایک گھنٹہ تک یہاں گانا سنتا۔ اس کے بعد بستر پر جاتا اور پردہ کے باہر خاص خاص لوگ کتابیں پڑھ کر سنتا تھے۔ یہ کتابیں زیادہ تر تیسرے تاریخ کی مبنی ہوتی تھیں۔ دس بجنے کے بعد یہ لوگ رخصت کر دئے جاتے اور بادشاہ مجبوراً سو جاتا۔

یوم انصاف یہ تھا شاہجہاں کا روزانہ معمول، لیکن جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی اور کوئی دربار منعقد نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح بدھ کا دن انصاف کا دن تھا۔ اور بادشاہ ”جھروکہ درشن“ سے سیدھا دیوان عام میں آتا تھا اور ٹھیک آٹھ بجے تخت عدالت پر متمکن ہوجاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ شاہجہاں نے نہایت محتاط قاضی مقرر کئے تھے، لیکن وہ خود بھی انصاف کی طرف سے غافل نہیں تھا، اور ہفتہ میں ایک دن خود تمام شکایات سنتا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے علماء، فقہاء اس کے پاس ہوتے تھے، لوگ اپنی اپنی شکایات پیش کرتے تھے اور دور سے فریادی آکر جمع ہوتے تھے اور بادشاہ ایک ایک درخواست پر کامل غور و تحقیق کر کے انصاف کرتا تھا۔ بعض معاملات اگر اچھے ہوئے ہوتے تھے، تو صوبہ داروں کے نام تحقیق و تفتیش کا حکم نافذ کرتا اور ہدایت کرتا کہ بعد تحقیقات، فریقین ہمارے پاس بھیج دئے جائیں۔

اورنگ زیب

صبح اورنگ زیب، طلوع آفتاب سے قبل بیدار ہو کر ضروریات صبحی سے فارغ ہوتا اور ایوان خاص کی مسجد میں ذکر و شغل کرتا اور نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد وہ چاشت کے وقت (ساڑھے سات بجے) تک تلاوت قرآن میں مصروف رہتا۔

خلوت گاہ اور عدالت اس کے بعد وہ خلوت گاہ میں جاتا، جہاں مخصوص سردار بار یاب ہو سکتے، یہاں وہ تخت پر متمکن ہوتا اور افسر عدالت گاہ، فریادیوں کو پیش کرتا۔ اورنگ زیب ان کی شکایات سنتا اور خود ان سے استفسار حال کرتا۔ فریادی جو بالکل نادار ہوتے ان کو خزانہ شاہی سے امداد دیکھاتی اور تمام مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جاتا۔

درشن اور درباری ساڑھے آٹھ بجے تک اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ ”جھروکہ درشن“ میں جاتا اور یہیں سے فوج کا حاشیہ وغیرہ کرتا، جو شاہجہاں کا دستور تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ اس میں صرف ہوجاتا اور سوانوبجے دربار عام میں اگر قریب قریب وہی فرایض ادا کرتا جو آپ عہد شاہجہاں میں پڑھ چکے ہیں۔ اس میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہوجاتے۔ دوپہر سے قبل وہ دیوان خاص میں جاتا، یہاں اس دن کے تمام معاملات طے پاتے اور تقسیم خلعت و انعام بھی ہوتی، خاص خاص امراء، حاجب، چوہدرار کاتب یہاں موجود رہتے تھے۔ صدر اعظم تمام گورنروں کے خطوط

پیش کرتا، اور نگ زیب اُن کو سنتا، احکام لکھواتا، کبھی کبھی وہ خود اپنے قلم سے ایک آدھ فقرہ لکھ دیتا جس سے اعزاز بڑھانا یا کام کی اہمیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ جو توقعات و فرامین شاہی صاف ہو جاتے، وہ بھی اسی وقت پیش ہوتے تھے اور یہیں اُن پر شاہی ثبت ہوتی تھی۔

دیوان خاص میں کام کرتے کرتے دوپہر ہو جاتی، اس لئے وہ یہاں سے اٹھ کر حرم میں جاتا اور کھانا کھا کر قیلولہ میں حرم اور نماز ظہر مصروف ہو جاتا۔ ٹھیک دو بجے بیدار ہوتا اور وضو کر کے حرم کی مسجد میں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کیا کرتا، یہاں تک کہ ظہر کا مقررہ وقت آجاتا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا، جماعت میں بڑے بڑے علماء، فقراء، شیوخ و سادات شامل ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ خلوت خانہ میں جاتا، جو حرم اور دیوان خاص کے درمیان واقع تھا۔ پہلے وہ یہاں قرآن پڑھتا، اسکی **خلوت خانہ** نقل کرتا، احادیث اور کتب فقہ وغیرہ کا مطالعہ کرتا اور پھر امور سلطنت کی طرف متوجہ ہوتا۔ اگر اس سے کچھ وقت بچتا تو پھر حرم کے اندر جاتا اور یہاں غریب و بیوہ عورتوں اور یتیموں کی درخواست سُن کر اُن پر احکام نافذ کرتا۔ اسی اثنا میں عصر کا وقت آجاتا اور نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے پھر انتظامی امور میں مشغول ہو جاتا۔

غروب آفتاب نصف گھنٹہ قبل وہ پھر دیوان خاص میں آکر تخت شاہانہ پر جلوہ افروز ہوتا امراء درباری لباس **شام کا دربار** میں موجود ہوتے، میر تنگ، ان سب کو ترتیب وار بٹھاتا اور بادشاہ ان درباریوں کا معائنہ کرتا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو جاتی اور بادشاہ تمام حاضرین کے ساتھ اُسی وقت اٹھ کر مسجد میں جاتا اور نماز ادا کرتا۔

نماز مغرب سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ پھر دیوان خاص میں آتا، یہاں وزیر، محکمہ مال کے دیوان خاص اور نماز عشا کا غذات لے آتا اور فرمان شاہی حاصل کرتا۔ چونکہ رقص و موسیقی شرعاً ناجائز ہے اس لئے وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا اور عشا کے وقت تمام امور سلطنت دیوان خاص میں طے کرنے کے بعد، ۸ بجے نماز عشا پڑھنے مسجد میں جاتا، اور دربار برخواست کر دیا جاتا۔ اور نگ زیب، نماز عشا کے بعد عرصہ تک مسجد میں بیٹھا رہتا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتا اس کے بعد حرم میں جاتا اور سو رہتا۔

ہفتہ میں تین دن ایسے ہوتے جب اس معمول میں کچھ فرق ہو جاتا تھا، جمعہ کو بالکل دربار نہ ہوتا تھا اور بدھ کو عام دربار عدالت قائم ہوتا تھا، اس دن ”جھروکہ درشن“ سے سیدھا دیوان عام میں جاتا، جہاں علماء، فضلاء، فقہاء، مفتی، قاضی جمع رہتے اور بادشاہ تمام فریادیوں کو اپنے حضور میں لائے جانے کی اجازت دیدیتا۔ جمعرات کو نصف دن تعطیل ہوتی، یعنی صرف دوپہر تک کام ہوتا اور اس کے بعد بادشاہ شام تک صرف عبادت میں مشغول رہتا۔

کیا آج دنیا کا کوئی فرمانروا ایسا پیش کیا جاسکتا ہے، جس کا روزانہ معمول اس سے زیادہ دلسوزی و ہمدردی، انصاف پسندی و جانفشانی کا مظہر ہو؟

اُنڈس کے آثارِ علمیہ

(یورپ میں)

آج یورپ کی علمی ترقیوں نے دُنیا کو محو حیرت بنا رکھا ہے اور فطرت نے جس آزادی کے ساتھ اپنے پوشیدہ خزانے اہل مغرب کے سامنے کھول کر رکھ دیے ہیں، اس پر سخت استعجاب ہوتا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی کوئی جدید ترقی نہیں ہے بلکہ وہی عہدِ ماضی کی ایک داستان ہے جو جدید اسلوبِ پیش کی جا رہی ہے اور موجودہ تہذیب و مدنیت کی تاریخ انھیں نقوش پر مرتب ہوئی ہے جنہیں مشرق اس سے قبل مرسم کر چکا تھا۔

اگر آج ہم مغرب کی حکومتوں کو علم و اہل کا قدر شناس پاتے ہیں، تو یادش بخیر ایک زمانہ وہ بھی تھا جب حکومت اسلام کا ایک ایک امیر اپنے فضل و کمال اور اپنی نکتہ نوازیوں سے ملک کے ہر گوشہ میں روحِ علم پھونک رہا تھا اور سلطنت کی کوئی مجلس ایسی نہ تھی جسکی ممتاز ترین خصوصیت آثارِ علم و ادب کی نگہداشت نہ ہو۔

سرزمین عرب میں بنو امیہ و بنو عباس، اشبیلیہ میں بنو عبّاد، غرناطہ میں ملوک بنی آحمر اور مصر میں خلفاء بنی فاطمہ کے علمی کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے، اور دنیا جانتی ہے کہ اُنڈس میں اہل فکر و علم کے لئے عبدالرحمن نے کیا کیا، پھر یہی نہیں ہوا، کہ ملوک اسلام کی یہ مساعی انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی ہوں، بلکہ وہ اسوقت بھی موجود ہیں کیونکہ یورپ کے خزانِ علم و فنون کا اصل سرشتہ اگر تلاش کیا جائے گا تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اسکی ابتداء مسلمانوں ہی سے ہوئی اور انھیں کے ذہنی ارتقاء کی بدولت علومِ قدیمہ کے خزانِ یورپ کو حاصل ہوئے۔

یوں تو سارے عہدِ اسلام کی ذہنی ترقیوں کی تاریخ ایک ایسی بسیط تاریخ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کے لئے ایک عمر درکار ہے لیکن آؤ آج کی صحبت میں ایک نہایت ہی اجمالی و سرسری نگاہ تاریخِ اُنڈس پر ڈالیں اور دیکھیں کہ اُن کے وہ کون سے آثارِ علم و ادب ایسے ہیں جن سے یورپ نے اخذ و اقتباس کر کے اپنی موجودہ ترقیوں کی طرح دُنیا میں ڈالی۔

انیس خوری (بیروت کے جامعہ امیرکیہ کے پروفیسر) نے ایک خطبہ میں فنِ شعر کے لحاظ سے بھی یورپ کے تاثر کو تسلیم کرایا ہے، اور اُس کے نزدیک یورپین شاعری میں ”روحِ فروستینہ“ اسپین ہی کے عرب شاعری سے منتقل ہوئی چونکہ اطالیہ، اسپین سے قریب تر تھا، اس لئے سب سے پہلے یہاں کے شعراء متاثر ہوئے اور پھر فرانس و دیگر ممالک مغرب کے شاعروں نے اسے اختیار کیا

اس میں شک نہیں کہ عرب شاعری کی تاریخ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ مشکل سے کوئی دوسرا ملک اس باب میں اس کا ہمسرہ ہو سکتا ہے اور یہ ذوق جس وسعت و بسط کے ساتھ جاہلیت و نیز حضارت اسلامیہ کے عہد میں پایا جاتا تھا اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی، اُن کی شاعری اُن کی اخلاق کی تاریخ تھی، اُن کے آداب و معاشرت کا آئینہ تھی اور اس بات کا ثبوت تھی کہ اہل عرب کے ناری طبائع ایک ایسی طبیعت کے مالک ہیں جو باوجود شجاعت و تہور کی تمام خود سر و خشن کیفیات رکھنے کے حدود کو لپچ بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور مناظر قدرت کے حُسن کا صحیح مطالعہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔

پھر چونکہ یہ ذوق امیر سے لیکر غریب تک ہر دل میں جاگزیں تھا اس لئے جب تم اسلام کے کسی عہد اور کسی ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھو گے، تو تمہیں ایک مستقل باب، شاعری کا بھی نظر آئے گا۔ اور تم محسوس کرو گے کہ وہی فرمانروا جو ایک وقت تخت پر بیٹھ کر مسائل سیاست کو طے کیا کرتا تھا اور جو میدان جنگ میں ایک شیر کی طرح نمودار ہوتا تھا جب بزم علوم و فنون آراستہ کرتا تھا تو معامد ہوتا تھا کہ یہ صرف اسی کے لئے وضع ہوا ہے اور سوائے شاعری کے اسے کسی اور امر سے سروکار ہی نہیں، اس عہد کے احکام و فرامین، توقعات و مکاتیب دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے جو لفظ نکلتا تھا شعر ہوتا تھا، اور ان کے قلم کا ہر ہر نقطہ نکتہ شاعرانہ۔ اگر غنائے کے بادشاہ محمد فاطمہ کی طرف سے ابن خلدون کو پروانہ راہداری بھی مقرر اور موزوں عبارت میں ملتا تھا تو حیرت نہ کرنی چاہئے کیونکہ مکتبہ قرطبہ میں بیسویں صدی میں فہرست کی صرف دو ادین سے متعلق تھیں۔

پھر چونکہ مسلمانوں میں یہ ذوق اخیر تک باقی رہا اور زوال سلطنت کے وقت بھی اس میں کوئی انقطاع پیدا نہیں ہوا، اس لئے اگر حکومت انڈس (جس سے مغربی حکومت کا تعلق، نہایت قریب کا تعلق تھا) اپنے ادبی اثرات مغربی شاعری میں چھوڑ گئی ہے تو حیرت نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جبوقت وہاں تہذیب و مدنیت اپنے انتہائی عروج پر تھی، مغرب بالکل وحشی و جاہل تھا اور حکومت اسلام ہی کے اصول حضارت و شائستگی پر اپنی آپندہ ترقی کی بنیاد قائم کر رہا تھا۔

تاریخ و جغرافیہ میں اہل عرب کے جس قدر کارنامے ہیں اور ان سے جس قدر اہل مغرب نے فائدہ اٹھایا ہے اس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں۔ ابن حوقل وغیرہ علماء جغرافیہ مشرق ہی کے لوگ تھے جن کی کتابوں اور نقشوں کے ترجمے مغربی زبان میں کئے گئے ہیں اور ابن حاتم جس نے قلب ایشیا تک سفر کر کے مختلف ممالک کے حالات جغرافی و تاریخی جمع کئے اور ابن بطوطہ مشہور سیاح و عالم ہی کے سر زمین کے جوہر تابعدہ تھے جن کی تحقیقات سے یورپ نے فائدہ اٹھایا، اور اسی کا شمار علماء قرطبہ ہی میں کیا جاتا تھا، جس کی علمی سیاحتوں کی داستانیں اب بھی اہل مغرب کو یاد ہیں اور جس کا بنایا ہوا چاندی کا کرہ جس کا وزن ۵۰ ہونڈ تھا اور جس کے ایک طرف پرورج و افلاک اور دوسری طرف کرہ ارض کا نقشہ تھا) اب بھی شاید صقلیہ میں کہیں محفوظ ہو۔

تاریخ میں مسلمانوں کی جدوجہد کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کیونکہ اہل مغرب مشرق کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کر سکتے۔ ماد قتیقہ وہ ان کی کتابوں سے مدد لیں۔ تمام مواد، تمام واقعات کا اقتباس وہ عربی کتابوں سے کرتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ آج عربی کی تمام مشہور تاریخیں یورپ کی تمام زبانوں میں منتقل ہو گئی ہیں۔ رہا فاسفہ تاریخ جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے سو اس کا حال یہ ہے

کہ جب تک ابن خلدون نے اپنا مقدمہ پیش نہیں کیا اس وقت تک یہ بات مغرب کی سمجھ ہی میں نہیں آئی کہ کن اصول پر تاریخ کو مرتب ہونا چاہئے اور اس کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے۔

عربوں کے فلسفہ سے یورپ جس حد تک متاثر ہوا ہے اُسے استاذانِ خوری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:-
”نصرت فلاسفہ یونان (فیثاغورس، ہیراکلیٹوس، امیدو کلیس، سقراط، افلاطون، ارسطو، دیقرتیس وغیرہ) کے اصول کا مطالعہ کیا بلکہ فارسی، ہندی، عبرانی اور سریانی سے بھی انھوں نے فلسفہ کی کتابیں اپنی زبان میں منتقل کیں اور جس طرح عرب میں خلیفہ مامون نے علومِ قدیمہ کو عربی میں منتقل کرنے کے لئے اپنی شاہانہ فیاضیوں سے کام لیا، اسی طرح اُنڈس میں عبدالرحمن اور اس کے خلفاء نے اہل علم کی قدر دانی کر کے عربی زبان کو فلسفہِ قدیم سے بالا مال کر دیا۔
چونکہ اہل عرب فطرتاً مبادیِ الطبیعہ کی طرف مایل تھے، اس لئے انھوں نے ارسطو کی بڑی قدر کی اور اسے معلمِ اول کے لقب سے یاد کیا، دوسرے فلاسفہ میں چونکہ دہرہمین اور لادہمین زیادہ تھے اس لئے ان کے فلسفہ پر توجہ کرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا لیکن پھر بھی ان کا شوق باز نہیں آیا، اور آخر کار مدارسِ اُنڈس ہی کے ذریعہ سے تمام اسپین اور یورپ میں فلاسفہِ قدیم کی تعلیم عام ہو گئیں۔

اُس وقت صرف اُنڈس میں ۸۰۰ مدارس ایسے تھے جن کے دروازے بلا لحاظِ ملت و ملک ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے اور اس وقت اہل یورپ اُنڈس کے کالجوں کو اسی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جس طرح آج یورپ و امریکہ کے کالجوں کو دیکھتے ہیں یہاں یورپ کے طلبہ اس قدر کثرت سے آتے تھے کہ صرف جامعہ قرطبہ میں اُن کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔
ان کالجوں کا نظام وہی تھا جو اس وقت کے مغربی کالجوں کا ہے اور بہت سی علمی اصطلاحیں جو آج یورپین زبانوں میں رائج ہیں اُنڈس ہی کے کالجوں میں وضع کی گئی تھیں، پھر ان کالجوں کا کارنامہ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سالانہ چند ہزار طلبہ کو اپنے ہاں سے فائدہ کر کے نکال دیں، بلکہ وہاں حریتِ فکر و آزادی رائے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اسپین میں علومِ طبع کا علاج ہوا اور اُنڈس کے کالجوں سے وہ فرائس و اطالیہ اور جرمنی میں پھیلے تو ایک عام حرکت ترقی کی پیدا ہو گئی اور حکومتِ کنیسہ جو نظامِ کوربی تھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے اس کے نظام کو بدل دیا گیا۔

دیگر علوم میں فلکیات و ریاضیات کی جس قدر خدمت عرب نے کی وہ بھی تاریخ کا روشن واقعہ ہے، کیونکہ سال کا انضباط و فرائس اور اس کے انحراف کی تحقیق، اعتدالِ ربیعی و خریفی کی حرکت کا تعین اور اسی طرح اور مظاہرِ فلکی کی تفتیش سب سے پہلے اہل عرب ہی نے کی، انھوں نے بروج و افلاک کے نہایت نازک نقشے طیار کئے اور مطالعہِ فلک کے لئے عجیب و غریب آلات ایجاد کئے، چنانچہ آسمت (سمت) جس سے ارتفاعِ سیارہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسطرلاب اور اسی طرح کے اور نہایت دقیق آلے اہل عرب ہی کے دماغ کا نتیجہ تھے، اگر یہ لوگ بطلمیوس کی جیسی کا عربی میں ترجمہ نہ کرتے تو وہ کتاب بالکل فنا ہو گئی تھی اور اگر ارقامِ ہندی سے یہ لوگ یورپ کو آگاہ نہ کرتے تو معلوم نہیں وہاں ارقامِ رومانیہ کب تک جاری رہتے۔

ریاضیات میں جبر و ہندسہ کے متعلق اہل عرب کی جلیل القدر خدمات سے ہر شخص آگاہ ہے، اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ تفاضل و نکال (Calculus) اور مثلثات (Trigonometry) کی وضع کا سہرا انھیں کے سر ہے، پھر جب اہل یورپ نے ترقی کی توان علوم کو بحسبہ عربی سے اپنے ہاں لے لیا اور ان کو ترقی دیکر آج اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔

السیکو تھ نے سلطنت اندلسیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ”طلیطلہ کے ایک عالم نے چار سو صد گاہیں صرف اس لئے قائم کی تھیں کہ کرۂ ارض کے لحاظ سے آفتاب کا بعید ترین نقطہ دریافت کرے اور وہ اس میں اس قدر کامیاب ہوا کہ آج باوجود فلکیات کی اس قدر ترقی کے اس میں کوئی غلطی نہیں نکالی جاسکتی۔“

ابوالحسن علی نے بھی فلکیات کے متعلق متعدد تجربے کئے اور اس سلسلہ میں وہ ارتقاع قطب معلوم کرنے کے لئے بحر متوسط کی پیمائش اور اس کی وسعت کا اندازہ کرنے پر آمادہ ہو گیا، ابن سینا نے صرف ایک ہزار بائیس ستاروں کی فہرست طیار کی تھی لیکن علماء اندلس نے اس میں اور اضافہ کیا۔

ابن رشد نے جب کہ وہ حرکت عطار معلوم کرنے کے لئے مختلف تجربے کر رہا تھا، یہ معلوم کیا کہ سطح آفتاب میں داغ موجود ہے، اسی طرح ہیسویں علماء نے اعمال فلکی و ریاضی کے متعلق بہت سے تجربے پیش کئے ہیں، جن کے آثار کبھی محو نہیں ہو سکتے البتہ یافوس ضرور ہے کہ ان کے اکثر افکار و داغ ضائع ہو گئے اور ہم تک بہت کم پہنچے، چنانچہ صرف مکتبہ قاہرہ میں چھ ہزار جلدیں موجود تھیں اور سب کی سب فنا ہو گئیں۔

مسلمانوں کے آثار فلکی و ریاضی میں سے ایک رقا ص ساعت (Pendulum) بھی ہے جس پر عہد حاضر کی گھڑیوں کی بنیاد قائم ہوئی، اسی کے ساتھ انھوں نے مختلف اجسام کے ثقل نوعی (specific gravity) کو متعین کیا اور دلیل علمی سے ثابت کیا کہ شہاب ثاقب فی الاصل حجری مادہ کی چیزیں ہیں۔

انھوں نے ہوا کی بلندی کا اندازہ کیا اور ظواہر طبیعت کی علمی تفسیر کر کے یورپ سے اس خیال کو محو کیا، کہ ان کا تعلق عالم ارواح سے ہے، ان کا شغف اس باب میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے مسجد کے میناروں سے رصد گاہ کا کام لیا۔

نوامیس نور و مرئیات کو سب سے پہلے جس نے ظاہر کیا وہ ابوالحسن علی تھا، جسے اہل یورپ (Al-Hagen) کہتے ہیں۔ اسی نے اسباب تحکس کی وضاحت کی، اس نے ستاروں کے انعکاس نور کے مبادی کو وضع کیا، اسی نے اس غلط خیال کو دور کیا کہ نور کی شعاعیں آنکھ سے پیدا ہو کر مرئیات کی طرف بڑھتی ہیں اور یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اشیر (Ether) کے وجود کو ثابت کیا، اس کی کتابیں اسپین کے کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں، جنھیں اہل یورپ نے اپنی زبان میں منتقل کر کے استفادہ کیا۔

اس امر کا قوی ترین ثبوت کہ یورپ نے عرب کے علماء فلکیات و ریاضیات کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا، وہ اصطلاحات ہیں جو یورپ میں آج بھی رائج ہیں مثلاً: (Zenith)، (Nadir)، (Almanac) اور (Mukawala) (Azimuth) کہ اصل میں یہ عربی الفاظ سمت، نظیر، اعمات، المقطر اور

السموات تھے۔

اسی طرح ستاروں کے اکثر نام براہ راست عربی سے لئے گئے ہیں مثلاً: سماک، سہی، عقرب، دیران، جوزا حوت، نطق، ثور، الغول، الحبل، العیوق وغیرہ۔

اہل عرب کو علم الکیمیا کے ساتھ بھی بڑا شغف تھا، یہ علم اول اول ساحل نیل سے پیدا ہوا تھا اور گاہنہیں مصر کے سینوں میں راز کی صورت سے پایا جاتا تھا، ان سے بظاہر نے حاصل کیا اور پھر اہل عرب نے حاصل کر کے اس کو ترقی دیکر علم کے مرتبہ تک پہنچا دیا چنانچہ مورنین یورپ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ علم الکیمیا اور علم العقاقیر والادویہ کی وضع و بنیاد کا خزانہ اہل عرب کو حاصل ہے۔
 (Nitric Acid) مار الذہب (Nitro Hydro Chloric Acid) زیت الزاج (Sulphur)
 (ie Acid) البوتاس یا روح النوشاور (Ammonia) جبرجہنم (Silver Nitrate)
 الیمانی (Mercuric chloride) الراسب الاحمر (Mercuric oxide) ملح اقلی (Alkali)
 البورق (Borax) الزرینج (arsenic) وغیرہ بہت سے ایسے مرکبات کیمیاوی ہیں جو اہل عرب اپنے بعد مکمل کر کے چھوڑ گئے۔

چونکہ بعض خلفاء انڈس کو علم الکیمیا کی طرف خاص رغبت تھی، اس لئے اسپین میں کثرت سے کیمیائی محل قائم کئے گئے جن کی حکومت کی طرف سے اکثر تحقیق و تفتیش ہوتی رہتی تھی اور اس بات کی بڑی چابچ ہوتی تھی کہ کوئی دوا ساز خراب دوائیں نہ فروخت کرے اور نہ قیمت زیادہ لے سکے، فریڈرک ثانی نے طب اور دوا سازی کے اصول یہیں سے اخذ کر کے اپنے ملک میں جاری کئے۔ بارود کے متعلق بھی علماء کا اتفاق ہے کہ یورپ نے اُسے اہل انڈس ہی سے حاصل کیا۔

علم نباتات میں اہل عرب کی یہ فضیلت کبھی محض نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے سب سے پہلے ولیقوریس، جالینوس اور علماء ہند کی مولفات کو اپنی زبان میں منتقل کیا اور پھر ان میں اپنے ذاتی تجربات و تحقیقات سے سیکڑوں دواؤں کا اضافہ کر کے ان کے اشکال بتائے ابن البیطار المالطی نے مشرق و غرب کا سفر کر کے خود ان مقامات کو دیکھا جہاں نباتات اُگتے تھے اور پھر ان کی پوری کیفیت اپنی کتاب میں درج کی ہے، جسے اہل یورپ نے اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا۔

اُس وقت یورپ کا یہ حال تھا کہ کنسیہ اور سحر کی قوت سے ہر شخص مرعوب نظر آتا تھا، اہل کنسیہ کہا کرتے تھے کہ جتنے امراض لاحق ہوتے ہیں یہ سب آسمانی عذاب ہیں اور شریہ روحیں ہیں جو گناہگاروں کے جسموں میں حلول کر کے تکلیف پہنچاتی ہیں، اسلئے جب تک ارباب کنسیہ کی شفاعت حاصل نہ کی جائے ان امراض سے چھٹکارا پانا محال ہے، دوسری طرف سحر کے مدعی کہتے تھے کہ ہم اپنی قوت سحر سے امراض کو دور کر سکتے ہیں اور اس طرح یہ لوگ ارباب کنسیہ کے مقابل تھے اور ان دونوں میں باہم شدید مخالفت تھی، الغرض یورپ اس جہل و تاریکی میں مبتلا تھا، جب کہ اہل عرب تمام بلاد اسلامیہ میں علم طب و علم الادویہ کی ترقی کو اس کی انتہائی درجہ تک پہنچا چکے تھے، اور اس کے علم کے ماہرین کی اس قدر کثرت تھی کہ صرف بغداد میں ۹۰۰ طبیب موجود تھے۔

بعد کو جب یورپ نے دیگر علوم کے ساتھ علم طب کو بھی عربوں سے حاصل کیا تو بارہویں صدی سے لیکر سترہویں صدی تک جن کتابوں پر ان کا مدار رہا وہ رازی، ابن سینا اور ابن زہری کی تصانیف تھیں جنہوں نے اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش سے قدیم علم طب کو بہت زیادہ وسیع و مفید بنا دیا تھا۔

عہد خلفاء میں انڈس اپنی تہذیب و مدنیت کے لحاظ سے لندن و پیرس سے دس گنا ہی ممتاز تھا، جس طرح اہل انڈس مغربی اقوام سے یقیناً اس وقت جو تہارتی، علمی اور صنعتی ترقی انڈس کو حاصل تھی وہ آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی انڈس کی آمدنی دسویں صدی یعنی عبدالرحمن الناصر کے عہد میں ۳۰۰ ملین ڈالر تھی اور آج حکومت انگلستان کی آمدنی ۱۸ ملین ڈالر سے زائد نہیں ہے، اسی طرح انڈس کی آبادی ۱۰۰ ملین تھی اور انگلستان کی آبادی ملکہ الیزبتھ کے زمانہ تک چار ملین سے زیادہ نہ بڑھ سکی، اسی کے ساتھ اگر ترقی تجارت، زراعت، علوم و فنون کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ اور عہد انڈس کے ترقی علوم و فنون کے آج بھی انڈس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اُس وقت کی علمی ترقی کا ادب نے ثبوت مکاتیب عمومیہ کی کثرت اور کتابوں کی تعداد سے مل سکتا ہے، قصر کے کتبہ مستصر میں ۸۰ ہزار جلدیں پائی جاتی تھیں اور مکتبہ طرابلس میں دو لاکھ۔ جب آثار یوں نے بغداد کو تباہ کیا اور کتب خانے برباد ہوئے تو وہ جلد کتابوں سے پٹا پڑا تھا، قرطبہ کے کتب خانے میں ۶ لاکھ کتابیں مختلف زبانوں کی موجود تھیں۔

یورپ اس وقت اور اس کے بعد عرصہ تک اس قدر جاہل رہا کہ کلیلو کو اپنے علمی اکتشاف پر بادشاہ کے سامنے اظہارِ مذمت کرنا پڑا، حالانکہ اس سے ۶ صدی قبل ابن یونس خلیفہ کے سامنے ریاضی اور الکلیات کے مسائل پیش کرتا تھا اور انعام پاتا تھا۔

یورپ کا عالم نہایت سر و پیوس صرف اس امر کے اظہار پر کہ فلسطین خشک مقام ہے اور وہاں دودھ اور شہد کثرت سے نہیں پایا جاتا، مصیبت میں ڈالا جاتا ہے کیونکہ یہ بیان توراۃ کے خلاف تھا، لیکن جبوقت کوئی جغرافیہ کا عالم خلفاء عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو اس کی عزت کی جاتی تھی۔ اسی طرح برونیسیون تقلید کنیہ کی مخالفت میں قتل کیا گیا حالانکہ اس سے سات صدی قبل ابن عرب حریت دینی کا اعلان کر چکے تھے۔ یورپ کے جن لوگوں نے علوم عرب کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا، انکی قبرست طویل ہے لیکن ان میں سے بعض نے بہت شہرت حاصل کی، مثلاً راہب، گربٹ، یہ دسویں صدی میں کلیہ قرطبہ سے فاضل ہو کر نکلا اور اطالیہ و فرانس میں متعدد مدارس اس نے قائم کئے۔ یہ شخص بعد کو سلوٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم کی جگہ انتخاب کیا گیا، اس نے کنیہ کی دیواروں کے اندر فضلاء و عصر کو جمع کر کے ترجمہ کا کام جاری رکھا اور چار سو کتابوں سے زیادہ اس نے ترجمہ کرائیں، اس کے معاونین میں خاص خاص لوگ ریونڈنٹنر ایس ہران، میکال اسکوتیہ اور یوحنا شیلی تھے۔ تیرہویں صدی میں پرتوس گنوس، روبرٹو ستھ، روجراکن نے بھی بہت سی کتابیں عربی سے ترجمہ کیں، ان میں پہلا کیمیاوی اور فیلسوف تھا اس نے بارود کی ترکیب بل عرب سے حاصل کی، دوسرے نے اصلاح دینی کی طرف توجہ کر کے کنیہ کی قوت کا انکار کیا۔ تیسرے نے ابن شیم کے مسرہ نو کر حاصل کر کے عینک کی ساخت اسکی بنیاد پر جاری کی۔ اسی فرقہ اور بہت سے علماء مغرب تھے جنہوں نے انڈس کی ترقی علوم و فنون سے فائدہ اٹھا کر اپنے ملک میں ان کو رائج دیا اور اب بھی مشفق مزاج مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

فنون لطیفہ اور اسلام

آج کی صحبت میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ فن تصویر کشی کا رواج مسلمانوں میں کس حد تک پایا جاتا تھا اور اس میں انھوں نے کوئی حصہ کیا یا نہیں؟ لیکن اس جگہ ہم کو واضح کر دینا چاہئے کہ فن تصویر سے ہماری مراد وہ نقوش ہیں جو کپڑے، دیوار، ظروف اور کتابوں وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں اور تیشیل سے مراد مجسمہ سازی یا بُت تراشی ہے خواہ پتھر سے ہو یا کسی اور جامد چیز سے، اس لئے سلسلہ مضمون میں جہاں جہاں لفظ تصویر یا تیشیل ہوا اس کو اس معنی میں لینا چاہئے جو ابھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

کپڑوں پر تصویروں کا استعمال تو جاہلیت و اسلام دونوں زمانوں میں بہت معروف و مروج تھا اور شعرائے عرب کے کلام سے اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے، چنانچہ امرؤ القیس لکھتا ہے:-

خرجت بہا تمشی تجر و راونا علی اثرینا ذیل مرط مرقل

”مرط مرقل“ یعنی ایسی چادر جس پر محل کی تصویریں بنی ہوں اور اگر اس کو ”مرقل“ پڑھا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس پر آدمیوں کی صورتیں منقوش تھیں۔ خود رسول اللہ کا ایسی چادریں استعمال کرنا بعض احادیث سے ثابت ہے مثلاً:-

(۱) ان رسول اللہ صلعم خرج ذات یوم دعلیہ مرط مرقل

(۲) کان یصلی دعلیہ من ہذہ المرقلات

عربی زبان میں جو کپڑوں کے نام رائج تھے خود ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس قسم کے نقوش ان میں پائے جاتے تھے، مثلاً جب کسی کپڑے پر تیروں کے نقوش ہوتے تھے تو اسے ”مستہم“ کہتے تھے (مستہم تیر کو کہتے ہیں) اسی طرح جس کپڑے پر چڑیوں کی صورت ہوتی تھی اسے ”مطیر“ جس پر گھوڑے بنے ہوئے تھے اسے ”مخیل“ جس پر درخت وغیرہ منقوش ہوتے تھے اسے ”مشجر“ کہتے تھے اور اسی طرح کے اور بہت سے نام اسی نسبت سے رکھے گئے تھے مثلاً مسیف، مہلل، مکعب، معرض، معقد، معقد وغیرہ۔ جس کپڑے پر انگوٹھیاں بنی ہوتی تھیں اسے ”سجلاط“ اور جس پر ترنج بنے ہوتے تھے اسے ”سینہ“ کہتے تھے۔

ایک شاعر معرکہ عقد الدولہ کی تعریف کرتا ہے کہ:

واجو ثوب بالنسور مطیر والارض فرش بالجیاد مخیل

یعنی فضا میں جو عقاب ہی عقاب اڑ رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی کپڑا ہے جس پر پرندوں کی صورتیں منقوش ہیں اور زمین گھوڑوں کی

کثرت سے ایک ایسا فرش نظر آتی تھی جس پر گھوڑے ہی گھوڑے بنے ہوئے ہیں۔

عربوں کا خود اس صنعت کو اختیار کرنا لکڑی کے اُن تختوں سے ثابت ہوتا ہے جو بطور آثار کے قاہرہ کے میوزیم میں موجود ہیں، پردوں پر بھی تصاویر و نقوش کا رواج عربوں میں پایا جاتا تھا جس کی سب سے بڑی شہادت حضرت عائشہ کی یہ حدیث ہے:-

”قدم رسول اللہ صلعم من سفر و قد سترت سهوة لي بقرام فيه تماثيل فلما راه رسول اللہ صلعم تلون وجهه وقال يا عائشة اشد الناس عذابا عند اللہ يوم القيامة الذين يضاہون بخلق اللہ فقطعناه فجعلنا منه وسادة او سادتين“۔

یعنی رسول اللہ صلعم سفر سے تشریف لائے۔ میں نے ایک طاق پر پردہ ڈال رکھا تھا جس پر صورتیں منقوش تھیں، یہ دیکھ کر رسول اللہ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا اے عائشہ قیامت کے دن ان لوگوں پر سخت عذاب ہوگا جو اللہ کے مخلوق کی شبیہیں بنائے ہیں، پس ہم نے اُس پردہ کو کاٹ کر ایک یاد دہانی کے غلاف بنائے، اسی بنا پر بعض فقہانے فرش وغیرہ کے لئے جہاں تصویریں پامال یا غیر ہتیم بالشان حالت میں رہیں، تصویر دار کپڑوں یا اشیاء کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔

اہل عرب صرف دروازوں ہی پر نہیں بلکہ زیبائش کے لئے دیواروں پر بھی پردے لٹکاتے تھے جنہیں حائلۃ کہتے تھے صاحبِ نفطی نے ان پردوں کے نقوش کی بہت تعریف کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں دیواروں اور دروازوں پر پردے آویزاں کرنے کا رواج اہل عرب ہی سے منتقل ہوا ہے۔

خیموں میں بھی تصویریں منقوش کرنے کا رواج عہد اسلام میں پایا جاتا تھا، چنانچہ تنبی نے سیف الدولہ کے خیمہ کی تعریف میں اس کے نقوش وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ مقررین نے بھی مصوٰر خیموں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اُن میں سے بعض مفیل، مستع، مختل، مطوس، مطیر ہوتے تھے (یعنی ہاتھی، درندے، گھوڑے، طاؤس اور پرندوں کی تصویریں اُن پر منقوش ہوتی تھیں) اور بعض آدمیوں کی بھی صورتیں ہوتی تھیں۔

دیواروں کے نقش و نگار کا حال بھی ابنِ حدیس، ابوالصلت اور دیگر شعراء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ فاطمی خلیفہ امر باحکام اللہ نے اپنے ایک قصر میں تمام شعراء کی تصویر دیواروں پر بنوائیں اور ہر شاعر سے ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کرایا اور ہر تصویر کے پاس طاق میں ایک ایک قصیدہ، اشرفیوں کی سربہر رکھوا دیں ہر شاعر آتا تھا اور اپنے حصہ کی تھیلی طاق سے اُٹھا کر لیتا تھا۔

جب اشرف خلیل قلعۃ الجبل پر قابض ہوا تو اُس نے اس کو بہت بلند کرایا، پیسہ دے کر دیواروں پر تمام اہل دولت کی تصویریں بنوائیں اور قبہ کو نہایت نفیس نقش و نگار سے آراستہ کرایا۔

وزیر شمس الدین جوینی کے بیٹے شرف الدین بارون نے جوہام بغداد میں تیار کرایا تھا وہ اپنی آرائش کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز تھا، اس کی دیواریں صیقل کی ہوئی تھیں، اُن پر نہایت حسین تصویریں کی گئی تھیں، فرش رنگین ٹائل کا تھا، تمام برتنوں پر سونے چاندی کی قلعی تھی اور بعض فواروں پر چڑیاں قائم کی گئی تھیں جن سے پانی نکلتے وقت آواز پیدا ہوتی تھی۔

ظروف وغیرہ پر بھی اہل عرب عمدہ نقوش و تصاویر کندہ تھے، پیناچر اس زمانہ کے شمع دان، فانوس، عطردان، پیئے اور کھانے کے

برتن وغیرہ اب بھی ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی اس صنعت پر کافی روشنی پڑتی ہے، فسطاط کے کندھوں میں سے حال ہی میں بعض چینی کے برتن نہایت صاف و رنگین دستیاب ہوئے ہیں اور ان پر انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں منقوش ہیں۔ یہ برتن خالص عربی صنعت کے نمونے ہیں کیونکہ اُن پر صناعتوں کے جو نام لکھے ہوئے ہیں وہ سب مصر و شام کے ہیں۔ قاہرہ کے دارالآثار میں ایک عطر دان عربی صنعت کا ایسا پاتا جاتا ہے جس پر چاندی کا ملمع ہے اور اس باب نشاط کی تصویریں منقوش ہیں جو آلات موسیقی بجا رہے ہیں، ایک برتن یہاں محمد بن فضل اللہ کا بنایا ہوا ہے جس میں چڑیوں کی صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ دوسرے برتن میں ایک سوار کی تصویر ہے اسی طرح اور متعدد ظروف ہیں جن پر مختلف جانوروں اور چڑیوں کی تصویریں کندہ ہیں۔ کاپچے کے فانوس اور شمع دان بھی اس صنعت کے پائے جاتے ہیں اور یہ سب کے سب اہل عرب کے بنائے ہوئے ہیں۔

ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ قصر فاطمین میں خلیفہ مستنصر کا ایک آفتاب ہے جو خالص سونے چاندی کا ہے، اس پر چڑیوں اور شکاریوں کی نہایت نازک و پاکیزہ تصویریں منقوش ہیں، دارالآثار میں ایک لکڑی کی تختی ہے جس پر کسی طائر کی عجیب و غریب صورت کندہ ہے ایک لکڑی کے دروازہ کا بھی اسی سفر نامہ میں ذکر ہے جس میں نہایت نازک تصویریں جانوروں کی کندہ کی ہوئی ہیں۔

سکول پر بھی تصاویر کا رواج عہد اسلام میں پایا جاتا تھا۔ سیف الدولہ نے جو دینار مسکوک کرائے تھے اس میں اسکا نام بھی تھا اور اسکی تصویر بھی سلطان ظاہر بہر سے شیر کی تصویر اپنے سکے میں منقوش کرائی تھی۔ ترکی اور چرکسی بادشاہوں میں سے کسی نے شیر کی تصویر پسند کی کسی نے عقاب کی اور کسی نے پھول کی۔ امراء کے لئے اُن کے منصب کے لحاظ سے خاص خاص نشان ہوتے تھے، مثلاً افسر اسلحہ خانہ کا نشان تلوار اور آبدار خانہ کے افسر کا نشان پیالہ ہوا کرتا تھا۔ پتھر کی مہروں پر بھی تصویروں کے کندہ کرنے کا رواج تھا۔ چنانچہ دارالآثار میں دو نگینے ایسے ہیں جن پر شہر کی تصویر کندہ ہے اور دو تختیاں سنگ مرمر کی ایسی ہیں جن پر اڑتے ہوئے عقاب کی صورت منقوش ہے۔ ایک اور تختی ہے جس پر چار مچھلیاں بنی ہوئی ہیں، ایک ٹائل کا ٹکڑا ہے جس پر دو تلواریں ہیں اور اُن پر ہلال منقول ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اسلام میں تمام امراء کا ایک مخصوص نشان ہوا کرتا تھا جس کو آج کل کوٹ آف آرمز (Coat of arms) کہتے ہیں اور مختلف حکومتوں نے اختیار کر رکھا ہے، اسی طرح اُن کی مہریں بھی ہوتی تھیں اور مائوڈ (motto) بھی ہوا کرتا تھا۔

کتابوں کے مصور کرنے کا رواج فارس میں بہت تھا لیکن عربوں میں بھی اس کا فقدان نہ تھا۔ چنانچہ احمد تیمور نے جن مصور کتابوں کا ذکر کیا ہے اُن میں سے بعض کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اُس نے علم قراءۃ کی بعض کتابوں کو دیکھا ہے جن میں مخارج حروف بتانے کے لئے حلق، منہ اور زبان کی تصویریں بنائی گئی ہیں اور بعض میں پورا چہرہ بھی دکھایا گیا ہے، اسی طرح بعض طب کی کتابیں ہیں جن میں آنکھ وغیرہ کی پوری تشریح تصویر کے ذریعہ سے بتائی گئی ہے اور سحر العیون ایسی ہی ایک کتاب ہے جو ۱۲۷۶ء میں مصر میں طبع ہوئی تھی۔ علم سبطہ کی بھی بعض کتابیں ایسی نظر آتی ہیں جن میں گھوڑوں کی تصویریں ہیں اور اُن کے امراض کا حال بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے علم نباتات کی بھی بعض کتابیں مصور تیار کی گئی تھیں، چنانچہ رشید الدین ابن الصوری کی ناوہ تصنیف کا ذکر عیون الانباء میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ”یہ کتاب اس طرح طیار کی گئی ہے کہ مولف خود ان مقامات پر جاتا تھا جہاں کوئی پودا دوا کا اُگتا تھا اور اُس کے ساتھ ایک مصور

ہوتا تھا جو پودے کے رنگ، پھول، پھل کی صورت، پتیوں کی تعداد، شاخوں کی حالت کو اس وقت دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کھینچ لیتا تھا پھر یہ تصویریں ایک ہی حالت کی نہ ہوتی تھیں، بلکہ نشوونما کے مختلف زمانوں میں جا جا کر پودے اور پھول کی مختلف حالتوں کی تصویریں جاتی تھی یہاں تک کہ ابتدا نشوونما سے لیکر اس کے مرجھانے کی حالت تک مختلف زمانوں کی کیفیت تصویر میں ضبط کر لی جاتی تھی۔

بعض ادبی کتابیں بھی (مثلاً مقامات حریری، کلیلہ دمنہ، مرزبان نامہ) رنگین و مصور طیار کی گئی تھیں۔ اسی طرح یا قوت کی معجم، تقویم ابی الفدا، نخبۃ الدہر بھی مصور طیار ہوتی تھیں جن میں شہروں کے نقشے، آلات، فلکی صورتیں رنگین تھیں۔

بلقینی کی نیل الرائد، سیوطی کی کوکب الروضہ بھی رنگین تھیں جن میں دریائے نیل کا منبع اور اُس کی شاخیں دکھائی گئی تھیں اور تاریخ حجاز بھی مصور تھی جس میں حرم اور کعبہ کا نقشہ رنگین تھا۔ مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں ذکر کیا ہے کہ میں نے بھی بہت سی تصویریں دیکھی ہیں، لیکن عہد مامون کے وہ نقشے عجیب و غریب ہیں جن میں تمام ممالک اور جملہ قوموں کا حال معہ تمام نجوم، افلاک، دریاؤں سمندروں، صحراؤں اور شہروں کے رنگین تصویروں میں بتایا گیا ہے۔

مقدسی کی احسن التقاسیم اس طرح طیار ہوئی تھی کہ ہر ملک کے شہر اور قصبات مع اُن کے حدود کے علیحدہ علیحدہ دکھائے گئے تھے، اور راتے سرخ لکیروں سے، رنگستان زرد رنگ سے، سمندر سبز رنگ سے، دریا نیلگوں رنگ سے اور پہاڑ سیاہ رنگ سے نمایاں کئے گئے تھے، ہیئت کی تو تقریباً تمام کتابیں تصویر دار ہوتی تھیں جن میں جملہ ثوابت و سیار کی صورتیں درج ہوتی تھیں، بعض میں آلات رصد کی صورتیں بھی منقوش کی گئی تھیں، اسی طرح ہندسہ کی کتابیں بھی نقشوں اور رسوم سے مزین ہوتی تھیں، اور موسیقی، علم، الجیل، سپہ گری کی کتابیں بھی مصور طیار کی گئی تھیں، جن میں آلات موسیقی، آلات جبر ثقیل، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی مختلف حالتوں کی تصویریں درج تھیں اور علم جفر و سحر کی کتابوں میں بہت سے جانوروں، پرندوں اور کھڑے کھڑوں کی رنگین تصویریں بنائی جاتی تھیں، چنانچہ ایسی کتابوں میں شیخ محمد الطیار الدمشقی کی کتاب موسیقی میں، ابن رازکی کتاب الجیل فی العلم والعل، رضوان بن محمد کی کتاب علم الساعات، کتاب السؤل والا مینۃ فی تعلیم اعمال الفروستینہ، علم سحر میں عیون الحقائق، ابن طلحہ کی جفر صغیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چونکہ تصویر کی قسم میں مجسمہ سازی اور بت تراشی بھی شامل ہے، اس لئے اہل عرب نے اُس میں بھی کافی ترقی کی تھی، قبل اسلام عرب میں بت سازی کا رواج تو اُن بتوں سے ظاہر ہے جو خود کعبہ کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے اور بعد اسلام بھی اس فن کا رواج مختلف صورتوں سے پایا جاتا تھا۔ یمن کے قصر غدان میں شیروں کے بڑے بڑے مجسموں کا پایا جانا۔ شعراء کا عورتوں کو ہاتھی دانت کے ترشے ہوئے بتوں سے تشبیہ دینا اور سچوں کا سنگین گڑیوں سے کھیلنا اس امر کا ثبوت ہے کہ عرب میں تمثیل کا بھی رواج تھا۔ جب رسول اللہ صلعم غزوہ تبوک سے تشریف لائے اور طاق میں حضرت عائشہ کی گڑیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو اپنے دریافت کیا کہ ”یہ کیا ہے“ حضرت عائشہ نے جواب دیا ”میری گڑیاں ہیں“ انھیں میں ایک گھوڑا تھا جس کے دوپہر تھے اپنے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کیا آپ کو نہیں معلوم کہ سلیمان کے پاس ایک گھوڑا تھا جس کے پر تھے یسوع کریم رسول اللہ صلی علیہ وسلم اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعد آغاز اسلام تمثیل کا رواج قائم رہا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محض لہو و لعب یا تفریح کے لئے

تائیل کا استعمال جائز ہے۔

بعض تائیل آٹے کے بھی طیار کئے جاتے تھے اور انھیں پکا کر قوام میں ڈال دیتے تھے اور کھاتے تھے، جس طرح یہاں بھی بچوں کے لئے آٹے کی چڑیاں وغیرہ بنا کر آگ میں سینک دیتے ہیں۔ بعض مٹھائیاں بھی اسی قسم کی بنائی جاتی تھیں چنانچہ ابن جبر نے اپنے سفر نامہ میں بعض ایسی مٹھائیوں کا ذکر کیا ہے جو بالکل انسانی شکل کی بنی ہوئی تھیں اور عبید اللہ بن خلکان نے متنبی شاعر کو شکر اور لوز کی ایسی مٹھائی تحفہ دی تھی جو بالکل مچھلی کی طرح تھی اور شہد میں ڈوبی ہوئی تھی چنانچہ اُس نے اس ہدیہ کی تعریف میں متعدد شعر کہے۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے :-

اقل ما فی اقلہا سبک بلعب فی برکتہ من لعل

کھیتوں میں بھی آدمیوں کی تائیل قائم کی جاتی تھیں تاکہ جانور ڈر کر بھاگ جائیں :-

جب اسلام کا تمدن وسیع ہوا تو زینت قصور کے لئے تائیل کا استعمال ہونے لگا اور سنگ مرمر، تانہ، رانگ، اور چاندی وغیرہ کی مورتن عجیب و غریب تصنیف کے ساتھ بنائی جانے لگیں، چنانچہ متنبی نے مجلس ابن عمار کی ایک سنگین کنیز کا ذکر کیا ہے جس کے بال ایکٹر کوڑھتے تھے، ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا اور وہ ایک کمافی پر گردش کیا کرتی تھی۔

اسی طرح ہبیار الدیمی شاعر کے ایک رئیس دوست نے جو ہشت پہل حوض بنوایا تھا اور جس کی صنعت کی اُس نے بہت تعریف کی ہے عجیب و غریب چیز تھا۔ اس حوض کے چاروں طرف چار منبر قائم تھے جو کھوکھلے تھے۔ اس کے درمیان ایک عمود تھا اور مکان کی چھت پر ایک حوض تھا۔ اُس سے یہاں پانی آتا تھا۔ کئی مجسمے تھے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے اور عمود پر قائم کرنے سے عجیب و غریب حرکات اُن سے سرزد ہوتی تھیں، اُن میں سے ایک کا نام خرکار تھا یہ جس وقت قائم کر دیا جاتا تھا تو گردش کرنے لگتا تھا اور اس کے اوپر سے پانی بالکل اس طرح گزرتا تھا جیسے خیمہ قائم ہو گیا ہو اس کے چاروں طرف شمعیں بھی رکھ دی جاتی تھیں جو ساتھ ساتھ گردش کرتی تھیں اور گل نہیں ہوتی تھیں۔ دوسرے مجسمے کا نام عروس تھا یہ عمود کے اوپر رقص کرتا تھا اور دوران رقص میں پانی اُس کے سر سے ہاتھوں تک پہنچتا تھا، تیسرے مجسمے کا نام جل (اونٹ) تھا اور چوتھے کو طنبلنب کہتے تھے اُس کی صورت ایک تیر انداز کی تھی، اگر حاضرین میں سے اُس پر کوئی شخص تیر چلا تا تو اُس کے جواب میں اُدھر سے پانی کی ایک دھار چلتی اور بھگو دیتی۔

سدید الدین شیبانی کے پاس ایک پیالہ تھا جس کے درمیان میں ایک چڑیا قائم تھی جب پانی اس پیالہ میں ڈالا جاتا تو وہ ناچنے لگتی اور بونے لگتی۔ نعیمی نے تنبیہ الطالب والدارس میں دمشق کے جامع اموی کی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے جس میں مجسمے عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے اُس نے بیان کیا ہے کہ اُس گھڑی میں چند چڑیاں، ایک سانپ اور کو اتا بنے کے بنے ہوئے موجود تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تو سانپ نکلتا، چڑیاں بونے لگتیں اور کو اتا پیچنے لگتا۔

ابن جبر نے باب جبرون کی گھڑی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس میں تانہ کے دو باز تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تھا تو اُن کے منہ سے دو جھانچے پیدا ہو کر بجنے لگتی تھیں۔

سن ۸۷۵ء کے حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسکندریہ سے کچھ تیرانداز آئے ان کے ساتھ لکڑی کی بنی ہوئی ایک عمارت قلعہ کی صورت بھی تھی، بادشاہ کے سامنے آکر انھوں نے اس پر تیراندازی کی تو قلعہ کے اندر سے ایک آدمی نکلا جو تلوار اور ڈھال لئے ہوئے تھا بادشاہ نے اُن کو بہت انعام دیا اور رخصت کر دیا۔

یمن کے بادشاہ نے سلطان الکامل ایوبی کے پاس ایک شمعدان تحفہ بھیجا جو تانبہ کا بنا ہوا تھا، فجر کے وقت اُس کے اندر سے تانبے کی ایک مورت پیدا ہو کر سیٹی بجاتی تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ شمعدان ناصر محمد بن قلاوون کے زمانہ تک خزانہ شاہی میں موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مورتیں ہی طیار نہ کرتے تھے، بلکہ پانی، کمانوں، اور ہوا کے ذریعہ سے وہ اُن میں عجیب و غریب تفنن بھی پیدا کرتے تھے مقرر نے ذکر کیا ہے کہ باب صلاۃ پر جہاں سے احمد بن طولون نکل کر مسجد میں جاتا کرتا تھا دو بڑے بڑے مجسمے شیروں کے قائم تھے۔ عنبر کی مورتیں خزانہ شاہی میں ۲۲ ہزار کے قریب تھیں، جن میں چھوٹے سے چھوٹا مجسمہ ۲۰ سیر کا تھا، طاؤس کی تمثال کا حال لکھا ہے کہ خالص سونے کا تھا اور جسم میں قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے آنکھیں یا قوت کی تھیں، اسی طرح مرغ اور ہرن کی تمثالیں تھیں، ایک باغ کی بھی مصنوعی نقل تھی۔ جس کی زمین عود کی تھی اور درختوں کے پھل عنبر کے یہ بھی بالکل سونے چاندی کے کام سے لدا ہوا تھا۔ کشتیوں کے اگلے حصہ کو بھی مختلف حیوانوں کی صورت پر بنانے کا کثرت سے رواج تھا۔

اندلس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تھا میر ذمائل کا کثرت سے رواج تھا اور عجیب و غریب اختراعات تفنن سے کام لیا جاتا تھا، صاحب نفع الطیب نے سلطان المسمان ابی حموی کی ایک گھڑی کا ذکر کیا ہے کہ اُس میں چھوٹے چھوٹے دریچے تھے، اور جب گھنٹہ بجاتا تھا تو اُس سے متعلق دریچے کھلتا تھا اور ایک مسین گیند نکلتی تھی جس کے ہاتھ میں ایک رقعہ ہوتا تھا اور اُس پر وقت درج ہوتا تھا۔ کینز اس رقعہ کو بادشاہ کے ہاتھ پر نہایت نزاکت سے رکھ دیتی تھی۔

یہ تھا مختصر بیان اہل عرب کی صرف مصوری و تمثال سازی کا جس کا تعلق فنون لطیفہ کے دیگر اصناف سے نہیں ہے مالا مال نہیں بھی اُن کی ترقی اسی قدر حیرت انگیز تھی۔ حدادی۔ بخاری، پارچہ بافی اور آلات سازی میں بھی ان کے کارنامے نہایت عجیب و غریب ہیں اور فن تعمیر کو تو انھوں نے اس قدر مکمل طور پر اختیار کر لیا تھا کہ مشکل سے اُس کی نظیر مل سکتی ہے۔ موسیقی دانی کے لئے اُن کے مشہور ہی ہیں یہاں تک کہ بیس جلد کی ایک کتاب اغانی ساری کی ساری اس فن کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔

۱۔ کتاب الاغانی کے مصنف کا نام علی بن الحسین بن محمد بن احمد القراشی الاصبہانی تھا اور کنیت ابو الفرج۔ اس کا تعلق خاندان بنی امیہ سے تھا۔ ۲۱۴ھ میں پیدا ہوا اور بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا انتقال ۳۵۶ھ میں ہوا۔ اس کی تصنیف کتاب الاغانی بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے سب سے پہلے وہ ۱۰۰ نغمے نقل کئے ہیں جو عہد باردان الرشید کے مشہور مغنیوں (ابراہیم معلی، اسماعیل اور قلیح وغیرہ) نے وضع کئے تھے۔ ان کے علاوہ عہد خلفاء کے دوسرے مشہور گویوں کے گانے بھی اس نے جمع کئے۔ یہ کتاب بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

آلات اور تمدن

انسان کی جامع تعریف میں صرف یہ کہ دینا کافی ہے کہ ”وہ آلات بنانے والا حیوان ہے“ اگرچہ بعض بندر بھی آلات کا استعمال کرتے ہیں، ایک دوسرے کو پتھروں سے مارتے ہیں، آپس میں لکڑیوں سے بھی لڑتے ہیں، لیکن آلات اُن کی صنعت ہے طیار نہیں ہوئے، بخلاف انسان کے کہ وہ سوچ سمجھ کر آلات کو بناتا اور اُن کا استعمال کرتا ہے۔

اختراع آلات نے انسان کی گزشتہ تاریخ میں کیا کیا انقلابات پیدا کئے اور مستقبل میں اُن آلات کی بدولت کیا کچھ ہونے والا ہے، اس سوال کا جواب صرف اس وقت دیا جاسکتا ہے جب انسان کے تمدنی ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

ابتداء میں انسان بھی اور حیوانات کی طرح کسی قسم کے آلات و اوزار کا استعمال نہیں کرتا تھا لیکن جب رفتہ رفتہ اُس کے معلومات میں وسعت پیدا ہوئی اور تجربات سے اُس نے سبق لینا شروع کیا تو پہلے پتھر کے نہایت معمولی اور بھدے آلات بنائے اور ایک عرصہ تک انھیں استعمال کرتا رہا، چونکہ ابتداء میں صرف شکار پر اس کی گزرتھی، اس لئے شکار حاصل کرنے کے لئے ان حجری آلات سے مدد لیجاتی تھی (یہ حجری آلات آج کل علماء اثر نے زمین کھود کر نکالے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں)

اس کے بعد انسان نے رفتہ رفتہ تمام دھاتیں دریافت کیں، لوہے سے مختلف قسم کے اوزار و آلات بنائے اور انھیں آلات کی بدولت تمام صنائع و فنون میں ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انسان تمدن کی موجودہ حد تک پہنچ گیا، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، لاسکی، ریل، جہاز، طیارے اور اسی قسم کی ہزار ہا مفید ایجادیں صرف آلات کی بدولت ہوئی ہیں اور یہ سب ایجادیں بھی خود آلات ہیں، جنکو انسان اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرتا ہے۔

سیاسی حریت بھی آلات کے | چودھویں صدی عیسوی میں یورپ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا، جن پر آزاد امرا کی سیادت
فریضہ سے حاصل ہوئی | تھی، یہ امراء بڑے بادشاہوں سے نہایت خفیف سا تعلق رکھتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں اور جاگیروں میں خود مختار تھے، وہاں کے تمام انتظامات انھیں کے ہاتھ میں تھے اور وہ زمین کے مالک تھے، مزدوروں کو اپنا غلام سمجھتے تھے، فنون سپہ گری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ملواریز، نیزے ڈھال اور زہرہ وغیرہ قدیم ہتھیاروں سے لڑائی میں کام لیتے تھے۔ ان کی سکونت چھوٹے چھوٹے قلعوں میں ہوتی تھی یا اگر کوئی فریق مغلوب ہو جاتا تھا تو وہ اپنے قلعہ میں پناہ لیتا تھا اور محاصرہ کرنے والوں پر اندہی سے پیر اندازی کرتا تھا یہاں تک کہ وہ آخر کار تنگ آکر محاصرہ چھوڑ دیتے تھے۔

ایک مدت تک یورپ میں مالکان آراضی اور امراءے جاگیر کا دور رہا اور لوگ اُن کے غلام بنے رہے۔ چودھویں عیسوی میں ایک عجیب و غریب آله جو نہایت خوفناک اور تباہ کن تھا میدان جنگ میں استعمال کیا گیا۔ یہ وہ آله ہے جسے ہم توپ کہتے ہیں۔ اس آله نے اس دور میں متعدد صورتیں اختیار کیں اور آج تک میدان جنگ میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

اس آله نے آزادی و حریت کی خوشخبری سنائی، امراء کا زور گھٹ گیا، بادشاہوں نے اپنی توپوں سے امراء کے قلعے منہدم کر دیے یورپ میں تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر بڑی سلطنتوں میں شامل ہو گئیں، لوگوں نے امراء کے طوق غلامی سے رہائی پائی اور مساوات و آزادی کے پہلے زینہ پر قدم رکھا، اگرچہ اس قدیم طرز کی بادشاہت میں بھی لوگوں پر ظلم ہوتے تھے، لیکن وہ قدیم مظالم کے مقابل میں کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ بادشاہ کی اگرچہ ایک جابر و قابض شخصیت ہوتی تھی اور ہر شخص کی جان و مال کا مالک وہی سمجھا جاتا تھا، پھر بھی عام طبقہ کو پہلے کی بہ نسبت بہت کچھ آزادی حاصل ہو چکی تھی اور شاہی مظالم کا شکار صرف وہی لوگ ہوتے تھے جن کا بادشاہ کے شخصی اغراض سے تصادم ہو جاتا تھا۔

سولھویں صدی عیسوی میں مصر کی وہی حالت تھی جس میں پہلے یورپ گرفتار تھا، ممالک مصر، تمام ملک میں فتنہ و فساد برپا کرتے تھے، اور یہاں بھی اس زمانہ میں وہی اسلامی استعمال ملے جاتے تھے جن سے یورپ ازمنہ وسطے میں کام لیتا تھا۔ مصر، اسی حالت میں تھا کہ وہاں یکا یک یورپ کا سپہ سالار اعظم نپولین داخل ہوا۔ جس کے آگے آگے توپوں کے فیر ہوتے جاتے تھے اور اُن کی مرہب آوازوں سے تمام سرزمین مصر ایک عظیم ترنزل کی حالت میں تھی ان ہی توپوں کی بدولت ممالک کا زور توڑا گیا اور مصر میں ایک عام تسلط اور شاہی اقتدار کا دور شروع ہوا۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مصری حریت سیاسی کا دور نپولین اعظم سے شروع ہوتا ہے۔

آلات و تمدن کی سمت رفتار ایک مشہور امریکن اجتماعی کا قول ہے کہ ”تمدن گرم ملکوں سے سرد ملکوں کی طرف بڑھتا ہے۔“

سب سے پہلے آفتاب تمدن، مصر جنوبی میں طلوع ہوا، پھر وہاں سے مصر شمالی میں پہونچا، مصر شمالی سے اس کی شعاعیں فینیشیا میں پہونچیں۔ پھر وہاں سے یہ نور یونان پر چمکا۔ یونان سے اس نے اٹلی کا رخ کیا، اٹلی سے فرانس نے کسب ضیاء کر کے اس کی روشنی انگلستان میں پہونچائی اور یہاں اُنیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے جرمنی میں نہایت شان و شوکت سے نمودار ہوا۔ اگر اس رفتار کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمدن نے اپنے ہر مرحلہ میں صرف آلات کی بنا پر ترقی کی اور اس کی آخری منزل میں جرمنی نے جو عجیب و غریب آلات اختراع کئے ہیں وہ خود ہمارے دعوے کے زبردست دلائل ہیں۔

آفتاب تمدن نے بجائے شمال کے تمام قاعدہ ہے کہ جس قدر انسان تکلیف و مصیبت میں ہوتا ہے اسی قدر اُس کے حواس جنوب کا رخ کیوں نہیں اختیار کیا؟ معطل ہو جاتے ہیں۔ درست عقل اور سلامتی حواس کے لئے اعتدال مزاج، شرط اولین ہے، یہی وجہ ہے کہ تمدن جنوب کی طرف نہیں گیا کیونکہ مصر سے جس قدر جنوب کی طرف انسان جاتا ہے اسی قدر گرمی کی شدت بڑھتی جاتی ہے اور اعتدال مزاج فوت ہوتا جاتا ہے۔ باشندگان خط استوا کو آفتاب کی تیز اور محرق شعاعیں اُن کے جسم کو بجائے ڈالتی ہیں اُن کے مزاج میں وہ اعتدال اور لطافت کہاں سے آسکتی ہے جو ایک معتدل آب و ہوا میں پرورش پانے والے انسان میں

پانی جاتی ہے، اُن کی دماغی حالت اس قابل ہی نہیں ہے کہ وہ غور و فکر کر کے کچھ ترقی کر سکیں اور اپنے دماغی نتائج سے انسانیت کو تہذیب و تمدن کے بلند ترین زینہ تک پہنچا دیں۔

جس طرح خط استوا کا رہنے والا ترقی نہیں کر سکتا اسی طرح اقطاع شمالی کا باشندہ جو برف کے مکانات میں رہتا ہے ترقی سے محروم ہے دونوں کا اعتدال مزاج فوت ہو چکا ہے۔

قطب شمالی اور خط استوا کے درمیان جو ملک واقع ہے وہاں حرارت اور ہرودت اس قدر شدید نہیں ہے کہ انسان کو غور و فکر کی مہلت نہ دے، جس قدر انسان آرام و راحت سے رہتا ہے اسی قدر وہ اپنی ضرورتوں کو وسیع کر لیتا ہے اور جس قدر ضرورتیں زیادہ ہوتی ہیں آلات اور اختراعات میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہوتی ہے۔

سرد ممالک میں بہ نسبت گرم ملکوں کے ضروریات زندگی زیادہ ہیں، اس لئے وہاں بمقابلہ گرم ملکوں کے آلات و اختراعات کی بھی کثرت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس قدر آلات زیادہ ہوں گے اسی قدر تمدن میں ترقی ہوگی اور معاشرت بلند ہوتی جائے گی۔ آفتاب تمدن مصر جنوبی کی سر زمین سے طلوع ہو کر چھ ہزار برس کی مدت میں جرمنی تک پہنچا ہے اور اس کا ہر اگلا منظر پچھلے سے زیادہ شاندار اور ترقی پذیر صورت میں نمایاں ہوا، آج کل تمدن کی روشنی جرمنی سے سویڈن اور ناروے میں پہنچ رہی ہے اور ایک زمانہ آئے گا جب یہ دونوں ملک جرمنی سے بھی کئی درجہ زیادہ متقدم اور صاحب آلات و اختراعات نظر آئیں گے۔

تمدن کی گزشتہ چھ ہزار سالہ رفتار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کی ترقی صرف آلات کی ترقیوں میں مضمر ہے۔ جس قدر آلات کثرت سے ہوتے ہیں اسی قدر انسان کو علوم و فنون میں ترقی کرنے کا زیادہ وقت ملتا ہے یعنی تمدن و علم کا عروج آلات کی کثرت پر ہے اور اُن کا انحطاط فقدان آلات کے سبب سے ہوتا ہے۔

آلات اور ہندوستان ہندوستانیوں کی ضروریات بہ نسبت یورپین اقوام کے بہت کم ہیں لیکن باوجود اسکے ہندوستانی مزدور کو یورپین مزدور سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ جن آلات اور اوزار سے یورپین مزدور کام لیتا ہے وہ ہندوستان کو نصیب نہیں، اس لئے ہندوستانی کو غور و فکر اور علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے اتنی فرصت نہیں ملتی جو ایک یورپین کو حاصل ہو سکتی ہے۔

باوجودیکہ ہم تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا پورا احساس رکھتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کو وہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی جو مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے، کیونکہ فقدان آلات کی وجہ سے ہمارا کسان اور اس کی بیوی چھوٹے بڑے بچے سب کھیتی کے کام پر لگے رہتے ہیں اور پھر کبھی وہ کام ختم نہیں ہوتا اس لئے انھیں علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے کسی طرح فرصت نہیں مل سکتی، یہ آلات ہی کی برکت سے کہ جس کھیت کو ہندوستان میں سو مزدور ایک مہینہ کی مدت میں کاٹتے ہیں اُسے یورپ میں آلات کی مدد سے دو روز میں کاٹ لیتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس آلات نہیں ہیں تو ہم جبراً تعلیم جاری کرنے کی صورت میں بھی نہیں پڑھ سکتے اور اگر پڑھیں گے تو ہمارے کام خراب ہو جائیں گے۔ کیونکہ مفید آلات نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کسان اپنے پورے خاندان سے کام لینے پر مجبور ہے، اس کے پاس جو آلات اور

اور ان میں وہ بالکل اسی قسم کے ہیں جو مسیح علیہ السلام سے ہزاروں برس پہلے پائے جاتے تھے۔

جس ملک میں آلات زیادہ ہوتے ہیں وہاں تعلیم کو ترقی ہوتی ہے، اسی طرح صنعتی ملک میں بہ نسبت زراعتی ملک کے علوم و فنون کی اشاعت زیادہ ہوتی ہے۔ انگلستان اور جرمنی صنعتی ملک ہیں اس لئے وہاں فیصدی ایک بھی جاہل شخص نظر نہیں آتا، بخلاف اسکے اسپین زراعتی ملک ہے اس لئے وہاں فیصدی ستر جاہل پائے جاتے ہیں۔

آلات پر سلطنتوں کا قیام ہے تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی قوم نے ترقی کر کے اپنے ہمسایہ ممالک پر قبضہ کر لیا ہے اور ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی ہے، تو جب تک سلطنت کے پاس وسائل نقل و حرکت اور ذرائع خبر رسانی اعلیٰ پیمانہ پر پائے گئے ہیں اس کا وجود قائم رہا ہے ورنہ سب سے پہلے پایہ تخت سے دور کے ممالک نے

استقلال کا دعویٰ کیا اور رفتہ رفتہ اس کے اعضا کٹنے لگے یہاں تک کہ وہ صفو ہستی سے بالکل معدوم ہو گئی۔ ہم اس کی مثال میں صرف رومن سلطنت اور عربی حکومت کو پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ عربی حکومت سے سب سے پہلے اُنڈلس علیحدہ ہوا پھر مصر پھر ایران نے استقلال کا دعویٰ کیا اور آخر میں تمام ممالک ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اس کا کیا سبب تھا، صرف آلات و وسائل کا فقدان، اگر اس زمانہ میں بھی ریل، تار، ٹیلیفون، لاسلیکی طیارے وغیرہ ہوتے اور ہر وقت کی خبریں سخت گاہ خلافت تک پہنچتی رہتیں تو اس قدر جلد سلطنت کا انحلال نہ ہوتا، بخلاف اس کے کہ اگر آج حکومت کے خلاف ہندوستان میں کوئی جلسہ ہوتا ہے تو لاسلیکی کے ذریعہ سے ایک لمحہ میں اس کی خبر لندن پہنچ سکتی ہے جو ہندوستان سے تقریباً آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے یہ مسافت زیادہ سے زیادہ چاروں میں طے ہو سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں وسائل نقل و حرکت اور ذرائع خبر رسانی بہترین صورت میں پائے جاتے ہیں اور آئندہ اس سے زیادہ ترقی کی امید ہے، اس لئے موجودہ عہد میں جو متحدہ حکومت قائم ہوتی ہے، اس کا شیرازہ منتشر نہیں ہو سکتا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تعداد ۴۰ سے زیادہ ہے، مگر چونکہ یہ متحدہ سلطنت ترقی کے موجودہ زمانہ میں قائم ہوئی ہے اس لئے ریل، تار، ٹیلیفون، لاسلیکی وغیرہ نے اُسے جسم واحد کر دیا ہے۔

جب تک کسی قوم نے دوسرے مقابلہ میں وہی آلات اور اختراعات فراہم نہیں کئے جو اس کے مقابل کے پاس ہیں تو اس کا آزاد ہونا تقریباً محال سمجھنا چاہئے خواہ اس میں آزادی و حریت کے جذبات کتنے ہی شدید کیوں نہ پائے جائیں۔

آئندہ زمانہ میں کیا ہوگا زمانہ ترقی کر رہا ہے ہر ایک قوم بیدار ہو رہی ہے حریت و آزادی کے جذبات تمام محکوم قوموں میں پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے جب وہ زمانہ آئے گا کہ تمام دنیا کے ممالک میں علوم و فنون پوری طرح ترقی کر چکیں گے اور

تمام دنیا آلات کی برکت سے جسم واحد بن جائے گی، تو اس وقت تمام عالم میں ایک مشترکہ جمہوریت قائم ہوگی، ہر ملک بلکہ ہر صوبہ اپنے داخلی انتظامات میں خود مختار ہوگا اور مجلس عالیہ جس میں ہر قوم کے نمائندے ہوں گے تمام عالم پر حکومت کرے گی اور امریکہ کی طرح تمام دنیا ریاستہائے متحدہ کا مجموعہ بن جائے گی۔

آلات اور اشتراکیت | مزدوری پیشہ اور سرمایہ داروں کے درمیان اس وقت ایک زبردست اقتصادی تصادم قائم ہے۔ زعمائے عمال نے روس میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے، فتنہ عمال آہستہ آہستہ اور ممالک میں بھی نفوذ کرنا چاہتا ہے، مگر جو لوگ اس کے عظیم خطرات کو محسوس کرتے ہیں وہ اس کے دفع کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہے ہیں کیونکہ اشتراکیت کا سب سے زیادہ مضرت رسا اثر اُن سرمایہ داروں پر پڑتا ہے جو ہر روز لاکھوں مزدوروں سے اپنے کارخانوں میں کام لیتے ہیں اور خود کو کوئی کام نہیں کرتے اور بلا کسی کاوش و محنت کے کروڑوں روپیہ کا نفع حاصل کرتے ہیں۔

اشتراکی خیالات کے محرک یہی آلات ہی ہیں انھیں کو دیکھ کر زعمائے اشتراکیت کے خیالات بدلے ہیں، پہلے زمانہ میں کپڑا بننے والے اپنے ہاتھ سے سارا کام کرتے تھے اور خود ہی اس کپڑے کو لیجا کر بازار میں بیچتے تھے، یہی حال ہر ایک صانع اور کاریگر کا تھا۔ چونکہ یہ لوگ خود ہی صانع اور خود ہی تاجر تھے اس لئے وہ مزدور بھی تھے اور سرمایہ دار بھی اور اگر اس زمانہ میں کوئی شخص کسی مزدور سے کام لیتا تھا تو مزدور کی غایت یہی ہوتی تھی کہ وہ بھی کسی دن آزاد کاریگر بن جائے اور اکثر ان کی یہ امیدیں پوری بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

لیکن اُنیسویں صدی کے آلات عظیمہ اور اختراعات ہائلہ نے نظام اجتماعی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا بیس بیس اور چالیس چالیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے کوہ پیکر انجن طیار ہوئے ہیں، پس ظاہر ہے کہ ان عظیم الشان مشینوں کو ہر ایک کاریگر نہیں خرید سکتا، اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ وہ لاکھوں روپیہ کی مشین خریدے، اس لئے مالدار اور متول طبقہ نے یہ آلات خریدے اور لاکھوں مزدوروں سے کام لینا شروع کر دیا۔ پہلے کاریگر اور صاحب مال ایک شخص تھا۔ لیکن اب دو فرتی ہو گئے ایک سرمایہ دار اور دوسرا مزدور۔

چونکہ مزدوروں کی محنت سے سرمایہ دار کروڑوں روپیہ کماتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے اور یہ صورت محض آلات عظیمہ کی بدولت پیدا ہوئی ہے اس لئے اشتراکی خیالات کے محرک یہی آلات اور اُن کے نتائج ہیں۔

خلاصہ | ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا میں آج تک جس قدر سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور تمدنی تغیرات اور انقلابات ہوئے ہیں سب کا سبب اولین آلات و اختراعات ہیں اور آئندہ بھی یہی چیزیں عظیم الشان انقلابات کا باعث ہوں گی اور یہ انقلابات اس قدر عظیم الشان ہوں گے کہ ان کی عظمت و اہمیت کا تصور ہر دماغ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشاکش جو آلات عظیمہ کی بدولت وجود میں آئی ہے ضرور ایک روز اجتماعی نظام کو بدل دے گی اور اصحاب الملوک کے قہرمانی تسلط سے مزدور آزاد ہو جائیں گے۔ اور انسان اپنے ہم جنس کی ذلیل خدمات انجام دینے سے بے نیاز ہو جائے گا۔ لیکن سرمایہ داری کے تسلط میں ایسی تعدیل ہرگز نہ ہوگی جیسی آج کل روس میں جاری ہے۔ بلکہ ایک ایسی درمیانی راہ پیدا ہو جائے گی جو سرمایہ دار اور مزدور دونوں کے لئے بہتر ہوگی۔

یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر

پروفیسر ہاسکنس نے "انگلش میٹاریکل ریویو" میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ بارہویں صدی میں جب مغربی یورپ کے اندر علوم عربیہ کی اشاعت ہونے لگی تو انگلستان نے بھی اس میں نہایت اہم حصہ لیا چنانچہ اُس زمانہ میں ہاتھ کار شے والا ایک شخص ایڈیلارڈ تھا جس نے علوم عربیہ کو بہت زیادہ اہمیت سے حاصل کیا اس کے معاصرین اور علماء و مابعد کی تحریر کردہ بہت سی کتابیں معہ تاریخ تصنیف ایسی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات نہایت وضاحت اور صحت کے ساتھ تحقیق کی جاسکتی ہے کہ ان علوم جدیدہ (عربیہ) کی اشاعت ملک انگلستان میں کس طرح حاصل ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستان کی علمی بیداری میں ان علوم عربیہ نے نہایت زبردست حصہ لیا تھا اور عربوں کے ذریعہ سے علوم ریاضی خاص طور پر اس قدر معراج ترقی پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل مغربی یورپ کو کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

عربوں میں لفظ "سائنس" کے اندر وہ جملہ علوم شامل تھے جو قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر ریاضیات میں داخل تھے یعنی علم الحساب، علم المساحت، موسیقی اور فلکیات اور ان تمام علوم پر متشقیقین نے کافی توجہ کی، مگر بد قسمتی سے علم موسیقی پر کسی نے توجہ نہ کی۔ یعنی اب تک یہ بات ظاہر کرنے کی کسی شخص نے بھی کوشش نہ کی کہ عربوں نے فن موسیقی نے مغربی یورپ پر کس قدر اثر ڈالا۔

یورپ پر عربوں کے اثر کا یہ پہلو دو صورتوں میں تحقیق کیا جاتا ہے :-

- (۱) عام موسیقی جو آٹھویں صدی میں یورپ کے اندر بے سلسلہ تعلقات اشاعت پذیر ہوئی۔
 - (۲) فن موسیقی، جو دسویں اور گیارہویں صدیوں میں ادبی اور علمی تعلقات کے ساتھ ساتھ یورپ میں آیا۔
- عربوں کی عام موسیقی، مغربی یورپ میں سفری قوالوں یا مغنیوں کے ذریعہ سے پھیلی جو اپنے ساتھ اہل عرب کے ایجاد کردہ آلات موسیقی لئے پھرتے تھے اور عربی ترکیبوں سے گاتے تھے قرون وسطیٰ میں یورپ کے مغنی اور گشتی قوال جو گیت گاتے تھے یا جن طریقوں سے قس کرتے تھے، ان میں سے اکثر راگنیاں اور اکثر قص عربوں کے رہین منت تھے۔ لیکن یہ گشت کرنے والے یا سفری مغنی، عربی علم موسیقی سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے، کیونکہ یہ لوگ عموماً عطا فی ہوتے تھے، جو عربی گویوں سے سن سنا کر چیزیں اڑالیا کرتے تھے۔ لیکن جو عربی ساز ہائے موسیقی یہ لوگ اپنے ساتھ لئے پھرا کرتے تھے وہ یورپ کے نزدیک بالکل نئے اور انوکھے تھے اور ان میں سے بعض ساز اس ترکیب سے وضع کئے گئے تھے کہ ان میں سروں کا ٹھکانہ زیادہ تر علمی طریقہ پر قائم تھا جس سے یورپ بالکل ناواقف تھا

بعض ساز اور اصطلاحات موسیقی | اب ہم ذیل میں بعض عربی اور یورپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یورپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورتیں

یورپین	عربی نام
A lute = (Al-ud)	العود
Guiter = (qitar)	قطار
Rebec = (Rabab)	رباب
Naker = (Najara)	نقارہ
Sonajas = (Sunnaj)	صنوج (مجرہ یا جھانجھ)
A dufe = (Al duff)	الدن (مربع)
Pandare = (Bandair)	بندیر (مدور)
gasee (ایک قسم کا عربی ڈھول) = سولہویں صدی میں فرانسیسی	قبضہ
Caïsee ہوا اور اب فی زمانہ کہلاتا ہے۔	
Taher-Tabor-Tahel (Tahel)	طبل
Anafil (Nafir)	انفیر (نفیری)
Fanafore (Anfar) بہت سی نفیروں کا یکدم بچنا	انفار
Dulcayn (Al-surnay)	السرنائی
Canon (qanon)	قانون
Esch a quiel (Al-shaqira)	الشقرہ
Shawm (Zamr)	زمر

معلوم ہوتا ہے کہ جلتزنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یورپ میں (جلتزنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارہویں صدی تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے واقعی آبی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنون بنائے تھے اور آبی ارگن سے مراد ”جلتزنگ“ ہے۔

عربوں کے ساتھ یورپ کا تعلق پیدا ہونے کے بعد جو سب سے پہلا اثر پڑا وہ ”زائدۃ“ تھا یعنی کوئی چیز گاتے گاتے تان یا مینڈ لگانا جسے انگریزی اصطلاح میں **ornament** (چمک) یا **ornament** (رنگینی کا زیور یا سنگھار) کہتے ہیں۔

عربی اثر پڑنے سے قبل یورپین موسیقی بالکل سادہ ہوا کرتی تھی جسے ”نغمہ گم یگوری“ کہتے تھے اس میں سروں کا کوئی آئینہ چڑھاؤ

نہیں ہوتا تھا۔ مگر عربی اثر بڑھتے ہی تمام یورپین موسیقی کارنگ بدل گیا۔ اگر دو یا دو سے زیادہ معنی گانے بیٹھتے تھے تو ان میں ایک آدمی سیدھی استائی گاتا تھا اور دوسرا درمیان میں گئے بازئی کرتا جاتا تھا۔ اس تان اور مینڈ وغیرہ کی اصطلاح کو یورپ میں ”*oppoggiatura*“ کہتے تھے۔

سر ملانا جس چیز کو انگریزی زبان میں ”*Harmony*“ (ہم آہنگی) کہتے ہیں وہ یورپ میں دسویں صدی سے پیشتر بالکل مفقود تھی، لیکن پروفیسر دولریج لکھتے ہیں کہ دسویں صدی میں فن موسیقی کے اس اسلوب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ *Organising* (ٹھاٹھ ملانا) کہتے ہیں۔ یہ فن سروں کے ملائے پر مشتمل تھا اور اُس زمانہ میں اُس کو ”*Organum*“ یا ”*Wiphony*“ کہتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا بعض مؤرخین مثلاً ایمیل نو مان (Emil Noemann) کا یہ قول ہے کہ دین عیسوی کی ترقی کے ساتھ یہ بات بھی پیدا ہو گئی تھی، مگر اس قول کی تردید پادری سر ایف اے گور آدسے جیسے عالم و فاضل نے بخوبی کر دی ہے۔ حقیقت کا اظہار دراصل پروفیسر دولریج نے کیا ہے جو تحریر فرماتے ہیں کہ ”ارغنوم“ (*organum*) کا اصول ساسی قدیم یونانیوں کے اس طریقہ میں پایا جاتا ہے جسے ”*magadizing*“ کہتے تھے۔ اس میں ”اکیٹو“ (*active*) کو اکیٹو سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور ”*organizing*“ میں چوتھے یا پانچویں سر (مدرم یا پنجم) سے ڈبل کیا جاتا تھا اور بقول ڈاکٹر ری مان (Riemann) اس کے بعد ”*magadizing*“ سے ”*organizing*“ کی طرف قدم اٹھانا ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن یہ پہلا قدم کس نے اٹھایا؟

سب سے پہلا عرب مصنف جس کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں وہ الکندی (المتوفی ۳۰۰ھ) ہے مگر جو اوراق پریشاں اس شخص کے ہم کو دستیاب ہوئے ہیں ان میں ”ارغنوم“ کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے اور الفارابی (المتوفی ۳۰۵ھ) کی تصانیف میں اس کا کہیں اشارہ پایا جاتا ہے۔ لیکن بوعلی سینا (المتوفی ۴۰۳ھ) کی کتاب ”شفاء“ میں دونوں باتوں یعنی ”*magadizing*“ اور ”*organizing*“ پر ”تضعیف“ اور ”ترکیب“ کے ناموں سے بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ باتیں بوعلی سینا میں پائی جاتی ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ الفارابی نے بھی ضرور ان کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فن ”ترکیب“ (*organizing*) دراصل عربی فن نہیں ہے بلکہ یونانی ہے اور غالباً ارسطو سے لیا گیا تھا۔

ایک ہسپانوی مورخ ورجیلیس قرطباتی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے مدارس موسیقی میں فن ”ترکیب“ کی

لے و یقرب من باب التریکیات وهو ان یحدث بنقرة واحدة تستمر علی وترین النغمۃ المطلوبة والتی معہا نغمۃ الذی بالاربعة اوالذی بالخمسہ وغیر ذلک کا نہا یقعان فی زمان واحد والتضعیفات وقد علمتہا من جملة التریکیات الا انہا فی الذی بالکل۔

دی جاتی تھی۔ اہل یورپ عرصہ دراز تک یونانیوں کی تقلید میں یہ بات ماننے سے کہ صرف آٹھویں، پانچویں اور چوتھے صدیوں میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ تیسرا سر کسی سے نہیں ملتا۔ مگر الفارابی (دسویں صدی) اور ابن سینا گیارھویں صدی) نے سر نمبر ۴ و نمبر ۵ کو ”الکر“ ”ثالث کبیر“ (چڑھی گندھار) اور سر نمبر ۵ و نمبر ۶ کو ”ثالث صغیر“ (اُترے گندھار) تسلیم کر لیا تھا۔ اور ٹھیک اس وقت جبکہ یورپ بتقلید فیتا غورث تیسرے سر کو غیر آہنگ خیال کر رہا تھا، عربوں کا ساز ”طنبورہ خراسانی“ نہایت اچھی طرح سے ”ثالث کبیر“ کے سر پیدا کرتا تھا۔

الفرض رفتہ رفتہ یورپ نے نظریہ فیتا غورث ترک کر کے عربوں کے ایسا کردہ جدید طریقے اختیار کر لئے جن میں سے ایک تیسرے چوتھے، پانچویں اور آٹھویں میں دو گون پیدا کرتا تھا اور جس کا ذکر ابن سینا نے کیا تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے اندر ساز بائے موسیقی کا ”ٹھاٹھ“ سرگم ٹھاٹھ قائم کرنا بھی عربوں ہی سے آیا تھا، چنانچہ لونی شانزدہم شاہ فرانس کے ترجمان السنہ مشرقیہ موسیو پیچن دی سینٹ پیٹرن نے اس قول کی تائید میں ایک عربی مخطوطہ پیش کیا تھا۔ اور یہ بات تو زمانہ دراز سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ یورپ میں سرگم کی تعلیم عربوں ہی نے جاری کی تھی۔ یورپ کی اصطلاح میں سرگم کو ”Sol feggio“ اور گت یا ٹھاٹھ کو ”Tahalalatu“ کہتے ہیں۔

اگر ہم عربی اور یورپین سرگموں کے ناموں کا مقابلہ کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کے نام اور حروف ایک ہی ہیں مثلاً:-

عربی سرگم:-	میم	ع	صاد	لام	سین	دال	را
یورپین سرگم:-	می	تا	سول	لا	سی	دو یا ات	ری

سب سے زیادہ دلچسپ عربی اثر وہ ہے جو یورپ کے ساز بائے موسیقی کے ”ٹھاٹھ“ یا ”گتوں“ پر پڑا۔ اور عربوں کے اس احسان کو یورپ کے محققین عام طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک طریقہ تھا جس میں حروف باعلامتوں کے ذریعہ سے ”گتیں“ قائم کی جاتی تھیں یا پروڈول اور سینکول کے آثار چھڑھاؤ سے ”ٹھاٹھ“ بنایا جاتا تھا۔ یورپ والوں کو اس سے قبل یہ فن قطعی معلوم نہ تھا۔ عربوں کے اس احسان کا کھلم کھلا اعتراف پندرھویں صدی کے ایک راہب مصنف جانے ویلا نووائے ایک مخطوطہ میں کیا ہے۔ مخطوطہ مذکور کی ابتداء میں الفاظ ہوتی ہے:-

”یہ امر حیرت انگیز ہے کہ روح القدس کے فیوض و برکات کفار پر اس قدر نازل ہوں۔ میں یہ بات اسوجہ سے کہتا ہوں کہ

۱۔ انگریزی میں اسے Major Third کہتے ہیں۔

۲۔ انگریزی میں اسے Minor Third کہتے ہیں۔

سلطنت غزنائے کے ایک عرب (مؤرخ) نے جس کی ماہرین فن ہسپانیہ بجد تعریف کرتے ہیں، سازوں کے بجانے کا نہایت عمدہ فن ایجاد کیا تھا۔ اس کے بعد زائد مذکور نے سروں کے متعین کرنے کا وہ طریقہ بیان کیا ہے جو یورپ میں اٹھارھویں صدی میں رائج ہوا اور اس طریقہ کا نام اس نے ”ٹیلیچر“ (Talechir) لکھا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے یورپ کے فن موسیقی پر عربوں کے اس اثر کا حال بیان کیا ہے۔

معاشرتی علمی و ادبی تعلقات

جو سیاسی تعلقات کے ذریعے سے پڑا۔ اب ہم اس معاشرتی اثر کا کچھ حال بیان کرتے ہیں جو اس زمانہ سے بھی قبل یورپ پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر باسکن نے بیان کیا ہے کہ بارھویں صدی کے اوائل ہی میں رفتہ رفتہ بہت سی عربی اصطلاحیں اور الفاظ یورپ میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے مگر جب یورپ سے عربوں کا علمی و ادبی تعلق بھی قائم ہو گیا تو یہ اثر بہت زیادہ ہو گیا۔ انگلستان پر اس تعلقات کا اثر بقول پروفیسر باسکن، ”والچر اسب مالورن (المونی ۱۱۳۵ء) کے ذریعے سے پیدا ہوا، جس نے علوم عربیہ ایک یہودی المذہب عرب مسیحی پطرس انفوزی سے حاصل کئے تھے۔ یہ یہودی عرب اس زمانہ میں انگلستان آیا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا (۱۱۰۴ء تا ۱۱۱۲ء عیسوی) جبکہ یورپ میں عربوں کا جدید علم الہیئت پہنچا۔ اسی زمانہ میں عربوں کا فن موسیقی مغربی یورپ میں داخل ہوا، جس کی اشاعت میں انگلستان نے بھی کچھ حصہ نہیں لیا۔ اور گیارھویں صدی کے درمیان عربوں نے قدیم یونان کی ایسی بہت کتب موسیقی کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا جن کا نام تک مغربی یورپ کو معلوم نہ تھا۔ ان میں سے مشہور ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:-

موضوع کتاب	نام کتاب یونانی	نام مصنف یونانی
سراور تال	Harmonics and Rhythmics	ارسطو گزینوس
گیتیں	Problems.	ارسطو
لحنیات و قانون	Harmonics and Canon	اقلمیدس
لحنیات	Harmonics	بطلمیوس
لحنیات	Harmonics	نیکوماکوس

مندرجہ بالا کتب کے تراجم کے علاوہ اکثر عرب مصنفین کے قلم سے طبع شدہ کتابیں نکلیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مصنفین یہ تھے:- (۱) الکندی - (۲) السرخسی - (۳) بنو موسی - (۴) ثابت ابن قری - (۵) ذکر یا الرازی - (۶) قسط ابن لوقا - (۷) الفارابی - (۸) بوعلی ابن سینا - (۹) ابن باجہ۔

سٹر ہنری جارج فارمز ایم۔ اے کا قول ہے کہ جب ہم اس عہد کی یورپین کتب موسیقی کا مقابلہ عرب معاصرین سے کرتے ہیں تو ہم ہنرمند کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی موسیقیات ایک صحرا کے بے آب و گیاہ تھا جن میں الفارابی کی ”کتاب الموسیقی“ اور ابن سینا کی کتاب ”الشی“ سرسبز و شاداب نخلستان دکھائی دیتی ہیں۔

الفرض یورپ نے بہت قدامت عربوں کی علمی و ادبی توثیق کے سائنسے تسلیم کرنا شروع کر دیا اور طلباء فرنگ اُنڈس کی یونیورسٹیوں اور ہسپانیہ کے مدرسوں میں عرب اساتذہ کے سائنسے زانوے ادب نہ کرنے لگے جہاں نہ صرف یونانی موسیقیات کے عربی تراجم پڑھائے جاتے تھے۔ بلکہ خالص عربی کتب موسیقی میں بھی درس دیا جاتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں اور مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر جو مشہور طلباء مغربی یورپ کو گئے وہ جربرٹ، ہرمان کانکرٹیکٹ، قسطنطین افریقی، جان سیوانلی، گندلیا لوی، جیرارڈ قمریونوی اور فلاطون طفالوی تھے۔ اسی قسم کے انگریز طلباء میں الفریڈ، ایڈیٹارڈ ساکن ہاتھ نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس نے فن موسیقی کی تعلیم فرانس میں پائی تھی اور بلکہ فرانس کے حضور میں قطار (ستار) بھی بجایا تھا (۱۰۹۰ء سے قبل) علاوہ انہیں اس شخص کی تصنیف کردہ ایک دوسری کتاب بھی شہر میلان کی ایمبروزی لائبریری میں موجود ہے جس کا ایک حصہ علم موسیقی کے لئے مخصوص ہے۔ اسی کتاب میں مصنف مذکور نے ایک عرب ماہر فن کا حوالہ دیا ہے جس کا نام اس نے الخوارزمی (Alchwarizmi) تحریر کیا ہے۔ یہ شخص مشہور و معروف ”حکیم ابو عبد اللہ خوارزمی“ تو ہونہیں سکتا کیونکہ حکیم مذکور کی کتاب موسیقی کا ذکر عرب مصنفین نے نہیں کیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ یہ محمد ابن احمد خوارزمی ہو گا جس کی کتاب ”مفاتیح العلوم“ میں ایک فصل موسیقی کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بہر حال بارہویں صدی عیسوی میں جدید علم موسیقی یورپ کے اندر داخل ہوا۔ اور یہ شعبہ موسیقی ”ایقامات“ (mensural) یعنی تال اور رسم سے تعلق رکھتا تھا۔

قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ جب ۱۱۳۰ء میں ہسپانیہ کے ”موحدین“ نے ازراہ تعصب غیر مسلموں پر زیادتیاں کرنا شروع کیں تو وہاں سے بہت سے یہودی دیگر ممالک میں منتشر ہو گئے۔ انہی میں مشہور و معروف یہودی ”ابراہام ابن عذیر“ اور دیگر یہودی بھی تھے جو اپنے ہم مذہبوں سے ملنے انگلستان آئے تھے۔ ابراہام لندن میں ۱۱۵۹-۱۱۶۸ء میں تھا اور یہیں اس نے اپنی کتاب موسیقی کا کچھ حصہ قلمبند کیا اور اسی زمانہ میں اس کی کتاب ایک انگریز یہودی نے نقل کی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں جب کتاب ”سعدیہ“ لکھی گئی تو یہودیوں نے عربوں سے علم موسیقی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسٹین شینڈر نے اپنی کتاب ”یہودی لٹریچر“ صفحہ ۱۵۴ میں لکھا ہے کہ ”یہودیوں کا علم و فن موسیقی، دیگر علوم کی طرح عربوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں یہودی لوگ عربی کتب موسیقی کا ترجمہ اپنی عبرانی زبان میں کر رہے تھے۔ یہودی انسائیکلو پیڈیا، جلد اول صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ ”ابن عقیل نے جن کتابوں کے پڑھنے کی سفارش کی ہے۔ ان کی فہرست میں الفارابی کی ”کتاب الموسیقی“ کا بھی نام ہے۔ علاوہ انہیں الفارابی کی دوسری کتاب ”احصاء العلوم“ کا ترجمہ بھی عبرانی زبان میں موجود ہے۔ پاپائے اعظم کے کتب خانے میں ایک عربی کتاب موسیقی کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ جو ابراہام ابن حجر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس شخص نے جو ۱۱۳۶ء میں فوت ہوا، عربی کتابوں کا لاطینی ترجمہ کرنے میں بے حد مدد دی تھی۔ یہ ابراہام ابن عذیر کا بڑا دوست تھا اور اس کے ساتھ مل کر کام کیا کرتا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور امر قابل توجہ ہے اور وہ کہ عربوں کے بہت پڑنے پور و پین شاگردوں میں ایک شخص مسیحی بران کانکرٹیکٹ (۱۱۵۰ء تا ۱۲۰۰ء) بھی تھا جس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس رسالہ میں اس شخص نے سروں کی تعیین میں ایک

عجیب و غریب طریقہ علامات یا حروف کا استعمال کیا ہے اس سے قبل یورپ میں ایسا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ مثلاً ہر ان کا ٹکڑا ٹکٹ نے صرف یہ طریقہ سے مختلف سروں کو ظاہر کیا ہے :-

علامت

نام سر

e

A Equat (unison = برابر کانس)

t

Tonus (Tone = ٹن)

s

Semitonium (Half-tone = اُوہر)

٣ا

Lonus Cum Semitonis (minor Third = اتری گندھار)

ہر ان کا ٹکڑا ٹکٹ نے یہ طریقہ عربوں سے لیا ہے۔ اور جو الکندی (المتوفی ۸۴۷ء) کے زمانہ میں وہاں موجود تھا۔

تال

تال، سم کافن عربوں کو بہت قدیم زمانہ سے معلوم تھا چنانچہ الخلیل (المتوفی ۹۸۰ء) کی تصنیف الموسوم "کتاب الایقاع" (Rhythms) میں یہ فن موجود ہے۔ یہ فن

measured Music

الکندی (المتوفی ۸۴۷ء) کو بھی معلوم تھا جیسا کہ مخطوطات الکندی سے ثابت ہوا ہے جو برٹش میوزیم اور برلن میوزیم میں محفوظ ہیں۔ الفارابی بھی اس فن سے بخوبی واقف تھا اور اس پر اس نے اپنی تصنیف "کتاب الموسیقی" میں پوری بحث کی ہے۔ جولیڈن، میڈرڈ، اور میلان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ الفارابی نے ۹۷۰ء میں وفات پائی تھی۔ اخوان الصفا کے رسائل میں بھی اس فن پر خوب بحث کی گئی ہے جو ۱۸۸۶ء میں بمقام بمبئی اور ۱۳۰۰ھ میں بمقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔ بوعلی سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) نے بھی اپنی کتاب الشفا "اور" نجات "میں اس فن پر بحث کی ہے۔ پہلی کتاب اندلیا آفس اور بوڈلین لائبریری اور دوسری کتاب عرف بوڈلین لائبریری میں پائی جاتی ہے۔ اندلس کی یونیورسٹیوں نے فارابی اور ابن سینا دونوں کی کتابیں گیارہویں صدی میں اپنے یہاں جاری رکھی تھیں۔ (المقری جلد سوم)

اپنے زمانہ میں جامعہ قرطبہ کا مدرسہ موسیقی تمام دنیا میں مشہور تھا۔ و دراز سے طلبہ آکر اندلس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے۔ اور وہاں وہ الخوارزمی، ابن الہشیم، البطانی، الفارابی اور بوعلی سینا وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا کرتے تھے یہ مسلم مصنفین اور ماہرین فن مغربی یورپ میں جن ناموں سے مشہور تھے وہ سب ذیل میں :-

یورپین نام

Alhwarizmi

Alhazem

Almagrini

Alpharabius

عربی نام

الخوارزمی

الہشیم

البطانی

الفارابی

Avicenna

ابن سینا

Avenpaca

ابن باجہ

الفارابی کی کتاب ”احصاء العلوم کا پہلا لاطینی ترجمہ ۱۳۵۰ء اور ۱۵۰۰ء کے درمیان ہوا اور اس کی دوسری کتاب ”کتاب الموسیقی“ کا اصل نسخہ (جو ابن باجہ سے نقل کیا گیا ہے) کتب خانہ میڈرڈ میں محفوظ ہے۔ مگر لاطینی زبان میں اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ابن سینا کی کتاب موسیقی کا بھی اس وقت کوئی لاطینی ترجمہ موجود نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ لاطینی میں ضرور ہوا تھا۔ کیونکہ یورپین مصنفین اس کی عبارتیں اکثر نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ابن سینا کی کتاب ”نجات“ کا لاطینی ترجمہ موجود ہے مگر اس ترجمہ میں یہ عجیب بات ہے کہ اس کی جو فصل موسیقی کے متعلق تھی وہی نثار دہے۔

قدیم یورپین ماہرین موسیقی کی کتابوں میں ”تال سم“ کا کہیں پتہ نہیں کیونکہ یہ فن وہ جانتے ہی نہ تھے سب سے پہلا یورپین ماہر موسیقی فرانکو ساکن کرون (۱۱۹۰ء) جس کی کتاب ہم تک پہنچی ہے، ایسا شخص ہے جس نے ”تال سم“ کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ مگر کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن مغربی یورپ کی ایجاد نہ تھا بلکہ کسی اور جگہ سے لیا گیا تھا جہاں وہ پوری طرح ترقی پا چکا تھا اور یہ فن ”ایقامات“ کے نام سے عربوں میں بہت پیشتر سے موجود تھا۔ الغرض یورپ میں تال سم کا فن عربوں کے ذریعہ سے پہنچا۔ یورپین اصطلاح میں ”تال“ کو ”ochelus“ ”Hokelus“ یا ”Hoguelus“ اور ماہرین علم الاسماء خوب جانتے ہیں کہ یہ لفظ لفظ ”ایقامات“ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ڈش میوزیم میں ایک نہایت اہم مخطوطہ موجود ہے جس کا نام ”لامعلوم“ (Anonymus ۱۷) ہے اور اس کی تاریخ ۱۲۰۳ء تا ۱۲۵۰ء بتائی جاتی ہے۔ بحفاظ مضمون اس مخطوطہ کا نام (de mensuris et dis cantis) ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یورپ کا علم موسیقی عربی علم موسیقی کا زیر بار احسان ہے مخطوطہ مذکور میں جو زبان لاطینی ہے، سرور کے متعلق دو اصطلاحات ”Elmuachym“ اور ”Elmuachym“ استعمال کی گئی ہیں۔ جو کھلی ہوئی عربی اصطلاحیں ہیں گیارہویں صدی کی ایک لاطینی دعویٰ لغت میں جس کا نام ”Glossarium Latinis Arabicum“ ہے۔ دو اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق علم موسیقی سے ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں ”Elmuachym“ اور ”Elmuarifa“ ہیں جو عربی اصطلاحات معلومہ و سرور کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فرانس: نٹ دی بوسے (۱۱۹۰ء تا ۱۲۱۰ء) کی کتاب ”speculum de musica male“ - ”جلد اول فصل ۱۱ میں جگہ جگہ الفارابی سے استناد کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے نظریہ موسیقی پر عربوں کا کس قدر زبردست اثر پڑا تھا۔ راجر بیکن ایک مشہور انگریز ماہر موسیقی (۱۲۱۳ء تا ۱۲۹۰ء) گزرا ہے۔ یہ بھی اپنے فن میں عربوں کا زیر بار احسان تھا۔ اپنی کتاب موسیقی ”opus Terminus“ میں اس نے

بطایموس اور اقلیدس کے ساتھ الفارابی کی عبادتیں نقل کی ہیں اور اس کی کتاب "احصاء العلوم" سے بار بار حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی کتاب میں ابن سینا کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ راگ راگینوں کے ذریعہ سے امراض کا علاج کیا جاسکتا ہے اور ڈاکٹر آڈنگٹن (۱۲۸۶ء) تو عرب اساتذہ فن کا اس قدر متقد تھا کہ اس نے ابن سینا کو فن موسیقی میں سینٹ گریگوری، سینٹ ہارڈوینی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے برابر بٹھا دیا ہے۔ اسی طرح ہیرم نے جو الفارابی کا نہایت اراقد مند ہے اپنی کتاب "De musica" میں الفارابی کے بہت سے اقوال درج کئے ہیں۔

ساکسن ٹنٹشٹڈ (۱۳۶۹ء لغایت ۱۳۶۹ء) جونس ڈی میوریز (۱۳۲۵ء) اور بان ہوانز (۱۳۲۵ء) تک "فن ایقانہ" انگلستان کے ماہرین فن موسیقی کو بخوبی حلوم ہو چکا تھا ڈی ہینڈل نے لکھا ہے کہ دو اصوات و اوقات کے اجتماع سے "ایقاعات" (Hockets) پیدا ہوتے ہیں۔ اور آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب راگنی یا ملودی (melody) میں تان توڑ یکجائی ہے تو اسے ہم "Hocket" کہتے ہیں اور جونس دی میوریز نے عنوان "Hocket" کے ذیل میں عرب ماہرین موسیقی کے ایک دوسرے فن کا حال لکھا ہے جو اس کے زمانہ تک موجود تھا اور جسے "Mensural" کہتے تھے۔ یہ اصطلاح بھی عربی اصطلاح "طرز" سے نکلی ہے جس کے معنی ہیں "آواز کو گھینچنا"۔

پندرہویں صدی کے بعد مغربی یورپ کی موسیقی سے عربی اثر زائل ہو گیا۔ کیونکہ مسلمانانِ اندلس کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان کا علمی و ادبی انحطاط بھی شروع ہو گیا تھا۔ مگر بائیسویں صدی تک یورپ میں عربوں کی زبردست شہرت قائم رہی حتیٰ کہ جارج والانس نے ۱۸۵۷ء میں اور جارج ریش نے ۱۸۵۷ء میں بھی جب علم موسیقی پر اپنی مشہور کتابیں لکھیں تو انھوں نے جگہ جگہ الفارابی کے حوالے دیے۔ الفارابی اور ابن سینا کے بعد تیرہویں صدی میں صفی الدین عبد ربیع نے بھی فن موسیقی میں بیدار شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں ایک جدید صلقہ درس (school) قائم ہو گیا تھا۔ جنہیں "اصولی" (Sustentation) کہتے تھے۔ اس حلقہ درس کا امام بھی شخص صفی الدین عبد ربیع تھا۔ یہ وہی ہے جس نے ان اصولین کی سرگرمی (scale) کے متعلق اپنی کتاب "فنی موسیقی" (Art of music) میں لکھا ہے کہ "یہ سرگرمی" سے زیادہ کل تھی۔ "تہہ لٹرز" کا بھی یہی خیال ہے کہ اصولین کا یورپ پر بہت اثر پڑا۔ اور یہ لوگ جو اپنے سرگرمی میں "پڑھنے لکھنے" کا استعمال کیا کرتے تھے، یہ گویا شاہراہ ترقی میں ایک خاص نشان تھا جہاں سے علم موسیقی نے آگے ترقی کی۔

نیاز فحشوری کے قلم سے

تین جدید مضامین

اصحاب کہف (ڈرامہ)

جھانسی کی رانی (ڈرامہ)

مختارات نیاز افسانوں کا چوتھا مجموعہ

عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام

فرانسیسی زبان (*Elie Faure*) کی ایک کتاب آرٹ کی تاریخ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں (*Walter Pach*) نے کیا ہے۔ پہلی جلد قدیم آرٹ پر ہے، دوسری عہد وسطیٰ سے متعلق ہے، تیسری میں عہد نہضت سے بحث کی گئی ہے ہے اور چوتھی میں موجودہ دور کا ذکر ہے۔

یہ تصنیف انشائیہ کی باندی، جوش و خروش اور نزاکت خیال کے لحاظ سے بجائے خود ایک بے مثل نمونہ آرٹ کا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ایسی چیز صرف ایک فرانسیسی دماغ ہی پیش کر سکتا ہے۔ میں نے اس کتاب کے بعض ابواب کو بیسیوں مرتبہ دیکھا اور ہمیشہ اس نیت سے کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارا وقت اس کی لذت انشا میں صرف نہ ہو گیا ہو اور اسے اپنی زبان میں ظاہر کرنے کی ہمت پیدا ہوئی ہو۔ اس کے خوبصورت و شاندار الفاظ، اس کی نازک ترکیبیں جو فرانسیسی و ترکی انشائیہ کی خصوصیات میں داخل ہیں، یقیناً کسی اور زبان میں منتقل نہیں ہو سکتیں اور اس لئے اگر میں آج کی صحبت پر ۱۹۱۱ء کے ایک باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں بلکہ صرف اس لئے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ اس میں وہ اس کا مطالعہ کریں اور اگر اردو میں بھی اس کا انشاء کا تمام خصوصیات کو قائم رکھنا ممکن ہے تو ضرور اس کی کوشش کریں کیونکہ اگر یہ کتاب تمام دکال اردو میں آجائے تو اس کو مجرہ ادب سمجھوں گا۔

نیا

دو مذہب باہم مقابل ہو جاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ یہ خیالات تھے جنہیں مسیحیت اس وقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

اسلام جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کر کے غریب لیکن آزاد عربوں کو کمرہ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔

وہ اسلام جس کے پیر و پیغمبروں کے سوا کوئی گھرنہ رکھتے تھے اور جن کا مہتاب نے نظر خواب کی سی لاناہایت دنیا کو اپنے بادیا گھوڑوں کی قیادت اور گرد و غبار کا طوفان لے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہد وسطیٰ میں اس آرزو سے ناتمام کو ایک نمودار ہوا جسے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اسی قدر وہ ہمیں عمان مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم، جسٹینیئن نے پایہ تخت یوآن کی درگاہوں کو بند کر کے ماہرین فنون اور علماء کو سائنس سے نکال دیا (یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گرگوری اعظم نے پلاطینی کتب خانہ جلا کر خاک کر دیا تھا) تو وہ ایران کی دولت ساسانی ہی کی آغوش بختی جس نے ان تمام خاندان بر باد دیہ نانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یادری قسمت کی بھی بعض عجیب و غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج باو آور دے مالک ہو گئے تو یہی عرب تھے جنہوں نے قدیم تہذیب کے انور جدید یورپ کی بنیاد ڈالی یعنی جسوقت فضا نے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اُس وقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے، ”جنات عدن“ کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت و ریاضی، جغرافیہ و طب کا احیاء کر رہے تھے اور مفتوحہ ممالک کو کاروانسراؤں، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے۔ گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کوئی داستان طیار کی جارہی تھی۔

عرب ذہنیت کا محیر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت یا متحدہ سے نہیں دہی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اذہان پر غالب رہی۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحدہ ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیا ڈاوریادی قیود سے مبرا تھی، محض اسی خصوصیت کی وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خدایوں میں ربط پیدا کر کے مطلوبہ قوموں کو انھیں متحدہ خصائص میں جذب کر لیتی تھی۔ مصر میں قبطی مغرب قحطی اور ہسپانیہ میں بربر، ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نو مسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہ رکھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، انفراسلام جہاں کہیں بھی پہنچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکر نے اعلان جہاد کیا تو مہر و شام کے فاتحین نے ہارنطینی اور قبطی کنائس میں جو بھی ان کے سامنے آئے ان پر اپنے مذہب کے اثرات قائم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر تبرک تھا۔ وہ جہاں پہنچے منلی باطنین ہو کر پہنچے اور کنائس کے در دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں ان پر انھوں نے رنگ پھیر کر قبلہ رخ دیوار میں ایک محراب کھود دی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مصری، یونانی یا رومی ٹرائیوں میں جہاں کہیں ان کو پڑانے مقون یا ٹیلپائے لے انھوں نے جمع کر کے سر اور پایہ کا خیال کے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور ان رومی صحنوں یا ارد گرد و سنو کے کے لئے متوازی قطاروں پر مخزن نئی شکل کی محرابیں قائم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دور فتوحات ختم ہو جاتا ہے، یعنی اسلام عرب ایران سے کوہستان پیری نیو تک پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقیتیں ان میں سست پڑ گئی تھیں انھیں از سر نو بیدار کرتا ہے اور اس بات پر آمادہ ہوتا ہے

ہے کہ اپنی روح غل سے مفتوح اقوام و ملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کر دے۔ تمام ممالک جو افریقہ کے ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فسیاوں سے محصور ہیں، جلدی جلدی محلات و تصورات سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام دہ سائش حاصل کرنے کے لئے دیگر اردوں کا سفر کر کے امرا آتے ہیں۔ اور جو زنج یا قافلہ ریگ ریلوں کے بے پایاں سمندر کو عبور کر کے آتا ہے تو اسے سرابی منظر کے بجائے ایک مگلابی یا نیلا گوں دھند کا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں۔ محلوں کے پستے گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح عین اسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ بقی، کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہو سکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعاعوں کے دو چادروں کے درمیان جس پر سے فائین اسلام گزرتا پیدا ہوتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلاب غنیم کی رو ختم ہو گئی۔ جب وہ آزدوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے مروج دریا کی طرح چلتی تھیں کسی بخیر غل یا سلسلہ کوہستان یا باغستان غنیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی اور چونکہ اپنی بھی سلسلہ دور ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور اس طرح وہ بھی بائزنطینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں اور کبھی سرور محلات کی چھتوں کی شکل میں محلات شاہی کے جلو خانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کا جگہ اوپر کی طرف رخ کرنے والی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی۔ اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی مخروطی صورت اختیار کر لی تھی اس کا وضع قدیم آشوری طرز کی ہو گئی تھی۔ برقی اسلام آں ساسان کے ایران میں رائج تھی۔ یہ سبک بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آزدوئیں ہیں جو فضائیں بلند ہو کر غائب ہو جانا چاہتی ہیں، گنبد کے نچلے حصہ کو تنگ کر دیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور اس طرح گویا محدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے، چودھویں صدی کا ابتداء میں ستون غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں غنیم سارنگ کو بکر کرمان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور قدرتا انھیں اس طرف مایل ہو جانا چاہئے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہو گئے جن سے موزونوں کی صدا میں بلند ہوتی ہیں۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی طرز کے نفوذ سے زیادہ وابستہ تھا پچھلے ہوئے گنبدوں کا بائزنطینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرد کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضائیں ابھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بائزنطیم کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کا اثر بن گیا اور اس نے ان رنگین چھتوں کے سلسلہ کوہ کچا جو نور صبح کے ساتھ جگمگا اٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ مائل پڑ جاتے ہیں ان کی نظروں پر مٹا دی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھیلے رہتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم اسیان میں تعمیرات سے لیکر ہسپانیہ تک سر بلند غرفوں اور بلند ترے گنبدوں کی طرف نظر مائل رہا اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تعمیر و طبعی حصص مساجد کی ترتیب اور ہتھیاروں کی وضع قطع بھی بدل دیے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور۔ کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابرو دار بناتے تھے۔

معمری مساجد البتہ روح صحرائی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف

رہیں۔ لیکن مغربِ قصیٰ اور ہسپانیہ کی مساجد میں سیاہ و سفید پتھروں کے بنے ہوئے محراب دار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بندی بھی دگنی ہو گئی گو یادہ کھجور کے درخت تھے جن کی چوٹیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلنے ہیں۔ قرطبہ کی غالب شان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی، جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قائم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل۔ اس کے سایوں میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہو گئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہنچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے۔

(۲)

مغربِ قصیٰ کے ماہرین فن تعمیر اپنے محراب دار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کر دیتے تھے۔ ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت و شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ باہندہ مختلف ہوا کرتا تھا۔ اندلس کے مملکت طرماہ ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروز سی ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قائم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شقائق حرمیں حوض بھی۔ ذیروح چیزوں کی تعداد پر سے اقصائے مغرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کے لئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی و دلکشی پیدا کی جائے، چنانچہ قوسی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکنے جھکنے محراب کی صورت ایسی ہو گئی جیسے گھڑے کے نعل پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کر کے اس کے خطوط منحنی کر دئے گئے۔ کناروں پر محراب در محراب بنائی گئی۔ شہر کی کئی کچھت کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کر کے پیل بوٹوں سے مزین کر دیا گیا۔ بس یہ کام بھی ہو گیا تو بچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پتیاں نصب کی گئیں۔

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانے کا کام کمال کو پہنچ گیا تو اس کی دسترس سے جو بھی نہ بچیا اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش و نگار نظر آنے لگے۔ اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے پیل بوٹوں میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے۔ پہنچے دم گلا کی بیلوں۔ مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور طغریں میں انھوں نے اپنے ذوق آرائش کو صوف کر دیا اور خطوط کے اندر اس کی عمودیت اور پیچ و خم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، مدنی لکیروں، بیضیوں، شکلوں سے جیومیٹری کی سخت اور صحیح شکلوں تک پہنچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علاحدہ ہوتی سقین مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی بایوں اور پیچ و خم خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنائے گئے گو یا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں پر کسی نے غریفوں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گادومیناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور چکن کے تھان پھیلا دئے ہیں۔ جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش و زیبائش کا فن خود بخود کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلاکاری کا کام پھول پتیوں کا گلہ سے بنانے سے پیدا ہوا۔ جیسا کہ قاسم کی جامع ابن طولون کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ قومات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر

راحت پسند ہو گیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت مل گئی تھی جب چودھویں صدی نے اپنا ضابطہ آرائش و زیبائش وضع کیا تو اس وقت تکینل عرب بہت بلند ہو چکی تھی۔ جب لوازم فن آرائش و زیبائش میں کثیر الاضلاع و کثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اس سے ایسے عام اصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبائش و تزئین کا کام لے سکیں۔ چنانچہ اس وقت سے عربی فن نقاشی ایک صحیح و مستقل فن بن گیا اور اس نے اتنی ترقی کی کہ تصورات ربانی کو بھی انھیں اشکال میں مشکل کر کے دکھایا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضائے بسیط کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے پیل بوٹوں میں بڑی ترقی کی کیونکہ ان سیلوں کی بھی نہ کہیں ابتداء ہے نہ انتہا۔ اور ان کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جا کر رک جانا محال ہے۔ یہ پیل بوٹے کیا ہیں گویا عالم الکرت کی وہ آوازیں ہیں جن کو ادل اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن بس غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے۔ فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقاء کا پابند ہے، اگر تکمیل فن کی خواہش کے بجائے سائنٹفک تحقیق کا ذوق رکھ دیا جائے تو اس کے اندر جدوجہد فنا ہو جائے گی اور اس کا جوش و خروش سرد پڑ جائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقہ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرین فن کے ہاتھوں میں صرف ایسا اذکار بن کر رہے گا جس کا مقصد فن تعمیر کی منطقی حیثیت نمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کسی قوم کا فن تعمیر سے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے منحنی صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی خطوط کا غلام رہے گا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذیروح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں ہسپانیہ اور مراکش کے مساجد و قصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں تاہم تمام موحّد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں پیدا ہوئیں قوم عرب بھی ذہنیات چیزوں کی اشکال و صورت سے متنفر ہونے میں صرف اپنی حیثیت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبّت کو صرف دور انحطاط و زوال میں دباتا ہے۔ لیکن جب حاکمیتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبّت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے بصر و شام کے فنون اسلامیہ میں دہی ریگستان کی عریاضیت، دہی ریگستان کی اُداسی اور دہی ریگستان کی شان و شوکت پائی جاتی تھی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کے ٹھنڈے مجرموں کی گہرائیوں میں خلفاء اگر حکماء و فلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحات ملکی اور تاخت و تاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ اگر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جہم ہوئے خون میں سونے کی انیٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے اٹھ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایسا فن میں تو یہ فن گویا ایک خیابان گل وریاحین تھا۔ سرزمین ایران کو مشرقی سواحل بحیرہ روم کے ریتیلے میدانوں یا اُملس و مراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت اور آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں اور

سطح آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے بہت دور اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں، ہوائیں بلور کی سی چھائی پائی جاتی ہے۔ نسیم ہانپنے کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغلہ اور گلابی ممبرہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے بکھیر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھکان اور فصل بہار سے موسم خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر سہرے زرد رنگ تک تمام قسم کے مہموم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کہو تر اُڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود ہوتے ہیں جو اویل فصل بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلور کی گنبد اور ان کے بلند مینار جو ہر سال کے درختوں میں سے اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں عجیب و غریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے، فیروزہ، پیازہ، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تسویریں بنائی گئی ہیں۔ اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے قافلوں کیساتھ صحرا کے غلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں پختے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش و نگار ہیں محو ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جو رخن ان پر چڑھایا گیا ہے وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایران قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترک تاروں کے ساتھ پیرامیان میں آگیا۔ یہ ابتداء بھی تک شیشہ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول ہوئے ہیں ان میں ہنسی، نیلے، سفید، لاکھی اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب اظہار کرتی ہے روغن مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی پسند جوٹیوں کے نیچے فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خط شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی درخور خوشامی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے ہیں گویا آویزے ٹنگ رہے ہیں بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی نو میں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیاں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ بھی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاسی مایل زمین میں سب دہائے گل منتشر کر دئے گئے ہیں، لیکن سولہویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چکارہ روغن اینٹوں نے لے لی۔ آسوت ایران میں جو طبقہ اہل فن کا پیدا ہوا اسے ان لوگوں کی ہدایت اور مشوروں پر چلتا پڑا جنہوں نے مساجد کو تمام روغن، زمینت و زیبائش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر اور مانی اور خصوصاً بہزاد کے مہتمم کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی اونچے مرتبت و رفعت حاصل ہو جائے، حرفت کو زہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے فن اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں ذی روح کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان طرف پر لگی دریاہیں لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرداریدی امواج، آجاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پہنائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطرات، رنگ کے چھٹیوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاط باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشان عجم کا یہ چہستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہو گیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشاں سرف کردی تھی۔

یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذبات نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، چین کا تمام بطنی السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہو گئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائر جاپان تک اور مغربِ قصی سے لیکر ہندوستان تک عجیبی مصوری کے خزانوں کو لئے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحر عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشات نفسانی حمد کیفیات نشہ و سرور اور قدیم اقوام و ملل کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا مجموعہ مرکب ہے۔ وہ ایک باغِ عدن تھا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلا گوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و عورت کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجیبوں کے لئے تو جس قدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام بتوں میں پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کا سہ ہائے چینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلائی چچوں سے قند و گل کھایا کرتے تھے۔ میدانی مناظر کی تصاویر میں جہاں سُرخ، سبز اور سنہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ فرشِ تصویر پر نرم فرشِ مخلیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طناز خوبصورت رہوار گردنیں خم کئے سر پہٹ روڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحبِ فخر و ناز راگب سوار ہے۔ گلانی پر ایک باز ہے اور ایک درخشاں طرہ و ستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلو خانے فرطِ گل و ریاحین سے مشجر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی رودغنی ابردار دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیں بلوریں ہیں فرشِ رنگیں قالینوں کا ہے، جہاں طلائی طاووس اپنی زمردیں دُریں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگِ سماق اور سنگِ یشب کے گمے نصب ہیں۔ آبِ شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اُچھال رہے درجہ بدرجہ پستے ہیں، نیا بانیں ہیں اور بروج ہیں جن کے رنگ گلانی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی ایسے چمکتے ہیں، جیسے طلوعِ آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طایفہ اربابِ نشاط کنارِ آب بیٹھا ہوا لغز و سرور میں مصروف ہے، پختہ پھولوں کی فرحتِ بخش خوشبوئیں دماغ میں پہنچتی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ کر اسے۔ یہ تمام دلفریب مناظر مومے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چمکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستانِ گویانِ پاستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے اور جنہیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے نیچے حلقہ جا کر بیٹھے ہوئے خوش مزاج مسافروں کو سنا یا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیتِ مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں بعض وہ ہیں جو شہینہ کی سفید عباؤں اور چنوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زرد جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلم بنا تے ہیں وہ ان میں جواہرات جڑتے ہیں۔ وہ ابردار اور منقش ظروفِ مسی میں اپنا پانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے جو کبھی شہسے پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشا نوش میں اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پروا ہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے استغراق و تصور کی بہشت میں حیرت

آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سوائے ان کی سخت کاہلی اور جمود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لاپرواہی سے منہدم ہو جانے دیتے ہیں جس قدر جوش و خروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔ موسم کی شدتوں، فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں بے پروا کر دیا ہے۔ دو متمرد آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس چاہے ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجربہ اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کر لیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کر جاتی ہیں، جن پر بہیمانہ زندگی سے آگے بڑھ کر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہنچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہم کو وہ مشرقی قومیں بھی شمار کر لینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یورپین قومیں متعلق ہیں۔

میشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالباً اس قدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سامانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک روحانی مذہب بغیر بت پرستی ہی کے کام چلا سکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ سے تو تھا اور وہ انکو ترقی دیا کرتے تھے، بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتاً خشک کر دیا جائے۔

اگر بت پرستی بائزنطیم کو نہیں بچا سکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائزنطیم شجر یونانی کا ایک سڑا ہوا پھل تھا۔ مگر وہ بت پرستی ہی تھی جس نے مسر و یونان اور ہندوستان کو بنادیا، جس نے قوم قوط کے انقلاب سیاسی کی زنجیریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کر دیا اور جو یورپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف ادراہم و تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن، بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے، جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ غلستانوں کی پناہ تلاش کرتے ہیں۔

یہ خیال درست نہیں کہ بت پرست قوموں نے خود کو اصنام پرستی سے آزاد کر لیا تھا بلکہ فی الحقیقت انھوں نے بت پرستی ہی کے ذریعہ سے نجات حاصل کی تھی، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اصنام پرستی کے ذریعہ سے دنیا میں منقولات کا سلسلہ جاری کیا۔ کیونکہ وہ تجزیہ و تحلیل کا ایک بے نظیر ذریعہ تھا۔ جو لوگ سوائے روح کے اور کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی اپنے آپ کو نفسیاتی بتوں سے علیحدہ نہیں کر سکے اور اس لئے یہ کہنا کہ انھوں نے بت پرستی نہیں کی غلط ہے۔ بہت ساری خیالی انسانی کے لئے ایک سہارا ہے اور یہ سہارا اس خیال کو حدود حقیقت کے اندر قائم رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ تخیل انسانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بت پرستی تجربہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہمارا توازن متزلزل ہو جاتا ہے تو ہم بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ ہم کو نظم و ضبط سکھائیں تاکہ ہم پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور جب صحرا میں پیدا ہونے والے انبیاء و رسل کا بتایا ہوا خیال گرد و غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا تو اس وقت بت پرستی ہی دنیا کو بچائے گی

باشندگان قاف کی خودداری و شجاعت

(مسلمانوں کی اولین جمہوریت کا قیام)

۱۲۷۱ء کی جنگ ختم ہونے کے بعد جس قدر پیچیدگیاں مملکت روس میں پیدا ہوئیں اور جو سیاسی اختلافات سلطنت زار میں پیدا ہوئے، ان کی مثال کسی دوسرے ملک میں مشکل سے نظر آسکتی ہے۔

ہم نہیں کہتے کہ بالشویت دنیا میں صرف امن و سکون ہی کا پیغام لائی اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا کوئی تاریک پہلو نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زاریت کی مستبد و جابر حکومت نے جو صدیوں سے وہاں کی قوموں کو پامال رکھا تھا، اس کا جواب صرف بالشویت ہی ہو سکتی تھی اور اسی کی برکت تھی کہ وہاں کا ایک ایک فرد جذبات آزادی سے سرشار نظر آنے لگا۔

بہت سے لوگ وہاں اصول بالشویت کے مخالفت پر بھی آمادہ ہو گئے اور بالشویک حکومت نے بھی ان کی سرکوبی میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھانا رکھا، اسی کے ساتھ وہاں مختلف خیالات کی مختلف جماعتوں نے عام برہمی بھی پیدا کر دی، لیکن حریت و آزادی کے خیال سے کوئی غافل نہ تھا اور چھوٹی سی چھوٹی ریاست بھی اپنی جگہ خود مختار پہچاننے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں صوبہ قاف نے بھی بالشویت کے مظالم و قتل عام کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا اور یہ فخر غالباً مسلمانوں کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے وہاں اپنی جمہوریت قائم کی اور شدید ترین مخالفت اسباب کی موجودگی میں انہوں نے اپنی خودداری کا ثبوت دیکر آخر کار آزادی حاصل کر لی۔

بہار معلوم ہوا اور بالشویک حکومت قائم ہوئی تو اہل قاف نے محسوس کیا کہ ان کی غلامی ہنوز باقی ہے اور انقلاب قاف ان کے درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ اس احساس میں بارجیا اور آذربائیجان نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ایک ”اتحادی جمہوریت ماوراء قاف“ قائم کر کے فلسطین میں جلسہ کیا، اس میں تین ممبر ہر قوم کے شامل ہوئے اور چونکہ فلسطین ملک میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اس لئے ان کے نمائندے کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ قیام جمہوریت کی داستان سنیں، مختصر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس وقت اہل قاف اور بالشویکوں کے باہمی تعلقات کیسے تھے، اس وقت باکو کا صوبہ (جس کا صدر مقام فلسطین تھا) نہایت کشمکش میں مبتلا تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی عیسائیوں کی ہمداری سے جو درپردہ لہنوں کی حکومت سے ملکر مسلمانوں کو بالکل خارج البلد کر دینا چاہتی تھی، بہت پریشان تھی۔ دوسری طرف بالشویک حکومت بھی سخت درپے آزار تھی اور ان مسلمانوں کی تمام دولت پر قابض ہو کر انہیں عملاً

بیدست و پاگردیا تھا۔

جب حالت ناقابل برداشت ہو گئی اور جارجیا و آرمینیا میں بھی احساس حریت پیدا ہوا تو ایک قومی فوج مرتب کی گئی مسلمانوں نے جنہیں عہدہ دار میں فوجی خدمت نہ دی جاتی تھی بلکہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، فوج کی ترتیب میں معقول حصہ لیا اور باکو و الزبتھ پول کو عسکری مرکز قرار دیا گیا۔

باشیوکوں نے یہ طیاری دیکھ کر اپنی تدابیر میں زیادہ شدت پیدا کر دی اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ جوان کی فوج میں شامل تھے بڑا سلوک شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دستے برہم ہو گئے۔ باشیوکوں نے جہازوں سے شہر پر گولے گرانے شروع کئے اور ۱۸ مارچ ۱۹۱۸ء سے لیکر ۲۲ تک مسلمانوں کا قتل عام کر کے ان کی دولت کو لوٹ لیا اس قتل و غارت گری میں بڑا حصہ آرمینیوں نے لیا اور باوجودیکہ آرمینیوں کی قومی کونسل اس سے قبل مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کر چکی تھی، لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی بغض و تعصب کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں کے تباہ کرنے میں انھوں نے غیر معمولی سختی سے کام لیا۔

بارہ ہزار اسلامی نفوس شہید ہوئے اور ان کے مکانات، مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے اور کتب خانے مسمار کر دیئے گئے، تمام بڑے بڑے سیاسی رہنما گرفتار کئے گئے اور بعض جان بچا کر نکال گئے۔ اگر اسی زمانہ میں ترکستان کی روسی رجمنٹ بگڑ کر مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جاتی تو معلوم نہیں اس قتل عام کا سلسلہ کہاں تک وسیع ہوتا، بہر حال اس طرح سو و بیس اثر تمام صوبہ باکو میں قائم ہو گیا اور وہاں کے تمام بنکوں، باغیوں، زمینوں اور مال و اسباب پر ان کا قبضہ ہو گیا، اسی کے ساتھ کو با اور تافا میں آگ لگادی گئی، داغستان پر تسلط قائم ہوا اور عام طور پر مسلمانوں سے بیگاری جانے لگی۔

پھر چونکہ برسٹ لٹوسک معاہدہ کی روسے قارس، باطوم اور اردہن روسی حکومت نے ترکوں کو دیدیا تھا اور وہ اپنی فوجیں یہاں قبضہ کرنے کے لئے بھیج رہے تھے اس لئے جانچیا نے جرمنی سے گفتگو شروع کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۲۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو آذربائیجان نے بھی اس کا تتبع کیا۔ فتح علی خاں جو مجلس وزراء کا صدر تھا کا عینہ متین کرنے کے لئے مامور ہوا اور چوبہ ماہ کی مہلت دی گئی تاکہ اسکے اندر دستوری حکومت کا نظام مقدر کر دیا جائے۔

یوں ۲۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو الزبتھ پول میں جمہوریت آذربائیجان کا اعلان ہو گیا اور نئی مشروطی حکومت قائم ہو کر کونسل کے پریذیڈنٹ نے ان تمام ریاستوں کے متعلق اپنے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے جو آذربائیجان کی خود مختار جمہوریت کے تحت میں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ نئی حکومت کے سامنے بہت سے مشکلات عاید تھیں۔ آرمینیا کی باشیوک جماعت باکو کی اپ تک مالک بنی ہوئی تھی اور اپنے اقتدار کو چاروں طرف وسیع کر کے آذربائیجان، جارجیا اور آرمینیا کی حکومت کو تباہ کر دینا چاہتی تھی تاکہ سالانہ قاف سویت اثر کے ماتحت آجائے۔ لیکن نے اس جماعت کے سردار کا لقب اسی لئے ہائی کمشنر قاف رکھا تاکہ وہ زیادہ قوت کے ساتھ کام کر سکے۔ دوسری طرف مشہور جنرل اینڈرنیک نے جو بظاہر اختلاف تلاش کا دوست بنا ہوا تھا، ترکوں سے شکست کھا کر اضلاع ناریشون اور زنگزور کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو ہائی کمشنر قاف کا ماتحت ظاہر کیا۔ اس کے بعد وہ آرمینیا، باشیوک انواع کے ساتھ اپنے

کے لئے آگے بڑھا جو الاپچ کی طرف بڑھتی آرہی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹرٹروسک (دوغستان) سے لیکر موسول تک (۲۶۰ کلومیٹر) ریلوے لائن روسی افواج کے قبضہ میں آگئی اور سیکڑوں گاؤں تباہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو تیغ کر دیا گیا۔

باکو کے جنوب میں بالشویک بیڑہ ساحل پر گولہ باری کر رہا تھا، تاکہ سلیم اور ننگوران پر قبضہ ہو جائے اور اس طرح پکاس سے زائد گاؤں اس نواح کے بھی آگ کے نذر ہو گئے، اس سول وار کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان آبادی کو فنا کر دیا جائے اور جمہوریت آذربائیجان کو تباہ و برباد۔ چونکہ حکومت آذربائیجان اس فتنہ کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی اس لئے اس نے ترکوں سے مدد طلب کی جن کی فوجیں سرحد پر پڑی ہوئی تھیں ترکوں نے اسکو منظور کر کے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے آذربائیجان کی آبادی کو تسلیم کیا گیا اور اپنے لئے وہاں کچھ اقتصادی رعایتیں مخصوص کرالیں، ترکوں کی اس مدد سے ان کی ہمت بڑھ گئی اور انھوں نے جلدانہ پہلو اختیار کر کے ۱۷ ستمبر ۱۹۱۸ء کو باکو پر قبضہ کر لیا، جب فوج باکو میں داخل ہوئی تو سخت جنگ ہوئی اور آرمینیوں نے شدید مخالفت کی، لیکن بہر حال باکو پر قبضہ ہو گیا اور کشت و خون کسی نہ کسی طرح بند کیا گیا۔

اسی وقت ایک اور جدید فلسفہ پیدا ہو گئی، یعنی جرمنی نے بالشویکوں کی طرفداری شروع کر دی اور فلس و باکو کے درمیان ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سلسلہ مراسلت جاری ہو گیا جس سے صرف بالشویک سردار واقف تھے، جرمنی اہل آذربائیجان کا سخت مخالف تھا کیونکہ ان لوگوں نے جرمنی کی پیشقدمی کو روک کر اس کی مدد کو نامنظور کیا تھا، اور چونکہ باکو میں پٹرول کے چشمے ہیں اس لئے جرمنی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کا اثر یہاں قائم ہو جائے۔

جب باکو پر اہل آذربائیجان کا قبضہ ہو گیا تو پھر جرمنی نے ایک سیاسی مشن کے بہانے سے فوجی آدمیوں کی بڑی تعداد وہاں بھیجی چاہی لیکن سرحد پر انھیں روک دیا گیا اور جن لوگوں کی جائیدادیں بالشویکوں نے ضبط کر لی تھیں انھیں واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک قومی مجلس قائم کی گئی اور اس میں گیارہ نمائندے روسیوں کے، ایکس آرمینیا کے، ایک جارجیا کا، ایک پولینڈ کا، ایک اہل جرمنی کا، ایک یہودیوں کا، اور ۴۴ نمائندے مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں کے مقرر کئے گئے، کابینہ کے چودہ عہدہ داروں میں ۶ عہدے عیسائیوں کے لئے مخصوص کئے اور غیر مسلم اقلیت کو پورا لحاظ کیا گیا۔ حالانکہ جارجیا اور آرمینیا نے باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ۳ لاکھ ہے ایک عہدہ بھی اپنے کابینہ میں مسلمانوں کو نہیں دیا۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں پریسڈنٹ ولسن کے مشہور پیام امن پر آذربائیجان کی حکومت کے تار کے ذریعہ سے درخواست کی کہ اس کی آزاد جمہوریت کو تسلیم کیا جائے۔ چونکہ سرزمین قان ابنی زرخیزی اور تیل کے چشموں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اس لئے تمام دولت پرور پارس پر اپنا اپنا اثر قائم کرنے کے لئے بیتاب تھے، بالشویکوں نے تو اس مسئلہ میں ابنی انتہائی کوششوں سے کام لیا اور جرمنی نے بھی اپنی پوری قوت صرف کر دی، لیکن برطانیہ ابھی تک موقع کا منتظر تھا اور قریب کے دیران علاقہ پر اپنی فوجیں جمع کئے ہوئے مناسب وقت و محل کا انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ اہل آذربائیجان کو امداد کی ضرورت ہے تو بالشویکوں کے خلاف ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب اتحادیین اور ترکی کے درمیان التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو اتحادی افواج کے کمانڈر جنرل طاسن

نے جو ایران میں مقیم تھا، حکومت آذربائیجان کو اطلاع دی کہ حسب شرائط اب ترکی کو قات کا علاقہ چھوڑنا پڑے گا اور اس صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم عارضی طور پر باکو میں آکر بالشویکوں کو حدود قات سے نکال دیں۔

چونکہ حکومت آذربائیجان حقیقی معنی میں امن و سکون چاہتی تھی، اور جنرل طامسن نے اس کو یقین دلادیا تھا کہ جمہوریت کے خارجی معاملات میں وہ بالکل دخل نہ دے گا۔ اس لئے یہ درخواست منظور کی گئی اور ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنرل طامسن اتحادی افواج کو لیکر باکو میں داخل ہو گیا جہاں اس کا بہت پر جوش خیر مقدم عمل میں آیا، اس کے بعد ان لوگوں نے جو جمہوریت آذربائیجان کے مخالف تھے سازشیں شروع کیں، لیکن جنرل طامسن اور نمایندگان فرانس و امریکہ نے ان سازشوں کی اصل روح کو سمجھ کر جمہوریت آذربائیجان کو مستقل حکومت تسلیم کر لیا۔

اس جدید حکومت نے جس رواداری سے کام لیکر روسیوں اور آرمینیوں کی جان بخشی کی، اور ان کی خونریزیوں کو جس فیاضی سے نظر انداز کیا۔ اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے، لیکن انھوں نے اپنی شرارت کسی طرح نہ چھوڑی اور آبادی کے آرمینیوں نے اپنی تمام قوت مسلمانوں کے خلاف جاری رکھی۔

جس زمانہ میں حکومت آذربائیجان باکو کو آزاد کرانے کی فکر میں مبتلا تھی، اینڈرینک شہر چارچا یا شادشا کے محاصرہ میں مصروف تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی اس قدر پریشان ہو گئی تھی کہ پانی اسے میسر نہ آتا تھا، لیکن جب باکو کے مسئلہ سے فرصت ہوئی تو حکومت آذربائیجان نے شادشا کا رخ کیا، اور قبضہ کرنے کے بعد امن و سکون قائم کیا، لیکن اس کے بعد جب فوجیں یہاں سے چلی گئیں تو آرمینیوں کی شرارتیں عود کر آئیں اور غریب مسلمانوں پر پھر ظلم توڑے جانے لگے۔

آخر کار حکومت آذربائیجان نے جنرل طامسن کو اس طرف توجہ دلائی۔ جنرل طامسن نے ایک تار کے ذریعہ سے اینڈرینک کو جہنم کی کہ اسے اپنی شرارتیں ترک کر دینی چاہئے لیکن وہ باز نہیں آیا اور جب تک اس نے حدود آذربائیجان کو چھوڑ نہیں دیا اس کا السداد نہ ہو سکا۔

چونکہ جمہوریت آذربائیجان تمام دولِ عظمیٰ سے اپنی حکومت کو تسلیم کرانا چاہتی تھی اس لئے وہاں کی پارلیمنٹ نے جنوری ۱۹۱۸ء میں ایک وفدِ صلح کا نفرنس میں شریک ہونے کے لئے پیرس روانہ کرنا چاہا لیکن قسطنطنیہ پہنچ کر پاسپورٹ حاصل کر لے میں اسے بہت دیر لگ گئی اور ۲۲ اپریل سے پہلے وہاں نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس کی یہ محنت بیکار نہ گئی اور آخر کار ۱۲ جنوری ۱۹۱۹ء کی تمام دولِ یورپ نے آذربائیجان کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔

توقیت : آٹھ آنہ ————— نقشہ ہائے رنگ رنگ : چار آنہ

ریاض نمبر : — بجائے ایک روپیہ صرف ۸ کے ٹکٹ بھجکر حاصل کیجئے ————— میجر منگرا لکھنؤ

قدیم تمدن اسلام کی تازگی

جدید و قدیم تمدن کا موازنہ

تمدن حاضر کی فقائیں سائنس لینے والا انسان، عہد موجودہ کو ترقی تمدن کے لحاظ سے بہترین عہد خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو ترقیاں معیشت و معاشرت کی اس وقت نظر آتی ہیں، وہ اس سے قبل بالکل مفقود تھیں۔ اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے صحیح طور پر لیں تو یہی گزشتہ تمدن پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا، کیونکہ انسان نے ہمیشہ تدریج کے ساتھ ذہن بزمینہ ترقی حاصل کی ہے اور اس کے لئے ناممکن تھا کہ جو نتائج مسلسل تجربوں کے ہو سکتے ہیں، انہیں دفعتاً حاصل کر لیتا، خود اسی دور ترقی کی ابتداء کو موجودہ حالات سے مقابلہ کر کے دیکھیں تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا لیکن کیا وہ شخص جس نے پہلے قوت کبرا کو دریافت کیا، بلکہ کوئی سے کم مرتبہ کا ہو سکتا ہے۔ کیا آلہ بخار کے موجود اول کی عزت عہد حاضر کے میکاٹنی علماء سے کم کی جاتی ہے۔ بلکہ اگر ہم انصاف سے کام لیں تو ہمیں عہد قدیم کے مخترعین و مصلحین آداب کی زیادہ وقعت کرنی چاہئے کیونکہ جدید حضارت و تمدن کی تعمیر انہیں کی قائم کی ہوئی بنیاد پر استوار کی گئی ہے۔

یہ امر مسلمت تاریخی میں سے ہے کہ موجودہ اصول تہذیب بڑی حد تک اسلامی تمدن کے ممنون ہیں، لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ موجودہ نظام معاشرت کی بہت سی وہ باتیں بھی جنہیں اختراعات عہد جدید سمجھا جاتا ہے، حقیقتاً عہد اسلام کی یادگار ہیں اور اسے بہت پہلے بالکل اسی طرح رائج تھیں اور جس کو عہد الفتح عبادہ نے حضارت اسلامی کے ان مناظر پر روشنی ڈال کر پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔

دندان سازی کہا جاتا ہے کہ سونے کے دانت بنانا مغربی تمدن کی اختراع ہے اور صرف دور حاضر کی چیز ہے، لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے، کیونکہ اہل عرب کے ہاں ابتداء عہد حضارت میں اس کا رواج تھا اور تاریخ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ ”امیر المومنین حضرت عثمان غنی جب زیادہ سن رسیدہ ہو گئے تو آپ نے دانتوں کو سونے کے تار سے بندھوایا بعض کا قول ہے کہ ایک دانت چورا سونے کا تھا۔ اسی طرح حسب روایت جاحظ، عبدالملک بن مروان کا اپنے دانتوں کو سونے کے تاروں سے مستحکم کرانا ثابت ہے (الہیامان والبتین - جلد ۱ - صفحہ ۲۴)۔

اس وقت سونے کے دانت بنانا یا طلائی تاروں سے دانتوں کو مستحکم کرنا خاص فن ہے اور اسی کے لئے بڑی نہارت و مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن تاریخ قدیم میں متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن کی تکمیل اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی،

مسلمانوں میں مردوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال ناجائز ہے اور اس لئے بعض زاید معترض ہوں کہ حضرت عثمان غنی نے کیونکر اسے جائز رکھا۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب اسلام نے دانت، مصحف اور تاوار کے لئے سونے چاندی کا استعمال ناجائز رکھا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف دندان سازی کی یہ مخصوص صنعت اس وقت رائج تھی بلکہ لوہے اور چمچے پر بھی سونے کا کام کیا جاتا تھا۔

اس وقت جب کوئی بات پسند آتی ہے اور اس کی تکرار چاہی جاتی ہے تو تالیاں بجائی جاتی ہیں اور اظہار تحسین تالیاں بجا کر (once more) فرانس میں اس کے لئے لفظ ”Bis“

مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بالکل جدید طریقہ تحسین ہے، حالانکہ حضارت اسلام میں اس کا رواج موجود تھا، صاحب تیمتہ الدہر نے لکھا ہے کہ ”صاحب ابن عباد کے سامنے ابو محمد خازن اس کی طرح میں ایک قصیدہ پڑھ رہا تھا اور ابن عباد معہ تمام اہل بزم کے نہایت غور سے سن رہا تھا، جب نصف قصیدہ تک شاعر پہنچا، ابن عباد فرط مسرت سے اُچھل پڑا اور جب وہ ختم ہوا تو اس نے تالیاں بجائیں اور کہا کہ ”ابد“ یعنی ”تکرار کر“ یہ لفظ مترادف ہے (once more) کا تیمتہ الدہر جلد ۲ صفحہ ۳۵ ابن خطیب کی روایت ہے کہ جب ولید اندلسی حج کرنے کے بعد واپس ہوا تو مصر آیا اور یہاں متنبی شاعر سے ملا۔ دوران گفتگو میں متنبی نے کہا کہ ”الاتشد فی شئنا لم یلح الاندلس“ یعنی کچھ کلام ملح اندلس کا بھی سنائے۔ (یلح اندلس سے ابن عبد ربہ صاحب عقد الفرید مراد ہے) چنانچہ ولید نے کچھ شعر اس کے سنائے اور متنبی نے اظہار تحسین میں تالیاں بجائیں اور کہا ”یا ابن عبد ربہ لقد تلتک العراق جوا“ اہل عرب کے ہاں دسترخوان کا طول ۵ ذراع (۲۵ گز) ہوا کرتا تھا اور نشست کا انتظام ہر شخص کے مرتبہ و حیثیت کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ جو شخص ان میں سے سب سے بڑا ہوتا تھا، وہ صدر دسترخوان ہوا کرتا

طریق طعام

تھا، جب آج کل یورپ میں عام دستور ہے۔ (معجم الادباء۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۶) آج کل فہرست طعام (Menu) مرتب کرنے کی تہذیب عبد حاضر کی اختراع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اہل عرب میں اس کا رواج عام تھا، جب امام شافعی بغداد میں زعفرانی کے مہمان تھے، تو زعفرانی روزانہ کھانوں کی تفصیل کنیز کو بتا دیا کرتا تھا اور وہ اسی کے مطابق ایک فہرست جسے انگریزی میں (Menu) اور عربی میں خریطۃ الطعام یا ورقۃ الطعام کہتے ہیں امام شافعی کے سامنے کھانے سے قبل پیش کر دیا کرتی تھی اور ایک دن امام شافعی نے وہ فہرست کنیز کے ہاتھ سے لے لی اور اس میں ایک کھانے کا اضافہ اور کر دیا، جب زعفرانی کو یہ معلوم ہوا تو فرط مسرت سے اس نے کنیز کو آزاد کر دیا۔ (المستطون جلد ۱ صفحہ ۴۹) صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ ”ایک مرتبہ بلال بن ابی بردہ نے جو بصرہ کا امیر تھا، جارد سے جو عبدالاعلیٰ بن عبد اللہ کا جلیس تھا، دریافت کیا کہ جب کھانا آتا ہے تو تمھارا سردار (یعنی عبدالاعلیٰ) کیا کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جب دسترخوان بچھا دینے کے بعد لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو ایک شخص آتا ہے اور ان کھانوں کی فہرست بتاتا ہے جو طیار کئے گئے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی خواہش کے مطابق کم و بیش طلب کرتا ہے۔

کھانے کے وقت موسیقی اس وقت نہ صرف یورپ کے لوگ دھار کے ہاں بلکہ بڑے بڑے بھٹوں میں بھی دستور ہے کہ

کھانے کے وقت موسیقی کا شغل بھی رکھا ہے اور بینڈ یا آرکسٹرا (orchestra) قائم کیا جاتا ہے۔ بالکل سی دستور ملوک عرب اور خلفاء اسلام کے ہاں بھی پایا جاتا تھا کہ جب وقت وہ کھانے پر بیٹھتے تھے تو ارباب نشاط اپنے آلات طب لیکر موسیقی چھڑ دیتے تھے۔

نماز کے بعد موسیقی جب فاطمین کی سلطنت عروج پر تھی تو نماز کے بعد نقارہ و طبل بجا یا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ موسیقی بھی ہوتی تھی، مقرر نے لکھا ہے کہ عشاء کے وقت جب قصر خلیفہ کے اندر نماز ہوتی تھی تو فارغ ہونے کے بعد نقارہ وغیرہ

بجانے کا حکم دیا جاتا تھا (المقرنری جلد ۲۱ - صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶)

فاطمین سے قبل اخشیدین کے زمانہ میں بھی ہر نماز کے بعد ملوک و اہل عمار کے آستانوں پر نہایت و نقارہ بجائے جانے کا رواج تھا۔ چنانچہ مقرنری نے بیان کیا ہے کہ جب کافور اخشیدی دمشق کو واپس لینے کے ارادہ سے نکلا تو اس نے ان نقاروں کو بجا یا جو ہر نماز کے وقت بجائے جاتے تھے، یہ نقارے تانبے کے تھے ان کی تعداد ایک سو تھی۔ (المقرنری جلد ۲ - صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶)

اس سے ثابت ہوا کہ عہد حاضر میں کلیسا کے اندر یا باہر نماز کے وقت موسیقی کا رواج کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی حضار اسلام سے استعارہ کیا گیا ہے۔

محافل عیش و مسرت اہل عرب جس تفنن اور جدت طرازی سے کام لیتے تھے، اس کی کوئی نظیر عہد حاضر کی طرف سے پیش نہیں کی جاسکتی مثلاً ایک محفل بادہ کا منظر ہے کہ ایک نہایت آباد و پر گل باغ کے وسط

میں ایک خوبصورت نہر دایرہ دار جاری ہے، اس کے کنارے رندانے آتشام بیٹھے ہیں۔ ساقی ایک جام میں شراب بھر کر جس کو دینا مقصود ہوتا ہے اس کو ”کاسک یا بن فلاں“ کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور پانی کی لہروں پر جام چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ پینے والے کے قریب پہنچتا ہے تو اسے اٹھا کر پی لیتا ہے اور پھر پانی میں چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ گھوم کر پھر ساقی کے پاس پہنچ جائے۔

ایسی ہی ایک مجلس کا حال ابو محمد عبد الجبار بن حمدی الصقلی نے اپنی ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے :-

وساقیۃ تسقی الندامی بکدہ	کو دنا من الصہبہ طاعینۃ الکمر
یعوم فیہا کل جام کانا	تضمن روح الشمس فی جسد البدر
اذا قصدت منادیا زجاجة	تناولہا رقتا بانملہ العشر
فی شرب منہا سکرہ عینۃ	تنوم عین الصحو منہ و ما یدری
ویرسلہا فی ما نہا فیعیدہا	الی راحتی ساقی علی حکمہ تجری

(یعنی ایک خوبصورت نہر دایرہ دار جاری ہے، اس کے کنارے رندانے آتشام بیٹھے ہیں۔ ساقی ایک جام میں شراب بھر کر جس کو دینا مقصود ہوتا ہے اس کو ”کاسک یا بن فلاں“ کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور پانی کی لہروں پر جام چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ پینے والے کے قریب پہنچتا ہے تو اسے اٹھا کر پی لیتا ہے اور پھر پانی میں چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ گھوم کر پھر ساقی کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بعد وہ جام کو پانی پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ پھر اس ساقی کے پاس پہنچ جاتا ہے جس کے حکم پر وہ آتا جاتا ہے)

جانوروں کے پانی پینے کے عوض | آج کل جانوروں کے ساتھ بہت نرمی کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے اور ان کے لئے میدانوں اور سڑکوں پر صاف ستھرے پانی کے حوض بنائے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی اہل مغرب کی جدت نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت قبل بغداد، دمشق، قاہرہ، قرطبہ، غرناطہ وغیرہ میں اس کا رواج پایا جاتا تھا، جیسا کہ صاحب نفع العلیب المقریزی اور ابن عساکر کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ قاہرہ کی سڑکوں پر متعدد اس قسم کے حوض تھے جنہیں حکومت یا افراد قوم طیار کرتے تھے۔

سڑکوں کی روشنی، صفائی، چھڑکاؤ اور کتوں کی ہلاکت وغیرہ | میونسپلٹی کا نظام بھی عہد جدید کی برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن اہل عرب میں بھی ایک نظام اجتماعی ایسا تھا جتنا جو شہر کی حفظان صحت اور آبادی کی سہولت کا لحاظ سے قائم کیا گیا تھا، مثلاً ادارہ کتوں کا ہلاک کرنا جیسا آج کل پایا جاتا ہے، اس وقت بھی رائج تھا۔ چنانچہ حجاج کا واسطہ اور اس کے قرب و جوار سے کتوں کو زہر دلو کر دفع کر دینا مشہور واقعہ ہے، یہی عمل تمام امصار و ولایات کے امراء کا تھا کہ جب ادارہ کتے بڑھ جاتے تو زہر دیکر انھیں ہلاک کر دیتے۔

آگ بجھانا، شہر میں روشنی کرنا، سڑکوں کو صاف رکھنا، پانی چھڑکنا اور راست کو آبادی کی حفاظت کرنا، اُس وقت بھی رائج تھا اور ان امور کے متعلق مخصوص قواعد وضع کئے گئے تھے جن کی پابندی ہر شخص پر فرض تھی۔ مثلاً ہر دوکاندار کا فرض تھا کہ ہر دوکان کے قریب پانی کا ایک بڑا ٹنکہ ہر وقت لبریز رکھے تاکہ اگر آگ لگ جائے تو آسانی سے بجھائی جاسکے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اپنی دوکان کے سامنے ایک قندیل معلق کرے اور شام سے صبح تک اسے روشن رکھے، اسی طرح ایک جماعت ملازموں کی تھی جو سڑکوں کو ہر وقت صاف رکھتی اور روزانہ پانی چھڑکتی۔ ایک جماعت حکومت کی طرف سے ایسی بھی مقرر تھی جو رات کو بازاروں اور سڑکوں کا گشت کیا کرتی تاکہ دوکانیں محفوظ رہیں۔

خلفاء فاطمیوں میں سے العزیز باللہ اور الحاکم بامر اللہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف بہت اکتنا کیا، ان کے زمانہ میں تمام شہروں کے اندر روزانہ چھڑکائی ہوا کرتی تھی اور ہر وقت خرید و فروخت کا ہنگامہ قائم رہتا تھا۔ (المقریزی جلد صفحہ ۱۰۷ و ۱۰۸)

بلند اور وسیع عمارتیں اور بازار کا ازدحام | اہل عرب کی تمدنی ترقی کے دور میں دیگر امور کے ساتھ عمارتوں کی طرف بھی بہت توجہ کی گئی۔ چنانچہ اُس وقت بعض عمارتیں سات سات منزل کی ہوا کرتی تھیں جن میں

دو سو آدمی رہ سکتے تھے (المخطوط، جلد ۱ صفحہ ۳۳)

بازار کی رونق اور دہان کے ازدحام کا یہ حال تھا کہ اب سے تقریباً ۶۰۰ سال قبل جب قاضی القضاہ عماد الدین احمد قاہرہ میں داخل ہوا تو دیکھ کر شہر ہو گیا اور اس کے بیٹے محمد الدین محمد نے کسی سے پوچھا کہ کیا کوئی بارات ہے یا بڑے آدمی کے جنازہ جو آدمیوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا لیکن جواب دینے والے نے کہا کہ ”نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ یہاں ہر وقت یہی حال رہتا ہے۔“

المقریزی لکھتا ہے کہ ”مجھے اول مرتبہ ہجوم کے ساتھ چلنے میں بڑی زحمت ہوئی۔ لیکن دریافت کرنے
 پر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنے بائیں جانب ہسٹ کر چلنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا اور کبھی
 زحمت نہیں اٹھائی۔ لیکن بین القصرین پر مجھے ضرور رک جانا پڑا تھا کیونکہ وہاں آنے والوں لوگوں کی قطاروں کا یہ عالم ہوتا تھا جیسے
 کوئی سیل ہے کہ آج رہا ہے۔“ پھر ہجوم دازدھام کی یہ حالت صرف قاہرہ میں نہ تھی، بلکہ بغداد، دمشق، غرناطہ وغیرہ ہر جگہ یہی عالم تھا، اور
 ان میں سے ہر ایک اُس وقت کا نیویارک، لندن، اور پیرس بنا ہوا تھا۔

وسیع میدان تمدن جدید اس امر پر بڑا ناز کرتا ہے کہ اس نے آباد شہروں کے اندر جا بجا میدان (Park)
 بنا کر تفریح اور کھلی ہوئی ہوا کا بھی انتظام کیا ہے، لیکن آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ عہد اسلام میں اس کا بھی
 پورا اہتمام تھا اس وقت قاہرہ میں جہاں بین القصرین کی سڑک ہے، دولت فاطمیہ کے زمانہ میں یہاں بڑا وسیع میدان تھا جس میں دس ہزار سپاہ
 کھڑی ہو سکتی تھی اور دولت یوپی کے عہد میں یہ ایک بڑا بازار بن گیا تھا جہاں ضرورت کی تمام چیزیں ملتی تھیں اور حد درجہ ذوق نظر کا سامان فراہم رہتا تھا۔
 اسی طرح تمام بڑے شہروں میں آبادی کے اندر جا بجا وسیع میدان تھے جہاں لوگ جمع ہوتے تھے اور مختلف تفریحوں میں مشغول
 رہتے تھے۔ (المخطوط جلد ۲ صفحہ ۲۳-۲۹)

کلبوں اور سوسائٹیوں کا قیام کلبوں سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ کے ہم مذاق افراد جمع ہوتے ہیں اور باہم
 تبادلہ خیالات کرتے ہیں رسائل و جرائد کے مطالعہ میں مصروف ہوتے ہیں اور مشاغل تفریح
 میں شرکت کرتے ہیں، عہد حاضر میں مختلف اغراض و مقاصد کے کلب کثرت سے قائم ہیں، یہاں تک کہ کنواروں کا کلب، شراب و تمباکو سے
 احتراز کرنے والوں کا کلب بھی علیحدہ ہے، جاپان میں نکاح طلب لڑکیوں کا ایک کلب ہے جس کے ذریعہ سے ہر ہفتہ دو سوشادیاں ہوتی
 ہیں۔ بظاہر اس نوع کے کلبوں اور سوسائٹیوں کا قیام بھی عہد حاضر کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تاریخ اسلام کے مطالعہ کرنے والوں
 سے پوشیدہ نہیں کہ اہل عرب میں اس سے بہت پہلے اس نوع کے مجامع قائم تھے اور مختلف اغراض و مقاصد کے لئے مختلف کلب بنائے
 بھی برپا کر رکھے تھے۔

ادب، سیاست، ریاضی اور فنون لطیفہ میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کلب قائم تھے جہاں ترقی علوم و فنون کے متعلق
 تبادلہ خیالات ہوتا تھا، مجالس ادب و موسیقی تو اہل عرب کے ہاں بہت قدیم چیز ہے اور ایام جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھیں سیاسی کلب کا
 نام ان کے ہاں دار الندوہ تھا، جہاں سیاسی و اجتماعی حالات پر بحث کرنے کے لئے اشراۃ قریش جمع ہوتے تھے۔

صدر اسلام میں ایسے کلبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ خود مکہ میں ایک کلب موسیقی کا تھا جہاں ماہرین فن جمع ہوتے تھے اور اس فن
 کے متعلق بحث کیا کرتے تھے، ابو الفرج الاصفہانی ابن سریع مغنی اور الغریض کے باہمی مباحثوں کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

”وكانت بعض اطراف مكة داراً يتياها في كل جمعة ويحتملها بها ناس كثير فيوضع لكل واحد منها كرسي يحل عليه ثم
 يتناقضون الغناء“ (الانفا في بلد صفحہ ۱۰۸) — (یعنی بعض اطراف مکہ میں ایک مکان تھا جہاں ہر جمعہ کو لوگ جمع ہوتے تھے

ابن سیرین معنی اور الفرائض کے لئے کرسیاں بچھا دی جاتیں اور دونوں فن موسیقی میں مقابلہ اور بحث کرتے (ابو ولعب، مطالعہ و تفریح کے لئے بھی ایک جگہ مقرر تھی، جہاں شطرنج اور نرد وغیرہ کے ساتھ مختلف علوم و فنون کی کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ صاحب آغانی لکھتا ہے:-

”کان عبدالحکم بن عمرو بن عبد اللہ بن صفوان الجہلی قد اتخذ بیتاً فجعل فیہ شطرنجات و نردات و قرقات و دفاتر فیہا من کل علم و جعل فی الدار اوتاداً فمن جاور علق ثیابہ علی و تد منہا ثم جر ذتراً فخرأه و بعض ما یلعب بہ فلعب بہ مع بعضہم۔“ (یعنی عبدالحکم نے ایک گھر لیکر اس میں شطرنج، نرد اور مختلف علوم کی کتابوں کا انتظام کیا تھا ہر کمرہ میں کھوٹیاں نصب کی گئی تھیں، جو آنا تھا اپنے کپڑے اتار کر کھوٹی پر لٹکا دیتا تھا اور پھر ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق کتب بینی یا ہولعب میں مشغول ہو جاتا تھا)۔ (آغانی جلد ۴ - صفحہ ۲۵)

اسی سلسلہ میں اخوان الصفا، مجلس الوزراء المہلبی اور مجلس الوزراء بن فرات بھی قابل ذکر ہیں، مجلس وزراء مہلبی میں قاضی تنوخی وغیرہ ایسے معمر اور سفید ریش کے بزرگ ہفتہ میں دو مرتبہ اور وہ بھی رات کو جمع ہوا کرتے تھے۔ مجلس اخوان الصفا کے علمی کارناموں سے دنیا واقف ہے، تمام مجالس میں، چار قبوہ اور نیند کا دور چلتا تھا۔ فیض الطیب، آغانی، عقد الفرید، تیمۃ الدہر میں کثرت سے ایسی مجالس کا ذکر موجود ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے:-
عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر
کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش سلوکی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے
مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے:-

ڈائریکٹر مارشس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں

قبل عہد اسلام ایام جاہلیت میں موسیقی عربستان کے تمام بڑے بڑے مقامات میں رائج تھی۔ مکہ، یثرب، طائف، خیبر، وادی القریٰ دومہ، الجندل، مسقط، عدن، حضرموت، حیرہ، انبار، ابواز، دمشق، بعلبک اور بصرہ وغیرہ میں ہر جگہ مختلف لحن و لہجہ کے ساتھ گانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ظہور اسلام ہوا تو لوگوں کا ذوق موسیقی کی طرف سے ہٹ کر قرآن مجید کی طرف منتقل ہو گیا اور بچائے شعر و غنا کے اصلاح اجتماعی اور فتوحات ملکی کی طرف مایل ہو گیا، رسول اللہ کے سامنے جب شعر و شاعری کا ذکر آتا تھا یا کوئی شاعر اپنا کلام سناتا تھا تو آپ اس کے جواب میں صرف قرآن پاک کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ طفیل بن عمرو السدوسی (مشہور شاعر جب رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں مرد شاعر ہوں جو کچھ سنا کہتا ہوں پہلے اسے سن لو۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اس نے چند شعر عربی کے پڑھے۔ رسول اللہ نے سن کر سورہ اخلاص پڑھی اور آخر کار یہ مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح جب خلیفہ ثانی نے کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کی طرف اپنے عامل کو بھیجا اس نے کہا کہ تمہارے شہر کے شعراء نے اسلام کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے سناؤ۔ پس مغیرہ نے اصحاب تعلقات میں سے کسی کو عبید العامری کے پاس بھیجا جو اس وقت کوفہ میں موجود تھا۔ اس سے کہا گیا کہ اسلام کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سناؤ۔ یہ سن کر عبید نے سورہ بقرہ پیش کر دی اور کہا کہ اسلام نے شعر و شاعری کی جگہ ہم کو یہ چیز دی ہے۔ بے بدبلا مشہور شاعر عہد جاہلیت کا تھا لیکن اسلام لانے کے بعد اس نے شاعری ترک کر دی تھی اور سوائے ایک شعر کے دوسرا شعر نہیں کہا۔

۱۔ وہ اشعار یہ ہیں :-

ادوالہ الناسم عالم حریم	دلو حار یقنا مسہب و بنوہم
ولما یکن یوم نزول نجومہ	نظیر بہ الرکبان ذود نیار ضخم
اسلم علی خست و لست بخالد	ومالی من ورق اذا جاء فی حتمی
فلا سلم حتی تحضر الناس خیفتمہ	ویصبح طیر کائنات علی لحمی

۲۔ وہ شعر یہ :-

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجل	حتی اکتسیت من الاسلام سرالا
---------------------------	-----------------------------

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ رسول اللہ کو موسیقی سے نفرت تھی یا غناء کو آپ نے حرام کر دیا تھا کیونکہ ولیمہ عرس کے موقعہ پر خود آپ نے عورتوں کو گاتے ہوئے سنا اور منع نہیں فرمایا۔

اسی طرح آپ مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو انصار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں دق بجا کر گانا گایا اور آپ نے اسے سنا۔ رسول اللہ اچھی آواز کو بہت پسند فرماتے تھے اور بلال حبشی کو اذان کی خدمت پر مامور کرنا محض اُنکے حسن آواز کی وجہ سے تھا۔ آپ بلال سے اکثر قرآن سنا کرتے تھے اور آپ کو بہت لطف آتا تھا۔

خود فن قرأت و تجوید کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ لحن کے مختلف طریقوں اور تال کے منظم وقفوں سے پیدا ہوا ہے اور اس فن کی اصطلاحیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک مد کو لیجئے کہ فن تجوید میں اس کی چار قسمیں کر دی گئی ہیں طبعی، متصل، منفصل۔ لازم اور یتیمیں حقیقتاً موسیقی کے گٹھاؤں بڑھاؤ ہیں جن کا علمدہ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات ادغام، اظہار، اخفاء، انقلاب، غنہ، حروف ہمیں و جہر، استفالہ و ترقیق، تخفیم و رخو، شدت و توریہ، صغیر و اطباق، انفتاح و اذلاق، قلقلہ و وقف و غیرہ کو دیکھئے کہ فی الحقیقت ان سب کا تعلق لحن و موسیقی سے ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ فن لہو و لعب میں نہ داخل ہو جائے موسیقی سے علمدہ اس کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

خود قرآن کو بھی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے اور ترتیل کی تفسیر میں امام نیشاپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخصوص وقفوں کے خوش الحانی سے الفاظ کو ادا کرنا بھی ترتیل ہے۔ بہر حال جس حد تک نفس خوش الحانی و حسن صورت کا تعلق ہے اسلام نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ بعض حالات میں رسول اللہ نے غناء کی طرف ترغیب بھی دلائی ہے۔ چنانچہ ایک بار انصار میں سے کسی کی لڑکی شادی ہوئی تو رسول اللہ نے جناب عائشہ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اسے رخصت کر دیا، جواب دیا، ہاں، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی گانے والا بھی تھا۔ آپ بولیں نہیں، رسول اللہ نے فرمایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے، کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو کہتا:۔

اتینا کم اتینا کم نجیونا نجیکم
ولولا الحبۃ السمر لم نخلل بوا دیکم

ایک بار رسول اللہ ایک کنیز کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ گارہی تھی،

بل علی و یحکمون ان لہوت من حرج

لہ گیت یہ تھا۔

طلع البدر علینا من ثنایات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا اللہ داع

ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

تو آپ نے یہ سکر فرمایا: ”لا حرج انشاء اللہ“
ایک مرتبہ رسول اللہ نے رات کے وقت بلال کو یہ اشعار گاتے سنا اور پسند فرمایا۔

الایت شعری بل امین لیلۃ بکۃ حولی اذ خرو جلیل

دل اردن یوما میاہ مجنۃ دل میدون لی شامۃ و طفیل

حضرت عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ سفر میں ہیں۔ چونکہ منزل طویل تھی اس لئے رسول اللہ نے چاہا کہ اونٹ کو تیز چلایا جائے اور عبداللہ بن رواحہ سے کہا کہ اگر اونٹ ”حادی خوانی“ سے تیز چل سکتا ہو تو شروع کرو۔ وہ فرط حیا سے خاموش رہے، لیکن حضرت عمر نے کہا کہ تم رسول اللہ کا کہنا نہیں مانتے اس پر عبداللہ نے یہ شعر گانے شروع کئے:-

واللہ لولا اللہ ما اہتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

الکافرون قد بغوا علینا اذا ارادو فتنۃ انبیاء

و نحن عن فضلک ما استغینا فثبت الاقدام ان لا قینا

وانزل من سکنۃ علینا

ایک بار کسی اعرابی نے نذر مانی کہ اگر رسول اللہ غزوہ سے صحیح و سلامت واپس آجائیں گے تو میں دین پر گانا گاؤں گی، چنانچہ آپ تشریف لائے تو آپ نے اس کو حضوری کی اجازت دی اور اس کا گانا سنا۔

اسلم، حضرت عمر کا غلام تھا اس سے روایت ہے کہ ”ایک بار میں اور عاصم دونوں گارہے تھے کہ حضرت عمر اس طرف سے گزرے اور ٹھہر کر سننے لگے۔ جب گانا ختم ہوا تو فرمایا کہ پھر گادو، چنانچہ ہم نے پھر اعادہ کیا اور پوچھا: ”اے امیر المؤمنین ہم میں سے کون بہتر گاتا ہے“ جواب دیا کہ تم دونوں گدھے ہو، پوچھا کہ ہم میں کون گدھا برتر ہے۔ آپ نے فرمایا ”یہ بھی وہ بھی“ میں نے کہا کہ ”میں ان گدھوں میں غالباً اول گدھا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا درجہ دوسرا ہے“ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے نقاد بھی تھے اور بُرا گانے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سعد بن وقاص صحابی کا ایک غلام ”قند“ تھا جو نہایت اچھا گانے والا تھا۔ اور جناب عائشہ محض گانے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار سعد بن وقاص نے اسے مارا تو آپ خفا ہو گئیں اور کہا کہ جب تک سعد بن وقاص قند کو راضی نہ کر لیں گے میں ان سے بولوں گی نہیں۔ چنانچہ سعد بن وقاص نے اس کو راضی کیا اور اس کے بعد آپ ان سے ہم کلام ہوئیں۔ ان غرض جس حد تک گانے کا تعلق ہے موسیقی و غناء اسلام میں حرام نہیں ہے بعض نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس آیت کو استدلالاً پیش کیا ہے:-

”ومن الناس من یشتري بواحدین لیسل عن سبیل اللہ فیرحمہم ویتصدقہم ویزودہم لعلہم یمضوا بہم عذاب اللہ“

کیونکہ ان کے نزدیک غناء بواحدین میں داخل ہے، حالانکہ یہ آیت انصاری حارث کے حق میں نازل ہوئی تھی جو فارس سے

قدیم سیر و تاریخ کی کتابیں لاکر ترجمہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قرآن سے بہتر ہیں۔ گانے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابتداء عہد اسلام میں چونکہ صرف اجتماعی و اخلاقی اصلاح پیش نظر تھی اس لئے اس فن کی ترقی کا کوئی موقع نہ تھا۔ فنون لطیفہ از خود ایک قوم کی تمدنی ترقی کے ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی حالت میں کسی ملک یا قوم کا ان کی طرف متوجہ ہونا کبھی فنی لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتا۔ خود تاریخ اسلام کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب رسول اللہ کے بعد فتوحات وسیع ہونے لگیں اور تمدنی ترقی کے آثار پیدا ہونے لگے تو ساتھ ہی ساتھ موسیقی کو بھی ترقی ہوئی۔

عہد بنی امیہ میں عود، طنبورہ اور دف کے ساتھ قصائد و اشعار گانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور عہد بنی عباس میں تو موسیقی نے ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نئی نئی راگنیاں ایجاد ہو رہی تھیں، گانے کے مختلف طریقے سوچے جا رہے تھے اور ماہرین کی ایک جماعت مستقلاً اسی فن کی خدمت کر رہی تھی، چنانچہ یونس، احمد ابن المکی، عمرو بن باز، بذل المنذیہ، اسحاق موصلی، اس عہد کے خاص ماہرین موسیقی تھے اور مؤلفین میں جو شہرت یعقوب بن اسحاق الکندی، ابو نصر فارابی اور ابو علی بن سینا کو حاصل تھی وہ بھی ارباب تاریخ سے مخفی نہیں۔

حضرت نیاز فچپوری کی ایک مثل تصنیف

”من ویزداں“

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزہ ادب کی حیثیت

رکھتی ہے اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اسے صحیح معنی میں

انجیل انسانیت کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر سیدہ تاریخی، علمی،

نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے

یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی ادبیٹر نگار کا وہ کارنامہ ہے جسے ادب و انشاء میں ”حرف آخر“ کہا جاسکتا ہے،

جسم ۶۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز، جلد مضبوط۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنہ

مینجر نگار لکھنؤ

فنِ رقص اور تاریخِ اسلام

”یہاں سے چلے جاؤ، اگر تم ہم آہنگی (Harmony) سے نا آشنا ہو“

(افلاطون)

تمہید اس وقت دنیا میں جتنے فنونِ رائج ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا سراغ عہدِ قدیم تک نہ پہنچتا ہو، فرق یہ ہے کہ بعض فنون کی موجودہ ترقی یافتہ صورت اس قدر بدل گئی ہے کہ درمیان کی ارتقائی کڑیوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے انکا سلسلہ عہدِ قدیم ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اور بعض میں ایسا زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے اور ہم آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ اسلافِ قدیم کی یادگار ہے۔

موسیقی و رقص، اور تعمیر و نقاشی ان ہی فنون میں سے ہیں جن کا عہدِ قدیم سے واسطہ بواسطہ ہم تک منتقل ہو کر آنا نہایت روشن طور پر واضح ہے اور اس کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔

موسیقی و رقص میں: اعتبار زمانہ کس کو تفوق حاصل ہے، یہ بتانا مشکل ہے، لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رقص کی بنیاد موسیقی سے پہلے قائم ہوئی ہوگی، کیونکہ انسانی اعضا میں اس وقت بھی حرکت پائی جاتی تھی جب اس نے کوئی زبان ایجاد نہ کی تھی اور رقص نام ہو صرف اعضا، انسانی کی حرکت کا۔

رقص کی تاریخی میت قدیم ترین اقوام میں رقص کے رواج کا سبب کیا ہوا، اس کی تحقیق مشکل ہے لیکن بظاہر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق صرف تفریح سے تھا اور دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا بھی اُن کے خوش کرنے کے لئے تھا، لیکن بعد کو جب عظمت و احترام کے حقیقی مفہوم سے انسان آشنا ہوا تو وہ رقص جو دیوتاؤں کے سامنے بھی محض تفریح کے لئے کیا جاتا تھا اس میں ایک دینی اہمیت پیدا ہو گئی اور تفریح کا خیال محو ہو کر عبادت کا جذبہ اس سے متعلق ہو گیا جس نے رقص کی دو قسمیں (دینی و دنیاوی) علاحدہ علاحدہ کر دیں۔ اہم قدیمہ میں ہنوا اسرائیل رقص میں بہت مشہور تھے جس کا سبب غالباً حمایتِ دینی تھا۔

یہ ہیکل اور شہیم میں عبادت کے وقت رقص کے عادی تھے جیسا کہ کتب مقدس سے ثابت ہوتا ہے خود داؤد نبی کا رقص کرنا اور اور لوگوں کو رقص کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کرنے کی ہدایت کرنا بھی ان ہی مقدس کتابوں سے پایا جاتا ہے۔

یونانیوں کے یہاں رقص کی دو قسمیں تھیں ایک دنیوی جو اُن کے گھر کی محفلوں میں رائج تھا اور دوسرا دینی جو جیو پیٹر کے مندروں میں کیا جاتا تھا۔ منرو دیوتا کے سامنے جو رقص ہوا کرتا تھا وہ مسلح ہوا کرتا تھا اور یہی بنیاد رقصِ عسکری کی تھی۔ زہرہ اور بانو خس

در شراب کا دیوتا کے مندروں میں جو رقص ہوتا تھا اس کی شان دوسری تھی۔ اسپارٹا میں جو ایک اور قسم کا رقص رائج تھا جو کتورہ لکس کی ایجاد تھی۔ نالیکر غوس نے جو رقص ایجاد کیا تھا اس میں جوان مرد اور جوان عورتیں سب شریک ہوتی تھیں، یہ رقص دینی و اخلاقی فرائش میں شامل تھا اور قضاۃ و حکام بھی اس کی مشق کیا کرتے تھے۔

ایتھنس اور اسپارٹا کے لشکر جب میدان جنگ میں جاتے تھے تو جنگ و رہا باب پر رقص کرتے تھے اور یہ رقص اس قدر معزز سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے ایلاتون (رقص عسکری کے موجد) کا مجسمہ قائم کیا تھا۔ اعیاد و یلوں کے موقع پر اور قربانگاہ ایلون کے گرد غزایاں رقص کیا جاتا تھا۔

روما میں بھی رقص کی دو قسمیں تھیں حربی و دینی، حربی رقص کا موجد روملوٹس تھا اور رقص دینی میں وہ رقص بہت مشہور تھا جسے بت مریم کے پوجاریوں نے ایجاد کیا تھا، چنانچہ قدیم عیسوی کلیساؤں میں اس رقص کا رواج کثرت سے تھا اور رومن کیتھولک ممالک میں اب بھی رائج ہے۔

ملکت ایتھنز کے آثار سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دینی رقص اُن کے ہاں پایا جاتا تھا اور ساز کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ رہا ہندوستان سو یہ شعر و موسیقی کا ملک ہی تھا اور یہاں پرستش کا مفہوم ہی صرف رقص و موسیقی قرار دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے قدیم روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کا موجد ہرہا اور اس کی بیوی کُرتسی نے ساز ایجاد کیا تھا۔ اس کے علاوہ گندھارپ وغیرہ دیوتاؤں کا گانا بجانا اور دعوتوں میں رقص کرنا بھی ان کے مذہبی سرچشمے سے ثابت ہے۔

ہندوستان کے قدیم موسیقی دان، شاعر بھی ہوا کرتے تھے اور رقاص بھی کیونکہ آواز، ساز اور حرکت جسم کا ہم آہنگ ہونا مذہبی مراسم کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں موسیقی کے سات جتنے کئے ہیں جن میں چوتھا نمبر رقص کا ہے۔ الغرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں رقص کا رواج ازمنہ قدیم میں نہ رہا ہو اور جس کی یادگار اب بھی وحشی اور تمدن اقوام میں نہ پائی جاتی ہو۔ حبشیوں کا حلقہ بنا کر رقص کرنا، ہندوستان کے گوڈوں کا دو دو ملکر ناچنا، متال عورتوں کا دائرہ بنا کر رقص کرنا، اسی طرح تمام دیگر ممالک کے وحشی باشندوں میں رقص کا پایا جاتا ہے کہ یہ عادت موجودہ انسان کو اس کے اسلاف سے ملی ہے اور کبھی اس کو معیوب قرار نہیں دیا گیا اس وقت دنیا میں ایک مسلمانوں ہی کی قوم ایسی ہے جو رقص کو معیوب سمجھتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اس خیال میں مسلمان مذہبی قیود سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے اس فن جمیل کے محاسن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

عبدالفتاح عبادہ نے عربی میں ایک دلچسپ مضمون ”فن رقص اور عہد اسلام“ کے موضوع پر لکھا ہے اور بہت محنت سے اس نے عرب و اسلام کی تاریخی و مذہبی روشنی میں اس پر غور کیا ہے، اس لئے ہم یہاں اس کا مختصر درج کرتے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے پہلے مصریوں کے فن رقص سے بحث کی ہے کہ اُن کے ہاں یہ کس قدر رائج تھا اور انھوں نے اس میں کس قدر ترقی کی اس کے بعد اس نے عربوں کے رقص کو لیا ہے اور پھر عہد اسلام میں اس کی کس قدر ترقی ہوئی اس کا ذکر کر کے مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ ختم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ا۔

رقص عرب جاہلیت میں دوسری قدیم قوموں کی طرح عرب جاہلیت میں بھی رقص کا رواج پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ بعض علماء نے اس کو ترجیح دی ہے کہ کعبہ کا طواف جو زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا وہ بھی ایک قسم کا رقص تھا۔

آیت - ”وما کان صلواتہم عند البیت الا مکاتاً و تصدیقاً“ کی تفسیر میں زرخشری اور بیضاوی لکھتے ہیں کہ ”عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہوئے برہنہ طواف کرتے تھے، ان کے علاوہ اور مفسرین نے اس سے بھی زیادہ لکھا ہے، جو آپ کو مختلف تفاسیر میں ملے گا اور یہ عربوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ تمام قدیم قومیں اپنے معابد و مہیا کل میں رقص کیا کرتی تھیں، ہیا کل منف، طیبہ، ہلبوبلیس، ہیا کل اور شلیم، نیپور، بابل اور معابد بعل، عشتاروت، زردشت، جوہر، زہرہ (Sumer) وغیرہ رقص کا مرکز تھے، توریت میں آیا ہے کہ یہودی رقص کے ذریعہ سے عبادت کیا کرتے تھے، غرض اس میں شک نہیں کہ ”مذہبی رقص“ قدیم قوموں کا نہایت ترقی یافتہ اور مقدس رقص تھا۔

تمام قوموں میں رقص کا وجود ایک ہی اسلوب پر ہوا ہے، یعنی رقص بطور ریاضت جسمانی اور مرد عورت اس میں برابر حصہ لیتے تھے، بدوی اقوام جو اپنی فطرت اولیٰ پر باقی تھیں وہ سب رقص تھیں، مثلاً عرب ایام جاہلیت اور بدویت میں رقص کرتے تھے، مرد حلقہ رقص میں کھڑا ہو کر، اچھلتا تھا، کودتا تھا، تلوار سے کھیلتا تھا اور ایسی حرکات کرتا تھا، جو اس کی شجاعت اور شدت قوت پر دلالت کرتی تھیں، اسی طرح عورت اسی حلقہ میں کھڑی ہو کر اپنی حرکات رقص سے اپنے اعضاء کی رعنائی، جسم کی شادابی، قامت کا اعتدال، انکسار و توجہ جسمانی لوچ کا حسن مردوں پر ظاہر کرتی تھی۔

عرب ایام جاہلیت میں اپنے تیوہاروں اور رُبت پرستی کے مراسم میں دوسری قوموں کی طرح رقص کیا کرتے تھے اور شاید جاہلیت کا طواف کعبہ اُن مذہبی مراسم میں سب سے مقدم تھا، جن میں رقص کیا جاتا تھا، تاریخ سے ثابت ہے کہ رقص اُن قوموں کے نزدیک دینی مراسم میں شامل تھا، بلکہ بعض کے مذہبی فرائض اور عبادت میں داخل تھا، ان اقوام کے نظام زندگی پر غور کرنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رقص ان کے ہاں حربی مظاہر میں داخل تھا اور حالت جنگ میں جذبات حماس کو برانگیختہ کرنے کے لئے اسی طرح کیا جاتا تھا جس طرح معابد و مہیا کل میں جذبات عبودیت کے اظہار کے لئے مستعمل تھا۔ جاہلیت کے شہسواروں کے جو قصے منقول ہیں، اور ان کے اشعار جو لڑائیوں کے وقت گائے جاتے تھے، اس حقیقت کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔

عرب ایام جاہلیت اور عہد اسلام میں اشعار پر رقص کرتے تھے، اور سب سے پہلا لُحْن جو خاص طور پر اسکے لئے بنایا گیا تھا ”لُحْن خفیف تھا“ مرد اور عورت دف اور مزامیر کے ساتھ چلتے تھے، اور نعمات شعری سے پر نشاط ہو کر ابن خلدون کی رائے کے مطابق رقص کرتے لگتے تھے، اسکے بعد رقص کی مناسبت سے خاص قسم کے لُحْن اور بحروں کا اضافہ ہوا جن میں ہرج، رمل اور خفیف الرمل داخل ہیں۔ الغرض رقص عربوں کے ہاں ایام جاہلیت اور اسلام دونوں میں پایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی دور میں جو رقص ہوتا تھا وہ بہ اقصائے

۱۔ کشف جلد ۱ صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ جلاق ۱۳۸۱ء۔ بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۵۵ء۔ ۲۔ تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱ صفحہ ۳۹۹

مطبوعہ طبعہ شریفہ ۱۳۵۵ء۔ ۳۔ دائرة المعارف مادہ رقص۔

ترقی و تمدن زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ تھا۔

اس سے پہلے کہ ہم عہد اسلام کے رقص پر تاریخی روشنی ڈالیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق مذہبی رقص اور مذہب نقطہ نظر سے بحث کی جائے۔ اور دیکھا جائے کہ اسلام کا مذہب اسکے متعلق کیا حکم دیتا ہے۔

جب ہم اسلامی احکام پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو کوئی ایسا حکم نہیں ملتا جو رقص کی حرمت پر دلالت کرے، سوائے اُس صورت کے جبکہ رقص معیوب، خلاف ادب اور بھی خواہشوں کو برا نگینہ کرنے والا ہو۔ ابن حجر اور ان کے علاوہ دوسرے جلیل القدر مسلمان علماء نے تصریح کی ہے، کہ رقص اس صورت میں حرام ہے جبکہ اس میں لچک اور مشک پائی جائے۔ اس لئے کہ لچک اور مشک اس فعل کو خواہش سے ملا دیتی ہیں۔ لیکن مطلق رقص حرام نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث میں وارد ہے کہ حبشیوں نے رسول اللہ کی مسجد میں آنحضرت کے سامنے رقص کیا ہے، اور آنحضرت نے بڑی دیر تک کھڑے ہو کر اس رقص کو دیکھا اور حضرت عائشہ کو دکھایا۔

علماء اور فقہاء کے اقوال بالاتفاق اس حکم کو ثابت کرتے ہیں۔ امام نووی منہاج میں لکھتے ہیں کہ رقص مباح ہے بشرطیکہ اُس میں لچک اور مشک نہ ہو، امام الحرمین کہتے ہیں کہ رقص حرام نہیں، کیونکہ وہ چند سیدھی اور ٹیڑھی حرکتوں سے عبارت ہے البتہ اسکی کثرت تہذیب کے منافی ہے، اسی طرح صاحب لعمدہ نے جو شوافع میں سے ہیں، کہا ہے کہ اصل رقص مباح ہے، العاد سہروردی لافنی اور حلبی نے اپنی کتاب منہاج میں رقص کو مباح لکھا ہے بشرطیکہ اُس میں مشک نہ ہو لیکن شیخ الاسلام عزالدین عبدالسلام نے تو رقص کو علی الاطلاق جائز قرار دیا ہے، اور وہ خود بھی رقص کرتے تھے۔ اسی طرح امام سیوطی، سراج الدین بلقینی، عبد الوہاب شعرائی وغیرہ علماء نے لکھا ہے کہ امام غزالی نے اس کے جواز پر یقین کر لیا ہے لکھا ہے کہ رقص سرور و نشاط کی تحریک کا سبب ہے، اور سرور و مباح ہے لہذا اس کی تحریک بھی جائز ہے اور اگر وہ حرام ہوتا تو عائشہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشیوں کا رقص نہ دیکھتیں۔

صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ جب وہ سرور ہوئے ہیں تو انہوں نے رقص کیا ہے جس کا سبب ان کی مسرت تھی اور یہ حضرت حمزہ کی بیٹی کے قصہ میں وارد ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا تم حبش کے رقص کو دیکھنا چاہتی ہو۔ اور بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ عید کا دن تھا اور اہل سودان ڈھال اور چھوٹے نیزوں کے ساتھ رقص کرتے تھے تو آنحضرت نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اسے دیکھنا نہیں چاہتیں، میں نے کہا ہاں چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا میرا رخسار آپ کے رخسار پر تھا اور آپ نے فرمایا کہ ”شروع کرو اسے بنی ارفدہ“ یہاں تک کہ جب میں تھک گئی، تو آپ نے فرمایا کہ کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، آپ نے فرمایا اچھا اب جاؤ۔

امام غزالی کہتے ہیں کہ یہ تمام احادیث صحیحین میں وارد ہیں، اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ غنا اور رقص حرام نہیں ہیں اولاً لہو کی اباحت دوسرے اس کا مسجد میں کیا جانا، تیسرے آنحضرت کا فرمانا کہ شروع کرو اسے بنی ارفدہ اور کھیل کا حکم دینا، چوتھے

دیر تک کھڑے رہ کر اسے دیکھنا اور سنتا، پانچویں آنحضرتؐ کا ابتدا میں حضرت عائشہؓ سے یہ فرمانا کہ کیا تم دیکھنے کی خواہش رکھتی ہو۔ اور یہ کوئی آنحضرتؐ کی فعل نہ تھا، یہ تمام قیاسات اور نصوص غنا اور تال وغیرہ کی اباحت اور جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

لہذا ہر ملک کے مسلمان علماء نے باوجود اختلاف مذاہب و حالات، بڑے اقسام رقص کے متعلق یہی کہا ہے، اور اسی خیال کی الترقی تھیائید کرتے ہیں جو غنا کے جواز کے قابل ہیں اور یہی حضرات صوفیا کا مذہب ہے لیکن فن رقص تشدد پسند اور دین میں سختی پیدا کرنے والے فقہاء کے حملوں سے محفوظ نہیں رہا، یہ فقہاء ہر ایسے شخص کو ساقط العدالت سمجھتے تھے، جو غنا سے اشتغال رکھتا ہو۔ اور جو شخص تصویر بناتا، یا کوئی مجسمہ طیار کرتا وہ ان کی نظر میں مشرک سمجھا جاتا تھا۔ لہذا اس مخالفت سے اس فن کو بھی وہی نقصان پہونچا جو دوسرے فنون جمیلہ کو پہونچا ہے۔ ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان علماء نے رقص کے جواز پر سنت اور قیاس سے دلائل پیش کئے ہیں سنت تو وہی حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے جو صحیحین میں مسجد کے اندر رقص عیش کے متعلق وارد ہے اور قیاس یہ کہ فرع اپنی اصل کے ساتھ علت حکم میں مساوی ہونا چاہئے لہذا یہاں بھی اصل فعل اہل عیش اور حضرت علیؓ اور ان کے شریک صحابہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ اسلام نے رقص کو حرام قرار نہیں دیا جب تک کہ اس میں مشک اور پک کی حرکتیں نہ پائی جائیں جو شہواتِ بہیمی کو برانگیختہ کرتی ہوں اور یہ اس ترقی یافتہ شریعت کا حکم ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور رفعت کی حمایت کرتی ہے اور یہی حمایت اقوام کے ناموس اور ادب کی حمایت کے لئے مطلوب ہے۔

مسئلہ رقص کے متعلق جو کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ ایک منصف مزاج طالب حق اور ایک کج و متعصب دونوں کے لئے کافی ہے اور ہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آگے یہ ثابت کریں گے کہ مسلمانوں نے رقص کے بارہ میں صرف اسی حد تک اظہار خیال نہیں کیا ہے بلکہ علمی حیثیت سے اس میں بہت کچھ رقص کیا ہے۔

مسلمانوں نے رقص کا شمار منجملہ علوم و فنون کیا ہے اور جس کو ہم ذیل چیز خیال کرتے ہیں۔ اُسے **رقص کی تاریخ اسلامی تمدن میں** ہمارے عرب اسلاف ایک بڑا فن سمجھتے تھے انھوں نے اس کو اظہار عواطف اور وجدانیات کا ذریعہ اور ہوشیاری اور کمال کا سبب قرار دیا تھا۔ انھوں نے رقص کو صرف کھیل اور دل بہلانے کی چیز تصور نہیں کیا، بلکہ اسکے متعلق لکھا ہے: ”رقص ایک علم ہے جو حرکات موزوں کی کیفیت سے بحث کرتا ہے اس حیثیت سے کہ وہ حرکات دیکھنے والے کی طبیعت میں نشاط و سرور پیدا کریں“ عربوں نے اس فن کے اقسام اور احکام کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

جو ممالک اسلامی حکومتوں کے زیر نگین تھے، ان کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے رقص پائے جاتے تھے، **عربوں کی اقسام رقص** اہل خراسان، فارس، مصر، مغرب اور اندلس سب کا طرز رقص ایک دوسرے سے مختلف تھا، بلکہ ایک حکومت میں جو رقص تھا وہ دوسری حکومت کے رقص سے اختلاف رکھتا تھا۔ دولت اموی اور عباسی میں جو رقص کی قسمیں اور شکلیں تھیں وہ حکومتوں کے اندلس، مغرب، فارس اور ترکوں سے علیحدہ تھیں، اسی طرح فاطمیین اور نمائیک کے عہد حکومت کے رقصوں میں اختلاف تھا۔ اسی طرح عورتوں اور مردوں کا رقص ایک دوسرے سے علیحدہ صورت رکھتا تھا۔ ان تمام حکومتوں کے اقسام رقص کو چھوڑ کر صرف سلطنت عباسیہ کے رقص کو لیتے ہیں جس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے، اور اس کا تمدن بھی بجا نظر اپنے اثرات اور وسعت کے بہت شاندار تھا۔

ہم ذیل میں ان تمام انواع رقص کا ذکر کرتے ہیں جو عباسیوں کے دور حکومت میں عروج پر پہنچی تھیں۔

اس عہد میں اقسام رقص آٹھ تھے، خفیف، ہزج، رمل، خفیف الرمل، ثقیل الثانی، خفیف الثانی، خفیف الثقیل الاول اور ثقیل الاول، لیکن افسوس ہے کہ اب ان اقسام رقص کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور انکی تفصیلات زمانہ ماضی کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو گئیں۔ عربوں نے فن رقص میں چند شرطیں مقرر کی تھیں، جن کی تکمیل ضروری تھی مثلاً خفت روح، حرکات رقص کو بہترین طریقہ پر ادا کرنا، رقص کی مختلف حرکات میں حرکت کی لطافت اور رعنائی کو شامل کرنا، گردن کا طول

کمر کی باریکی، جسم کی خوبصورتی۔ دامن کا گول ہونا۔ پیروں کی چمک، انگلیوں کی نرمی، اور ان کا ہر طریقہ سے مڑنے کے قابل ہونا۔ جوڑوں کی نرمی حالت رقص میں سرعت انتقال، خوش خرامی، کمر کی چمک، نظام تنفس کی درستی، دیر تک عمل رقص میں مشغول رہنے کی طاقت انواع رقص میں ایک حسین تصرف کرنا، اور ہر ایک جزئی حرکت کے احکام و قواعد کا لحاظ رکھنا، رقص میں گھوم جانے کی لطافت، قدموں کا اپنے مدار پر قائم رہنا، دائیں اور بائیں پیر کے عمل کا ایک ہی طریقہ پر برابر ہونا وغیرہ وغیرہ۔

عربوں کے رقص میں قدموں کے اٹھانے اور رکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قدم کا اوپر نیچے جانا اور آنا آہنگ موسیقی کے تھکا ساتھ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تال کے ساتھ قدم زمین پر جائے اور فانی پر اٹھ جائے یا بالکل برعکس۔ علامہ ابن خلدون نے اس تناسب کو اس طرح لکھا ہے کہ تناسب رقص کبھی بسیط ہوتا ہے اور اکثر لوگوں میں قطری طور پر پایا جاتا ہے، ان کو اس کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

رقاص جماعت کے آداب جس طرح ایک رقص فرد کے لئے خاص قواعد اور قوانین ہیں اسی طرح ایک رقص کرنے والی جماعت کو بعض اصول کا پابند ہونا پڑتا ہے اور نہایت سختی سے ان قواعد کا لحاظ کیا جاتا ہے، جیسا کہ آجکل اہل یورپ کی مجالس رقص میں اس قسم کے آداب کی رعایت ضروری خیال کی جاتی ہے، ان شرائط میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ رقص جماعت میں بد نظمی اور بے ترتیبی پیدا نہ ہو اور ان کی حرکات میں رقص کی نوعیت تبدیل نہ ہو جائے اور رقص جماعت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جو بمقابلہ دوسرے رقصین کے عہارت کم رکھتا ہو۔ یا اس میں سرعت انتقال کا وصف نہ پایا جائے۔ یا دیکھنے والے اس میں تصنع محسوس کریں۔ ان قواعد کی رعایت رقص صوفیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ غزالی اور نویری لکھتے ہیں کہ آداب رقص میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رقص کرنے والی جماعت کے ساتھ محفل رقص میں ایسا شخص شامل نہ ہو جس کے رقص میں ثقل پایا جائے اور اس کی وجہ سے رقص کے نظام میں بے ترتیبی پیدا ہو اس لئے کہ وہ رقص جس میں تکلف نہ پایا جائے مباح ہے اور جو شخص سچائی سے رقص کے لئے کھڑا ہو (یعنی اس کا جذبہ رقص سچا ہو) تو وہ حاضرین پر بھاری نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ ان کے قلوب صداقت اور تکلف کا صحیح معیار ہوں۔

تاریخ اسلام میں بہت سے مشہور رقصوں کے نام محفوظ ہیں، دولت عباسیہ کے زمانہ عروج میں کیش اور عبدالسلام مشہور رقص فن رقص میں بڑے کامل ماہر گزرے ہیں، صاحب آغانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں نہایت بالکمال رقص تھے

لیکن اسحاق موصلی جو عربی موسیقی میں زبردست ماہر گزرا ہے رقص میں ان دونوں پر سبقت لے گیا ہے، ابو الفرج اصفہانی اسحاق موصلی کے اس رقص کا تذکرہ کرتے ہوئے جو واقع بالمشد کے سامنے اُس نے کیا تھا لکھتا ہے، ”اسحاق کھڑا ہوا اور اس نے نہایت طرب انگیز رقص کیا“ اس کا رقص کبیش اور عبد السلام سے بھی بہتر تھا حالانکہ وہ دونوں نہایت اچھا رقص کرنے والے شمار کئے جاتے ہیں۔ اس پر واقع بالمشد نے کہا، ”اسحاق سے زیادہ کوئی اس فن میں کمال نہیں رکھتا۔“

مہر و اندلس میں تمدن اسلامی کے عہد عروج میں فن رقص میں بہت سے لوگوں نے کمال پیدا کیا تھا اس دور کے مشہور رقص جنتوں نے تمام اسلامی ممالک میں شہرت حاصل کی تھی ادوہ بادشاہوں کے حضور میں رقص کرتے تھے حیدر بن اعد بن ابراہیم ابو الحسن اندان کے بھائی ابراہیم تھے یہ دونوں ملک اشرف شاہ مہر کے دربار میں حاضر ہوئے اور رقص اور موسیقی کا کمال دکھایا۔ ابن جریر نے ”دررکامنه“ میں اس کا تذکرہ کیا ہے ان کے علاوہ مشہور رقص کرنے والوں میں جعفر رقص بھی تھا جس کا تذکرہ آئندہ ہوگا۔

حالت رقص میں پیروں کی حرکت کو مصعب ہندی نے ایک رقص کی تعریف میں کس خوبی سے بیان کیا ہے:

”عجبت من رجليں يتبان - يعلمها طوراً وتعلوانہ کان فحين يلسعاہ“ یعنی میں اس کے دونوں پاؤں دیکھ کر بہت متعجب ہوا جو اس کے بالکل قابو میں ہیں۔ کبھی وہ ان دونوں کو اٹھاتا ہے اور کبھی وہ دونوں اسے اٹھاتے ہیں۔ گویا کہ دو سانپ (پے در پے) اس کو کاٹ رہے ہیں۔“

ایک خوبصورت رقص کے وصف میں ابن خروف اندلسی کا قول بھی خوب ہے جس سے رقص کے متعلق اندلسی ذوق کا پتہ چلتا ہے

لاخلہ ہو:- ومنزع الحركات يلعب بالنهي
 پس المحاسن عند فليح لباس
 متاوداً كالنصن وسط رياضه
 متلاعباً كالنطبي عند كئاس
 بالعقل يلعب مقبلاً او مدبراً
 كالدير يلعب كيف شاء بتاس
 وضيم المقدمين منه راسه
 كالسيف ضم دبابه لرياسه
 اور سری رفا ایک رقص کے متعلق کہتا ہے:-

اپنے حرکات رقص میں تنوع پیدا کر کے دلوں کے ساتھ کھیلتا ہے
 جو لباس سے عریاں ہو کر سراپا حسن نظر آتا ہے
 وہ لچکتا ہے مثل اس شاخ کے جو باغ کے درمیان ہو
 اور اس طرح کھیلتا ہو جس طرح ہرن اپنے مستقر کے پاس کھیلتا ہے
 وہ پیچھے پھر کر اہم مقابل ہو کر لوگوں کی عقلوں سے اس طرح کھیلتا ہے
 جس طرح کہ زمانہ لوگوں سے جیسا وہ چاہے کھیلتا ہے، وہ
 اپنے دونوں پاؤں سے اپنے سر کو ملا دیتا ہے
 جس طرح تلوار دتے اور نوک سے دوہری ہو کر لمبائی ہے

جب اُس کی انگلیاں رقص کے لئے حرکت کرتی ہیں

اذا خلت اناطه لرقص

اگرچہ یہ آلات اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے تھے مگر اشبیلیہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ابن رشد کہتا ہے کہ جب کسی عالم کی وفات ہوتی تھی اور اسی کی کتابیں بھی جاتی تھیں تو انہیں قرطبہ بھیجا جاتا تھا اور اگر کوئی مطرب مرتا تھا تو اس کے آلات قرطبہ اشبیلیہ میں فروخت ہوتے تھے۔ ابن رشد کے اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ برقاہ دوسرے شہروں کے اشبیلیہ میں فنونِ جمیلہ کا زیادہ رواج تھا۔

اس کے بعد شقندہ نے اندلس کے دوسرے شہروں کا حال لکھتے ہوئے شہرِ عابدہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں کی رقاصہ عورتیں اپنے فن کے لحاظ سے شہور تھیں اور تلوار سے کھیلنے میں بھی خاص مہارت رکھتی تھیں۔

نیال، رقص و طرب کا ایک مشہور آکر ہے۔ اس کا تذکرہ شقندہ نے کیا ہے۔ اس کو خیالِ اظہل، خیالِ رقص اور خیالِ جعفر رقص بھی کہتے ہیں۔ جعفر اس کے موجد کا نام تھا۔ خفاجی نے شفاء العلیل میں لکھا ہے کہ جعفر خیال کے موجد کا نام ہے جیسا کہ ابن عبد البر

کہتا ہے:-
ایاکم ان تنکروا جعفراً
ذالک الخیالی واصحابہ
فنیل معرکم لہ جعفر
مختلف یخرج فی بابہ
خبردار جعفر اور اس کے ساتھیوں کے کمال کا ہرگز انکار نہ کرو
وہ جعفر جو خیالی یعنی موجد "خیال" ہے
مصر کا دریائے نیل بھی ایک جعفر ان سب سے
علیحدہ رکھتا ہے۔

صرف اندلس کی رقاصہ عورتیں خیالِ رقص کو استعمال نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ شقندہ نے ذکر کیا ہے بلکہ یہ کھیل مصر و عراق وغیرہ کی مشرقی عورتوں میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ وجیہ منابی کے اشعار جو اس نے خیال سے کھیلنے والی ایک لڑکی کے متعلق لکھے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں، اشعار یہ ہیں:-

وجاریۃ معشوقۃ اللہ و اقبلت
بحسن کز ہر الروض تحت کمام
اذا التفت قلت شکوی صباہ
وان ترسمت قلنا حباب بدم
ارتنا خیالِ اظہل والستر و ونہا
قابرت خیالِ شمس خلف غمام
تلعباً شخماً لہا خلف ستر ہا
کما لعبت افعالہا با نام
اور بہت سی لڑکیاں جن کا کھیل و نشین ہے کس طرح سامنے آتی ہیں۔
حسن کے ساتھ جس طرح پھول شگوفوں کے نیچے،
اگر وہ نغمہ ریز ہو تو میں کہوں گا اس کا نغمہ شکوہِ محبت ہے
اور اگر رقص کرے تو ہم کہیں گے کہ وہ (اپنی لطافت تحرک میں) شرابِ حباب ہے
اس نے خیالِ اظہل ہم کو دکھایا اور وہ پردہ کے پیچھے تھی،
تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم آفتاب کو ابر کے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔
وہ اپنے خاص لوگوں سے پس پردہ کھیل رہی ہے۔
جس طرح اپنے افعال سے ایک مخلوق کے ساتھ کھیلتی ہے۔

”وکر“ ایک خاص قسم کا رقص تھا جس میں شہر عابدہ کی عورتوں نے مہارت حاصل کی تھی اور اسوقت تک بصرہ میں زندگی پھیل چکے تھے ہیں۔ اسی طرح ”اخراج الفری“ ”مراہط“ ”قنوقہ“ بھی خاص کھیل تھے جن میں جسم کی سبکی اور مشق اور مہارت کی ضرورت تھی مقتدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنڈس کی عورتیں مردوں کی طرح تلواروں کے ساتھ رقص کرتی تھیں، کاٹھ کے گھوڑے پر سواری کرتا ایک دوسرے پر حملہ کرنا بھاگنا کو دنیا یہ سب مردانہ کھیل کھیلا کرتی تھیں۔

عورتوں کے رقص میں ہل اندس کا خیال

فنِ رقص کو اہل اُنڈس نے نہایت مکمل اور باقاعدہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اُنڈس کی رقصہ عورتوں کے متعلق ابن حمدیس شاعر سے اُنڈس کے ایک ریب نے استدعا کی کہ وہ اُنڈس کی کسی رقصہ کا وہ صنف اپنے کلام میں اس طرح بیان کرے کہ اہل اُنڈس کے ذوق رقصی اور رعنائی کی پوری تشریح ہو۔ اُنڈس کی رقصہ اپنی اُنگیوں سے ہر عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے جس پر محبت نے اپنا اثر ڈالا ہو۔ اگر آنسو کا ذکر آتا ہے تو اپنی آنکھ کی طرف اشارہ کرتی ہے اگر وجد و محبت کی تکلیف بیان کی جاتی ہے تو دل پر ہاتھ رکھتی ہے اسی طرح محبوب کے ناز و اداسی کے تذلل و پرستاری کو اپنے اشارات و حرکات سے اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ اصل واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اس پر ابن حمدیس نے یہ شعر کہے :-

وراقصته بالسحر فی حرکاتھا
تقیم بہ وزن النمار علی حد
منغمة الفاظہا بترنم -
کسا معبداً من عزة ذلّة العبد
تدوس قلوباً لسامعین بخرمۃ
بہا لقطت اللحن من العد
بقدمیوت النضن من حرکات
سکونا و این العن من نرتبة القد
وتحبہا عما تشیر بانسل
الی ایلاتی کل عضو من لوجد
بنالابہا تشکی من جوی الہوی

وما دمع اشواق مخدوة الخلد

اور بہت سی رقص کرنے والیاں ایسی ہیں کہ اپنی ساحرانہ حرکات سے غنا کے اوزان کو اپنی حد پر قائم رکھتی ہیں۔
اپنے الفاظ کے نغموں سے ایسا ترنم پیدا کرتی ہیں کہ غلاموں کے مالک باعزت شخص ان کی محبت میں ذلیل ہیں سامعین کے دلوں کو اپنی سر ملی آواز سے پامال کرتی ہیں اور کوئی لحن ایسا نہیں ہے جو اس آواز میں نہ پایا جائے انکا قد ایسا ہو کہ انکے مقابلہ میں لچکنے والی شاخ شرم سے ساکن اور پژمردہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ شاخ میں وہ لطافت کہاں جو قد میں پائی جاتی ہے تم اُنھیں دیکھ کر یہ خیال کرو گے کہ وہ اپنی اُنگیوں سے اپنے ہر اُس عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے جو محبت کی مصیبتیں کھیل رہا ہے اور سوزش قلب و آلام محبت کی جو شکایت وہ کرتی ہیں وہ حقیقت میں انکی ذات میں نہیں بلکہ ہماری ذات میں پائی جاتی ہے۔

اور شوق کے ایسے آنسو پائے جاتے ہیں جنہوں نے رخساروں میں گڑھے ڈال دیے

اذا هي قامت في الشفوف اضرابا
سناها فشففت عن سبيكة سابك
ایک دوسرا شاعر حرکات رقص کے متعلق کہتا ہے کہ رقص کے حرکات کو دیکھنے والا بہ سبب اُن کی تیزی کے سکون سمجھتا ہے اور حالت رقص میں اس کی حرکت آفتاب کی طرح ہے جو نظروں کو محسوس نہیں ہوتی۔

تري الحركات منه بلا سکون
فتحبها لطفها سكونا
کسیر لٹمس لیس بمستقر
ولیس بمکمن ان یستینا
تو اس رقص کے حرکات سریع کو جن میں سکون ہے دیکھے گا
تو بہ سبب غایت سرعت کے حرکت کو سکون سمجھے گا
اور یہ مثل حرکت آفتاب کے ہے جو ساکن نہیں ہے
لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کی حرکت ظاہر ہو۔
ایک دوسرا شاعر رقص کے کمال فن کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا زمین ایک بڑے جابر اور قاہر بادشاہ کا سر ہے جس کو نہ والیا
جس کے چھونے سے ڈرتی ہیں۔

یحا ذرن وطء الارض حتی کانما
یطان لظہر الارض حاملہ اُصید
صفی الدین حلبی اور ان شعرا و رفعات موسیقی کے ساتھ رقص کے ہاتھ پاؤں کی حرکت اور اسکے تناسب کو اس طرح بیان کرتا ہے
والراقصات وقد شدت ماذربا
علی حضور کا و ساط الزنا بیر
ترعی الضر و یبکی فیہا وارجلہا
وتحفظ الاصل من نقص وتغیر
وہ زمین پر قدم رکھنے سے حذر کرتی ہیں۔
گویا وہ زمین پر نہیں بلکہ کسی جابر و قاہر بادشاہ کے سر پر پاؤں رکھتی ہیں۔
رقص کرنے والیوں نے ٹپکے باندھے ہیں
ایسی کمروں پر جو اپنی باریکی میں زنبوروں کے مثل ہیں
ان کے ہاتھ اور پاؤں کی حرکت اور ان شعر کی مناسبت ہوتی ہو
وہ شعر کی اصل کو نقص اور تغیر سے محفوظ رکھتی ہیں۔

ابن محاسن نے ایک پر لطف قصیدہ ایک رقصہ کی تعریف میں لکھا ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں:-
اذا ہزت معاطفہا لرقص
وحرکت الانامل والنهودا
والت والتوت ولا وطرفا
ورنحت الشمایل والقدرودا
ومت بقستی حاجبہا الینا
بنالافتت منا الکیدودا
جب وہ اپنی کمروں کو رقص کے لئے حرکت دیتی ہے،
اور انگلیوں اور سینہ کو بھی جنبش دیتی ہے،
جھکتی ہے، بل کھاتی ہے، ناز و انداز سے
اور اپنے اعضا اور قد کو بھی حرکت میں لاتی ہے،
اور اپنے کمان ابرو سے ہماری طرف تیر چلاتی ہے،
تو ہمارے کلیجہ کو ٹکڑے کر ڈالتی ہے

جمال الدین ابن حسن بن علی بن دائر و فاروقی حرکات رقص کی سبکی اور سرعت انتقال کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

لقد راقصة تميل كأنها

ظل القصب اذا تامل مزهرا

ترجمہ و ترجمہ کا خیال فلا تری

حرکاتها الاطرافت الکبری

لانت معها فکیف تلفت

وتلفت لا استطاع بان تری

کیا خوب ہے وہ رقصہ جب وہ جھکتی ہے

تو گو یادہ سایہ ہوا ایک ایسی شاخ کا جو اپنے پھولوں کو لئے ہوئے لپکتی ہو

ظاہر ہوتی ہو اور واپس ہوتی ہو سرعت خیال کی طرح اسلئے اس کے درکار کھائی نہیں دیتے

مگر اس طرح جیسے خواب شیریں کا خیال آجائے۔

اُس کے جوڑ نرم ہیں۔ اس لئے وہ (سرعت سے) ٹر سکتی ہے۔

اور ٹرتی ہے اس طرح کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

ابوالحسن علی بن ابوالسیر اور عبداللہ بن موصلی وغیرہ علی الخصوص شعرائے اندلس نے رقصہ عورتوں اور رقص مردوں کے اوصاف

میں بہت کچھ اشعار لکھے ہیں جو اس مختصر مضمون میں درج نہیں کئے جاسکتے۔

جس طرح فنِ رقص نے عراق اور اندلس میں ترقی کی تھی اسی طرح جب اسلامی تمدن عراق سے مصر میں عہدِ فاطمین

فنِ تصویر و رقص

میں منتقل ہوا، تو اس فن کو وہاں بھی عروج ہوا۔ مقررہ نے ”خطط“ میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ خلیفہ ظاہر

بن الحاکم بامر اللہ کے عہد میں رقص کو کمال ہوا۔ رقصہ عورتیں ناچتی تھیں اور اس میں بڑی دلچسپی لی جاتی تھی۔ رقص ہی پر منحصر نہیں بلکہ

تمام تر روحانی لذتیں اس زمانہ میں تکمیل کو پہنچ گئی تھیں، جس طرح رقص مصر میں شعر کی طبع آزمائی اور مضمون آفرینی کا موضوع تھا،

اسی طرح مصرورین کے واسطے بھی ایک خاص موضوع کا حکم رکھتا تھا، خلافت فاطمیہ کے زمانہ میں، مصور اور نقاش رقص کے تمام اصناف

کی بہترین تصویر کھینچتے تھے۔ قاسم بن اس وقت فنونِ جمیلہ کا مرکز تھا۔ مشہور مصور قصیر اور ابن عزیر استاد کا مناظرہ مصر میں بڑے زور شور

سے ہوا تھا، جس کا موضوع رقصہ عورتوں کا رقص تھا۔ یہ مناظرہ قاضی القضاۃ وزیر یا زوری کے سامنے ہوا تھا۔ وزیر مذکور نے قصیر

کے مقابلہ کے لئے ابن عزیر کو عراق سے مصر میں بلایا تھا۔ کیونکہ قصیر تصویر کی اُچھرت بہت زیادہ لیتا تھا اور اُسے اپنے کمال پر بڑا ناز

تھا۔ اس مناظرہ میں قصیر نے ایک رقصہ کی تصویر سیاہ لباس میں کھینچی۔ رقصہ جنبیہ کی صورت پر تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ وہ دیوار کے اندر داخل ہو رہی ہے، اور ابن عزیر نے سرخ لباس میں ایک رقصہ کی تصویر بنائی یہ بھی جنبیہ کی صورت پر تھی اور ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار سے نکل رہی ہے۔

مصر کا تمدن جب عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ تو اس فن سے مصریوں کی دلچسپی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ رقص کی تعلیم کے لئے خاص معلم

بوتے تھے، جیسا کہ آج کل ہمارے زمانہ میں ہوتے ہیں اور رقص ایک باقاعدہ پیشہ ہو گیا تھا جس کے متعلق ابن خلدون کہتا ہے کہ ”مصر میں بعض

ذرائع معاش کو اس درجہ ترقی ہو گئی ہے کہ بمقابلہ دوسرے پیشوں کے اُن سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، کیونکہ ایسے پیشے تمدن کی

زیادتی اور تنعم کی فراوانی سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں، ان کی مثال میں غذا اور رقص کے معلمین کو پیش کیا جاسکتا ہے اور جب تمدن معمولی حد سے

بھی متجاوز ہو جاتا ہے (تو اس قسم کے مکاسب کی اور بھی کثرت ہوتی ہے) جیسا کہ ہم کو مصر کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرندوں اور

گدھوں کو تعلیم دیکر سدھایا جاتا ہے اور ماتم اور رقص کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے۔“

امرا اور خواص کا رقص

تمدن اسلام کے دور ترقی میں رقص صرف عورتوں اور عام مردوں میں محدود نہ تھا بلکہ خاص لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ مقرر میں شاہانِ ممالک کے زمانہ میں بادشاہ کی مجلس اور تقریبات میں امرا رقص کرتے تھے، چنانچہ بادشاہ اشرف خلیل بن قلاوون نے جب سلطانہ میں اپنے مشہور نعل ”الاشرفی“ کی عمارت مکمل کی، تو اسے محل میں ایک عظیم الشان جشن کیا اس کے متعلق مقرر نے لکھا ہے، ”جب امرا رقص کے لئے کھڑے ہوئے تو شاہی خزانچی نے ان پر اشرفیاں برسائیں“ بلکہ عراق، مصر، اندلس اور فارس وغیرہ میں جب عربی تمدن انتہائے عروج پر تھا تو بڑے طبقہ کے لوگ بھی رقص سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ رقص و سرود دُعا اور آلات موسیقی سے خود بھی اُنہوں نے مشغلہ کیا ہے، فقیر، محدث، طبیب اور بڑے صاحبِ وقار قاضی اور عہدوں کے گورنروں نے اس میں بے حد حصہ لیا ہے چنانچہ وزیر شاہی کی مجلس میں بہت سے قاضی اور دیگر اکابر قوم جن میں قاضی القضاۃ بھی ہوتے تھے ہفتہ وار جمع ہوتے تھے ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو سفید ریش بزرگ نہ ہو۔ اسی طرح وزیرِ مہلبی بھی ایک معمر اور باوقار شخص تھا۔ اس اجتماع کی مسرت اس طرح تکمیل کو پہنچائی جاتی تھی کہ ہر ایک شراب سے لبریز پیالہ اپنے ہاتھ میں لیتا تھا اور دائرہ میں اس میں غوطہ دیکر ایک دوسرے پر چھڑکتا تھا اس شراب پاشی کے بعد سب کے سب رقص کرنے لگتے تھے رقص کے ساتھ آلاتِ طرب اور گانا بھی ہوتا تھا۔

خلفا اور شاہانِ اسلام کی سب سے زیادہ عجیب مجلس رقص جس میں بڑے بڑے اربابِ دولت اور خاص عہدہ دار باری باری سے رقص کرتے تھے منصور بن ابی عامر کی مجلس اندلس میں بھی جس کے متعلق صاحبِ نفع الطیب لکھا ہے: ”منصور بن عامر کی مجلس میں کثرت سے لوگ جمع ہوتے تھے اور باری باری رقص کرتے تھے جب ابن شہید کی فوج آتی تھی تو وہ رقص کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھتا تھا:۔

ہاگ شیخاً قاده السكر لکا، اس بڑھے کو دیکھو جسے سُکر نے بدست کر دیا ہے

قام فی رقصہ مستہ لکا، وہ اپنے رقص میں جاہ و مال پر دریغ نہیں کرتا

لم یطق یرقصہا مستثباتاً، وہ حالتِ رقص میں اپنی مسرت کے اضطراب سے ٹھہر نہیں سکتا

فانثنی یرقصہا مستمکاً، وہ جھک جاتا ہے اور کسی شے کو پکڑ کر رقص کرتا ہے۔

من وزیر فہیم رتاصۃ، اور ایک وزیر بھی اس زمانہ میں رقص کرنے والا ہے۔

قام للسكرینا عی المملکا۔ جو بدست ہو کر کھڑا ہے اور بادشاہ سے ہمسری کرتا ہے

یہ تمام روایات عرب کے حسنِ ذوق اور لطافتِ طبع پر دلالت کرتی ہیں تاریخی واقعات جو ادھر پر ذکر کئے گئے عرب اور دوسری اسلامی

سلطنتوں کی حالت پر روشنی ڈالنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کس درجہ فنِ رقص سے دلچسپی لی جاتی تھی رقص

خفا اور موسیقی سے اُن کی حیاتِ اجتماعی کی مسرت مکمل ہوتی تھی (جیسا کہ آجکل یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے) یہ طبعی اور فطری مسرتیں ہیں جو وقار

و متانت کے ہرگز منافی نہیں بلکہ اسبابِ ظرافت اور مسرت میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسرتیں اس وقت تک اُن میں پائی گئیں

جب تک کہ اُن کا تمدن عروج پر رہا اور اُن کے وہ اخلاق اس سے محروم رہے جو اپنے تاریک عہد میں ان فنونِ جمیلہ کی طرف حقارت و عداوت کی

نظریں دیکھتے تھے اور ان کو نہایت ذلیل بلکہ اقسامِ کفر سے شمار کرتے تھے۔

خلاصہ

تاریخ عرب کی ایک وایت جمیل

پہلی صدی ہجری کا ایک واقعہ حسن و عشق

معاویہ و حسین کے کردار کا فرق

وہ روایت جو اس مختصر مضمون کی بنیاد ہے، کوئی فرضی واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے سعودی صاحب آٹانی، ابن قتیبہ، حموی اور ابن بدرون وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اس واقعہ سے غوا مض تاریخ عرب کا اگر ایک یہ باب سامنے آتا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد امویین کی حکومت کیا اسلوب اختیار کر رہی تھی اور ان کی حیات اجتماعی میں کن اخلاق کا نشوونما ہو رہا تھا، تو دوسری طرف معاویہ کے بالکل برعکس حسین کی سیرت کا وہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے، جو بعد کو ”ذبیح عظیم“ کی صورت میں حکومت ہنسی پر ایک ایسی بے لاگ تنقید کر گیا جس کی نظیر دنیائے حق و صداقت میں مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی ”روح ادب“ کس ذوق سے وابستہ تھی اور ان کے ہاں ایک ”عورت“ کی تکمیل نسائیت کا صحیح معیار کیا تھا۔

اندر :-

ابن علی مرتضیٰ	=	حسین
ابن ابی سفیان (امیر وقت)	=	معاویہ
معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد	=	یزید
معاویہ کا مستند علیہ فوجوان غلام	=	رقیق
والی عراق	=	عبداللہ بن سلام
عبداللہ بن سلام کی بیوی اور اپنے عہد کی بے مثل جمیل عورت	=	ارینس

ابو ہریرہ = صحابی رسول

ابو الدرداء = صحابی رسول

معاویہ کی ایک جہان لڑکی

رات کا وقت - یزید اپنے گھر میں مستزکار پر مقوم سا بیٹھا ہوا ہے، عود و عنبر کا دھواں فضا کو معطر کئے

ہوئے ہے سامنے اسباب بادہ خوار میہا ہے، اور رقیق (معاویہ کا غلام) سامنے خاموش حکم کا منتظر ہے

یزید (جام شراب ہاتھ میں لیکر) ”اے رقیق، میں نے تجھے اس لئے یاد کیا کہ آج ترک نشاط کا عہد کرنے والا ہوں اور شاید تجھ سے بہتر شاہد اس کا اور کوئی نہ ہو سکتا (جام رقیق کی طرف بڑھا کر) لے، اس کو باہر جا کر کہیں دور پھینک آ اور یہ سارا سامان چرچور کر ڈال، رقیق، جلدی کر، یہ خون کے گھونٹ کب تک پیوں گا، اور دل کی آگ کو کہاں تک اس طرح اور جھڑکا تا رہوں گا“

رقیق (دو زانو ہو کر یزید کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے) ”اے خاندان امیہ کے چشم و چراغ، تعمیل حکم مجھ پر فرض ہے، لیکن اگر کبھی بھی غلام کی گستاخیاں معاف کی جاسکتی ہیں، تو مجھے پوچھنے دیجئے کہ اس وقت سرزمین عرب کی وہ کونسی روت و لذت ہے جو آپ کے قدموں تک پہنچنے کی آرزو مند نہیں اور وہ کیا آزار ہو سکتا ہے جسے عرب کے ایسے حسین و جمیل شاہزادہ کو اس درجہ ملول بنا رکھا ہے؟

یزید - (منہ پھیر کر) ”رقیق، جا، اصرار نہ کر، دل کا چھالا پھوٹتا ہے، تو زہرا بے نجاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا آزار، راز ہی رہے، ورنہ ممکن ہے کہ اس کا اظہار خود میرے لئے اور زیادہ باعث تکلیف ثابت ہو۔“

رقیق - (مکر سے پیش قبض نکال کر یزید کے سامنے رکھتے ہوئے سر جھکا کر) ”لا علمی کی حالت میں اصرار کئے جانا اور ہلاک ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ زورہ رہوں اور اس علم کے ساتھ کہ آپ نے مجھے رازداری کا اہل نہ سمجھا۔ اگر آپ کو اختیار ہے تو مجھے اس بے اعتباری کی زندگی بسر کرنے سے انکار۔ رقیق اب اپنا سر لیکر یہاں سے واپس نہیں جاسکتا۔ اس لئے میں ادھر جام پھینکتا ہوں اور آپ اس پیش قبض کو میری گردن پر پھیر دیجئے“

یزید - (پیش قبض کو لیکر دو فرش پر پھینکتے ہوئے) ”رقیق، کیوں مجھے مجبور کرتا ہے کہ اپنے غم میں تجھے بھی شریک کروں جبکہ اس کا داؤد دنیا میں کوئی نہیں، امیر المؤمنین (امیر معاویہ) کی پیرائے شفقت، امیرانہ مرحمت کونسی ایسی ہے جو مجھے حاصل نہیں، لیکن یہ میری بر قسمتی کی انتہا ہے کہ باوجود ان تمام الطافِ خسرانہ کے میری بے نوائی کا وہی عالم ہے اور میری مجبوریاں علیٰ حالہ قائم۔“

”اگر زندگی کی حقیقی راحت و مسرت، اگر حیات کی سچی لذت و عذوبت کا تعلق کبھی قلب و روح سے بھی ہو سکتا ہے تو مجھ سے زیادہ ماتم گسار اور کون ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ میرا جسم ملبوس زرکار سے آراستہ نظر آتا ہے، میری روح ایک گدا کی طرح محتاج ہے اللہ جس وقت دنیا حشم و ندم کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے تو میرا قلب ایک دیرانہ کی طرح سسنا ہوتا ہے۔“

”میری - امیرانہ زندگی یہ شہانہ سطوت، یہ لوکانہ اقتدار، یہ خسروانہ جاہ و جلال، حقیقتاً سب ایسے پردہ کے نقش و نگار ہیں جسکے اٹھ جانے کے بعد سوائے سوگ اور ماتم کے کچھ نظر نہیں آ سکتا۔“

جسم سے نہیں میرے قلب سے پوچھ کہ اس نرم سند سے زیادہ سنگ خارا کوئی اور ہو سکتا ہے، کام زدہ نہیں روح سے دریافت کہ کہ ان نعایم و لذایذ سے زیادہ گرسنگی کوئی اور ہو سکتی ہے۔ دنیا جس وقت مجھے نشہ شراب میں بدمست دیکھتی ہے۔ اس وقت مجھ پر خود زبانی خون پینے کا جنون ہوتا ہے اور زمانہ جب مجھ کو محو غم و موسیقی دیکھتا ہے، تو اس وقت میری ہستی یکسر فریاد و آہ ہوتی ہے، لیکن کس سے کہوں کہ کوئی راز داں نہیں، اور کیوں کہوں جب میرے درد کا کوئی درماں نہیں۔“

یوسف۔ ”سچ ہے،‘ مجھ میں راز داں بننے کی اہلیت اور تلاش درماں کا سلیقہ، لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کے ساتھ اپنا دل دکھانے اور آپ کے قدموں پر اپنی جان دیدینے کی تمیز مجھ میں ضرور ہے، اس لئے مجھے اس کا موقعہ دیکھئے، اس کی اجازت دیکھئے، حیران ہوں کہ معاویہ کا بیٹا، سفیان کا پوتا، جس کا مردانہ عزم سنگین سے سنگین قلعہ فتح کر سکتا ہے، وہ ایک عورت کے نرم و نازک دل کی طرف سے اس درجہ خالیف ہو، ذرا میں بھی تو سنوں کہ حرم کی کنیزوں، امرا کی بیٹیوں میں وہ کون سی بے نصیب ہے جو آپ کی پرجوش محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حسن و شباب ہر چند نہایت بیش بہا دولت ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے زیادہ ارزاں سودا بھی کسی اور چیز کا نہیں ہوتا۔ کچھ کہئے تو سہی کیا یہ عتاب حباب و عذرا، رباب و سلمہ پر ہے، یا کوئی اور سرزمین نجد کی لڑکی ہے جس نے آپ کو اس قدر دیوانہ بہت بنا رکھا ہے۔“

یمنیہ۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) ”وہ میری کنیزان حرم میں سے حباب و عذرا ہے۔ نجد کی کوئی لیلیٰ، بلکہ وہ عراق کی تاجستان کی شراب ہے، وہاں کے باغ کی بہار ہے، وہ اریب ہے اور خوش نصیب عبداللہ بن سلام، والی عراق کی بیوی، جس کے حصول کے لئے میں صرف وہ ایک لمحہ چھوڑ کر جس میں اس کے لب میرے لب سے متصل ہوں، اپنی ساری زندگی دیدینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اسے رقیق تو نے اُسے نہیں دیکھا اس لئے شاید مجھ پر ہنسے لیکن باور کر کہ صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کر سکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی۔ اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جاسکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے اور شراب بھی جو سحر بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لابی سیاہ پلکیں جن کی جنبش بہ حالت التفات رگ جاں ہے اور بہ صورت عتاب نوک سناں، اس حریر سے بنائی گئی ہیں، جسے نازنینان روم کی نرم و لچیلی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔ وہ اس کے نازک لب جن کے دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے، ایک ایسا سرچشمہ حیات ہیں جس سے سیراب ہونے کے لئے بیان کی قربانی حد درجہ ناقص تعبیر شوق ہے۔ وہ اس کا صبح رنگ، جس سے آفتاب طلوع صبح کا استعاضا کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے، وہ خوبصورت دانت جس سے الماس اپنے سرمایہ ضیاء کا آرزو مند ہے، وہ رخسار جن سے شمع محفل کسب نور کرتی ہے، اور اسی طرح اس کے جسم کا ہر حصہ، اس کی خوش ادائیگوں کا ایک کرشمہ، اس کی عشوہ فریادوں کا ایک ایک رمز، اک مستقل دنیا کے لذت و نشاط ہے، جس کے اظہار کے لئے عام و نقش شعر میں اس وقت تک کوئی نقاش و شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں بتاؤں کہ میں نے کب اور کس عالم میں اول اول اسے دیکھا تھا۔ آہ، کلیجہ شوق ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ ابھی دوشیزہ تھی اس کی شراب حسن ناچشیدہ تھی اور کیف و مستی رمیدہ، ایک رات، وہ ایک ظالم رات جب میں نے اسے دیکھا، تو اپنے

تمام ملکوتی جمال کے ساتھ، وہ زینت و آرائش کا بھی مجسمہ تھی اور ایک اقرب میں اپنی بہت سی ہمن لڑکیوں کے ساتھ مصروف نشاط تھی میں نے پوشیدہ طور پر ساری رات اس کو محو ہوا و لعب دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کھیلنے ہی کھیلنے اس نے کتنی بار اور کس کس طرح، میری روح اور میری حیات کا سودا کر لیا، اس عمر میں خدا معلوم کتنی حسین لڑکیاں میری نگاہ سے گزر چکی ہیں جن کے حسن و جمال جن کے شاعرانہ ذوق اور نغمہ و موسیقی نے مجھے مالون کیا اور میں ان کی قدر کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن میرا ذرا دل کے سامنے جھک جانا اس وقت تک تھا جب تک اربیب کے آفتاب حسن نے میرے سامنے طلوع نہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت اس نے طلوع کیا تو میں اس کے سامنے جھک گیا، اس کو پوچھنے لگا اور عہد کر لیا کہ ساری عمر اس کی پرستش میں صرف کر دوں گا۔

اس رات اس نے جن کمالات انسانی کو پیش کیا ان کا اظہار بالکل محال ہے، وہ اس کا بلند ذوق شعری، وہ برجستہ و بر محل فصیح و بلیغ فقروں کا استعمال، وہ اس کا جاں نواز لحن، وہ اس کا عرشہ بر اندام کرنے والا رقص، الغرض اس کی وہ تمام دلربائیاں، جنہیں مشکل سے ایک تصور انسانی ایک جگہ فراہم کر سکتا ہے، حقیقی صورت میں میرے سامنے تھیں اور میں زندہ تھا!

رقیق، تو یقین کر کہ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس کے بعد جب میں نے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس درمیان میں عبداللہ بن سلام سے اس کا عقد ہو چکا ہے۔ تو اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خبر سن کر مجھ پر کیا گزری ہوگی اور اب میں کیونکر دنیا میں مسرور زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ اسے رقیق اگر تیری کوئی تدبیر اس باب میں کامیاب ہوگئی تو میرے اور تیرے درمیان خدا ہے کہ مجھ سے زاید انعامات کی بارش کرنے والا تجھے کوئی نہ دیگا۔

رقیق۔ ”آپ پر میری جان فدا ہو۔ کیا مجھے اس سے زیادہ کسی انعام کی خواہش ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا راز دار بنایا اور کیا میں حصول تمنا کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا رکھوں گا۔“

(نیزید سر مکر کر رہ جاتا ہے اور رقیق پر وہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

(۳)

(صبح کا وقت، معاویہ کی خلوت گاہ، معاویہ ٹہل رہا ہے اور رقیق اُن سے باتیں کر رہا ہے)

معاویہ۔ ”یقیناً میں نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں غلطی کی، اور جو دن گزرتا ہے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ غضب خدا کا، شب و روز میخواری، رات دن فسق و فجور اور ہر لمحہ ایک نئی معصیت کی جستجو، میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ میرے بعد خلیفہ ہو بھڑکیا تو کون اس کی عزت کرے گا اور عباس و علی کا خاندان کب اس کو حکومت کی ہمت دیگا۔“

رقیق۔ ”امیر المؤمنین کا ارشاد بجا و درست ہے، لیکن غلام کا خیال یہی ہے کہ یزید کی موجودہ زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے آپ کو اس کا بزرگ سمجھتے ہیں۔“

معاویہ۔ (غصہ کی حالت میں کھڑے ہو کر) ”رقیق یہ تو نے کیا کہا، کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو معصیت میں مبتلا کیا، میں نے اس کو شراب کا مادی بنادیا، میں نے اس کے بیوقوف و دماغ میں گناہ کا خیال پیدا کیا۔“

ریق - (ہاتھ جوڑ کر) نہیں، اے امیر المومنین، نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے، اس خلاف حقیقت بات کو کون مان سکتا ہے، لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات انسان حالات سے مجبور ہونے کے بعد بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اسباب نہ پیدا ہوتے تو شاید وہ گناہ نہ ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یزید کی مینواری اس کی فطرت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔

معاویہ - ”مجبوری! مجبوری کیا ہو سکتی ہے۔ میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔“

ریق - ”امیر المومنین، جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ اپنی جانبری کی ہر ممکن تدبیر کرتا ہے۔ اگر یزید ارنیب کی طرف سے مایوس ہو کر ان مشاغل تفریح سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ غریب کب کا ہلاک ہو گیا ہوتا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آج ارنیب حاصل ہو جائے تو کل یزید سے زیادہ متقی، کوئی ہو نہیں سکتا۔“

(معاویہ خاموش، سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں اور دیر تک یہی عالم رہتا ہے، رقیق باہر جانا چاہتا ہے، معاویہ اس کو روک لیتے ہیں)

معاویہ - ”ریق، تجھ کو یقین ہے کہ یزید کی زندگی میں انقلاب ہو جائے گا اگر ارنیب لگتی۔“

ریق - ”اے امیر المومنین، ایسا ہی یقین ہے، جیسے اس وقت طلوع آفتاب کا۔“

معاویہ - ”اچھا، کاتب کو بلا لا۔“

(کاتب آتا ہے)

معاویہ - ”عبداللہ بن سلام والی عراق کے نام میری طرف سے ایک خط لکھو کہ جس قدر جلد آسکتے ہو میرے پاس آ جاؤ، کیونکہ ایک مرتبہ میرے ہی فلاح و بہبود کا سامنے ہے۔“

(۳)

(عبداللہ بن سلام، معاویہ کا یہاں ہے اور نہایت عزت و اکرام کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ معاویہ، ابوہریرہ اور

ابوالدرداء کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں)

معاویہ - (ابوہریرہ اور ابوالدرداء سے) ”آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری بیٹی جو ان ہو گئی ہے اور میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے

عبداللہ بن سلام کو پسند کیا ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔“

دونوں - ”انتخاب اچھا ہے اور آپ کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔“

معاویہ - ”تو پھر آپ جا کر عبداللہ بن سلام کو میری طرف سے یہ پیغام دیجئے، یقین تو ہے کہ وہ منظور کر لے گا۔“

(وہ دونوں جاتے ہیں۔ امیر معاویہ، کینر کے ذریعہ سے اپنی لڑکی کو طلب کرتے ہیں۔ لڑکی اندر داخل ہوتی ہے)

معاویہ - ”جس وقت ابوہریرہ اور ابوالدرداء تیسرے پاس آکر عبداللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کا پیغام تجھ کو دیں تو اس پیغام کو مرست

سے سننا اور جواب دینا کہ مجھے کوئی غدر نہیں، سوا اس کے کہ فی الحال ارنیب اس کے پاس موجود ہے اور ایسی صورت میں میری غیرت

شادی کی اہانت نہیں دیتی، اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو بیشک میں راضی ہوں۔“

(۴)

(عبداللہ بن سلام اپنے خیمہ میں نظر بیٹھا ہوا ہے اور ابوالدرداء اور ابوہریرہ پردہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ابوہریرہ - ”معاویہ بہت مسرور ہے کہ تم نے اس تعلق کو خوشی کے ساتھ قبول کیا اور حقیقت یہ ہے کہ معاویہ نہ صرف امیر وقت ہو بلکہ صحابی رسول اور کاتب رسول ہونے کا بھی فخر اسے حاصل ہے، پھر یوں بھی شرافت و سیادت، نجابت و امارت ہمیشہ سے اس خاندان میں چلی آ رہی ہے، اس لئے یقیناً تم کو خوش ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے خاندان میں تم کو شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی لڑکی کو یہ اعتراف ضرور ہے کہ ارنیب کے ہوتے ہوئے وہ تمہارے ساتھ مسرت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ اس لئے اب صورت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ تم ارنیب کو طلاق دو، یا اس رشتہ سے ہاتھ دھو۔“

(عبداللہ بن عمر کو گھرا جاتا ہے اور افسردگی اس کے چہرہ پر چھپا جاتی ہے)

ابوالدرداء - ”یقیناً تم کو ارنیب کا چھوڑ دینا بہت شاق ہوگا، کیونکہ علاوہ حسن و جمال، تہذیب و شائستگی کے محبت و دیرینہ کا خیال بھی اس کے منافی ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ معاویہ کے خاندان میں شامل ہونا تمہارے لئے باعث فلاح ہو سکتا ہے تو تم کو چار و ناچار ارنیب کو طلاق دینا پڑے گی۔“

عبداللہ - ”یہ صحیح ہے کہ ارنیب ایسی بیوی کا ملجانا میرے لئے انتہائی خوش قسمتی ہے، لیکن ارنیب کے لئے یہ امر باعث فخر نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ اس لئے میرا اس کو چھوڑ دینا اس کے لئے باعث تکلیف نہیں ہو سکتا۔ جو تکلیف ہوگی مجھے کو ہوگی اس لئے اب جبکہ میں اتنا سفر کر کے یہاں آیا ہوں، امر معاویہ کی خودیہ خواہش ہے اور میں اس پر راضی بھی ہوں، تو اب میرا انکار کر دینا صرف جذبات محبت کی بنا پر غالباً سیاست کے خلاف ہے اس لئے میں اس وقت آپ لوگوں کو شاید بنا کر ارنیب کو طلاق دیتا ہوں، آپ جائیے اور امیر معاویہ اور ان کی صاحبزادی کو اطلاع دیجئے کہ میں نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔“

(عبداللہ بن سلام باقاعدہ طور پر ارنیب کو طلاق شرعی دیتا ہے اور ابوالدرداء ابوہریرہ طلاق کے شاہد ہو کر باہر چلے جاتے ہیں۔)

(۵)

(عراق میں عبداللہ بن سلام کا مکان - امام حسینؑ کے ہمارے فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ارنیب اندر حجرہ

میں بیٹھی ہوئی ہے، ابوالدرداء داخل ہوتے ہیں۔)

ابوالدرداء - ”السلام علیکم“

حسین - ”وعلیکم السلام اسے صحابی رسول“

ابوالدرداء - ”آکھوں میں آنسو لاکر اسے خیر تمہیں دیکھ کر میرے سامنے عہد نبویؐ آگیا، آدہ بھی کیا مسعود و متبرک زمانہ تھا کہ ہمارا جو قدم اٹھتا تھا خدا کی راہ میں اٹھتا تھا اور آج میں دیکھتا ہوں کہ میری ہر سانس ناراستی کی فضا میں نکلتی ہے۔ خیر خدا کی مرضی یہی ہے میں یہاں ارنیب کو معاویہ کی طرف سے یزید کا پیغام نکاح دینے آیا ہوں۔ لیکن اسے جا کر گوشہ رسولؐ آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟“

حسین۔ ”میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ اربیب کو اپنا پیام دوں“

ابوالدرداء۔ ”افسوس ہے مجھے وہ خدمت انجام دینا پڑتی ہے جس کو میرا دل نہیں چاہتا، عبد اللہ بن سلام اربیب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ کی بیٹی کو بھی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس نے انکار کر دیا۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا اور چونکہ عبد اللہ بن سلام کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ سب کمزور و تنہا صرف اس لئے کسی طرح اربیب کو طلاق دلو کر یزید سے اس کی شادی کرادی جائے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہو گیا، اس لئے معاویہ نے برہم ہو کر اسے معزول بھی کر دیا اور اب وہ غریب کسی طرف کانہ رہا“

حسین۔ ”ہاں یہ ساری خبریں مجھے پہنچ چکی ہیں اور چونکہ آپ بھی اس غرض کو لیکر آئے ہیں اس لئے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے، کہ اربیب سے دریافت کر لیجئے وہ مجھ میں اور یزید میں کس کو پسند کرتی ہے“

(ابوالدرداء حجرہ کے پاس جا کر اربیب کو مخاطب کرتے ہیں)

ابوالدرداء۔ ”اے اربیب، مجھ کو تیرے حال سے بہت ہمدردی ہے، لیکن اب جبکہ عبد اللہ بن سلام مجھے طلاق دے چکا ہے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوا اس کے کہ تو کسی اور سے نکاح کرے۔ اس وقت دو شخص تیرے خواہشمند ہیں، ایک یزید، معاویہ کا بیٹا، اور اس کا ولی عہد اور دوسرا حسین ابن علی۔ ان میں سے تو جس کو مناسب سمجھے اپنے لئے اختیار کرے“

اربیب۔ (دیر تک سکوت کرنے کے بعد) ”اے ابوالدرداء اگر آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے اور یہ مسئلہ میرے سامنے آتا تو میں اس وقت بھی آپ ہی پر اس کا انحصار کرتی، اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ مجھے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے اور میرے لئے فلاح کس کے انتخاب میں ہے“

ابوالدرداء۔ ”میرا اس باب میں کوئی مشورہ دینا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود فیصلہ کرو“

اربیب۔ ”ابوالدرداء میں تمہارے بھائی کی بیٹی ہوں۔ اس لئے یوں بھی تمہیں مشورہ دینا چاہئے تعجب ہے کہ تم صحابی رسول ہو کروں امر حق کے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہو“

ابوالدرداء۔ ”اگر تجھے اصرار ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حسین ابن علی میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو حسین کے لب چومتے ہوئے دیکھا ہے“

اربیب۔ ”تو بہتر ہے میں حسین کو پسند کرتی ہوں“

(اسی جگہ اور اسی وقت حسین کا عقد اربیب سے ہو جاتا ہے اور ابوالدرداء چلے جاتے ہیں)

(۶)

(کچھ زمانہ کے بعد امام حسین اپنے مکان میں بیٹھے ہیں اور عبد اللہ بن سلام داخل ہوتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کا چہرہ

بہت مغموم ہے اور غربت و افلاس اس کے کپڑوں سے ظاہر ہے)

حسین۔ ”عبد اللہ بن سلام، آؤ، مبارک ہو تمہارا یہاں آطا کہو، معاویہ کو تم نے کیسا پایا“

عبداللہ بن سلام - (آہ سرد بھر کر) ”معاویہ وہ ہے جسے دھوکا دیکر میری زندگی کی بہترین لذت و نعمت مجھ سے چھین لی، میری امارت و سرداری کو غربت و افلاس سے بدل دیا اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو میرے حال پر رحم کرے اور اپنی محبت سے میرے مصائب کو قابل برداشت بنادے۔“

حسین - ”اے عبداللہ بن سلام، اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری تکلیفوں کو دور کرے۔ اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلا پس و پیش بتاؤ، میں اس کے انجام دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں۔“

عبداللہ بن سلام - ”ہاں، میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے فریضے سے اربیب سے اپنی ایک امانت طلب کروں جو میں نے اسکو دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہو لوں۔“

حسین - (اوٹ کے اندر اربیب سے) ”عبداللہ بن سلام اپنی امانت تم سے طلب کرنے آئے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟“

اربیب - ”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ وہ تھیلی میں سر بہ مہر ہے اور میں نے اسے کھولا نہیں۔“

حسین - ”تو بہتر یہی ہے کہ جس شخص نے امانت رکھی ہے خود اس کو اپنے ہاتھ سے واپس کر دو۔“

(حسین باہر چلے جاتے ہیں اور اربیب پردہ سے باہر آکر عبداللہ بن سلام کے سامنے آجاتی ہے۔ عبداللہ متحیرانہ

اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر دونوں رونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد)

عبداللہ بن سلام - (آنسو پونچھتے ہوئے) ”اے اربیب، مجھے تیری جدائی کا اتنا ڈر نہیں، جتنا اس امر کا کہ میں اپنے آپ کو تیرے

قابل وثابت کر سکا، میں نے جس طمع سے تجھے طلاق دی اس کی سزا اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ احساس کہ میں نے تجھ سے بیوفائی کی

اور اس احساس کے ساتھ تمام عمر بے چین رہنا۔ اے اربیب مجھے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے ہمکلام ہوں، اور غالباً میں کبھی نہ آنا اگر

میری موجودہ سقیم حالت امانت واپس لینے پر مجبور نہ کرتی، کیونکہ اس تھیلی میں ایک قیمتی موتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو فروخت کر کے

کسی جگہ گوشہ گنہامی میں اپنی زندگی بسر کروں۔“

اربیب - (دامن سے آنسو خشک کرتے ہوئے) ”یہ آپ کی امانت حاضر ہے، اور اگر کوئی اور چیز ایسی ہے جو میں پیش کر سکتی ہوں تو اسے

بھی بتا دیجئے، آپ نے جس محبت و عزت کے ساتھ میرے حقوق ادا کئے ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ قربانی طلب کر سکتے، چہ جائیکہ مال و زر

جو نہایت حقیر چیز ہے۔“

عبداللہ بن سلام - ”میں نے تجھے دیا ہی کیا ہے جو طلب کروں، البتہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے میرے اس تصور کو معاف کر دیا ہے

تو غالباً میں ایک حد تک سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا۔“

اربیب - ”اللہ اور اس کا رسول شاہد ہے کہ میں آپ کی ہر غلطی کو سچے دل سے معاف کرتی ہوں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ

میری طرف سے اگر کوئی فروگزاشت ہوئی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو آپ بھی درگزر کیجئے۔“

(عبداللہ بن سلام کا دل یہ شکر بھر بھر آتا ہے اور اٹھ کر دو تاجوا باہر جانا چاہتا ہے۔ حسین اندر داخل ہوتے ہیں)

حسین - ”اے عبداللہ! تم کو اپنی امانت واپس مل گئی۔“

عبداللہ - ”ہاں، مل گئی اور اب میں جاتا ہوں، آپ کی اس عنایت کا شکریہ۔“

حسین - ”لیکن ابھی ایک امانت اور ہے جو تم کو ملنا چاہیے۔“

عبداللہ - ”وہ کیا، میں نے تو اور کوئی چیز ارنیب کے پاس امانت نہیں رکھوائی تھی۔“

حسین - ”لیکن میرے پاس تو ہے۔“

عبداللہ - ”وہ کیا ہے، اے میرے سردار۔“

حسین - ”وہ ارنیب بنت اسحاق ہے، جس سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ طلاق دیکر پھر تمہارے ساتھ شادی کر دوں

ظاہر ہے کہ اُس شدید طلاق کے بعد جو تم نے دی تھی ارنیب تمہاری نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ کوئی دوسرا شخص اس سے عقد کر کے طلاق

نہ دے اور میں نے مناسب سمجھا کہ یہ خدمت میں ہی انجام دوں۔“

(حسین: کہہ کر باہر چلے جاتے ہیں اور عبداللہ جن سلام اور ارنیب دونوں ایک ایسی حالت کے ساتھ جس میں مسرت کا

غیر معمولی جذبہ انسان کو گنگ بنا دیتا ہے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

فہرست مطبوعات نگار ایک کیبلی لکھنؤ

تصانیف نیاز فختوری

روپیہ ۱۔۔۔۔۔ ۸	=	فلاسفہ و تدبیر	نگارستان (افسانوں کا پہلا مجموعہ) = روپیہ ۳۔۰۰	آنے
۲۔۔۔۔۔ ۸	=	انتقادیات حصہ اول	۴۔۔۔۔۔	جہانستان (افسانوں کا دوسرا مجموعہ) = ۴۔۔۔۔۔
۳۔۔۔۔۔	=	انتقادیات حصہ دوم	۲۔۔۔۔۔	حسن کی عیاریاں (تیسرا مجموعہ) = ۲۔۔۔۔۔
۱۔۔۔۔۔ ۸	=	شہاب کی سرگزشت	۳۔۔۔۔۔ ۸	مختارات نیاز (چوتھا مجموعہ) = ۳۔۔۔۔۔ ۸
۱۔۔۔۔۔ ۸	=	مقالات نیاز	۲۔۔۔۔۔ ۴	جہانسی کی رانی (ڈرامہ) = ۲۔۔۔۔۔ ۴
۱۔۔۔۔۔	=	فراست الید	۱۔۔۔۔۔ ۵	اصحاب کہف (ڈرامہ) = ۱۔۔۔۔۔ ۵
۱۔۔۔۔۔	=	مذہب	۳۔۔۔۔۔	مکتوبات نیاز دو حصے = فی حصہ = ۳۔۔۔۔۔
۱۲۔۔۔۔۔	=	شاعر کا انتخاب	۴۔۔۔۔۔	شہوانیات
۱۲۔۔۔۔۔	=	مذہبات سماشا	۳۔۔۔۔۔	استفسار و جواب = حصہ ۲ - ۳ { فی حصہ
۸۔۔۔۔۔	=	نقاب اٹھ جانے کے بعد	۳۔۔۔۔۔	

خواتین عرب کی فیشن طرازیوں

(عہد جاہلیتہ و اسلام میں)

عورت، ہر جگہ عورت ہے، خواہ وہ کشمیر کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی ہو، یا صحرائے عرب کے ریگزاروں میں۔ عورت کی یہ جس کہ وہ حسین ہے، جاذبِ قلب و نظر ہے اور یہ کہ ”زیب دیتا ہے اُسے دشمن ایماں ہونا“ یورپ و ایشیا ہر جگہ یکساں فرق ہو فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگر ایک اپنا دامن مرد کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتی تو دوسری بگڑ کر یہ کہہ گزرتی ہے کہ:

میرا دامن چھوڑے اپنا گریباں پھاڑے

الغرض عورت حسین ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو ایسا ضرور سمجھتی ہے اور یہی وہ جس ہے جو اس میں جذبہٴ آرایش و زیبائش پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ جس جو آج مغرب کی عورت میں اس قدر نمایاں طور پر پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل ایشیا کی عورت میں بھی پائی جاتی تھی اور جن اسباب غمزہ و ناز سے آج مغرب کی عورتیں آراستہ نظر آتی ہیں، انہیں اسباب سے خواتین ایشیا بھی کسی وقت آراستہ تھیں۔ خواتین یورپ کی ابداع و اختراع وضع ولبوس آج ضرب المثل ہے لیکن تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی عورت بھی یہی ذہنیت رکھتی تھی اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے ہر جگہ اور ہمیشہ اس نے اس ابداع و اختراع سے کام لیا۔

بعض کا خیال ہے کہ خواتین عرب عہد جاہلیتہ میں اپنے وضع ولبوس کے لحاظ سے سخت وحشی تھیں اور ان میں زیبائش و آرایش کا خیال بڑی حد تک معدوم تھا حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ وہ آرایش و زیبائش کے مختلف طریقوں سے واقف تھیں، لبوس کی تراش خراش میں بھی اختراع سے کام لیتی تھیں اور وضع میں رنگینیاں پیدا کرنا بھی انہیں معلوم تھا۔ پھر چونکہ اُن کا کوئی دین تھا، نہ قانون اس لئے اس ذوق آرایش میں اعتدال قائم رکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی اور اسی لئے جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے خواتین عرب کے مشوقِ تجلیل و آرایش میں نامناسب افراط کو محسوس کیا، تو اس نے ”تبرج جاہلیتہ“ (یعنی عہد جاہلیتہ کی زینت و آرایش) کو ممنوع قرار دیا۔

عہد جاہلیتہ کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتیں صرف اُون اور سوت ہی کا لباس استعمال نہ کرتی تھیں بلکہ مختلف رنگ کے دیبا و حریر بھی حسب استطاعت پہنتی تھیں اور جب کسی بگڑا ہوا تہا تو بہترین لباس و آرایش کے ساتھ

شریک ہوا کرتی تھیں۔ المنخل الیشکری لکھتا ہے :-

الکاعب الحسناء ترفل فی الدمقس والحریر

(نوجوان حسین لڑکی دیبا و حریر کا ملبوس پہنے ہوئے اتر رہی ہے)

کپڑوں کے زریں نقش و نگار کا حال سلمیٰ بن ربیعہ اس طرح بیان کرتا ہے :-

والیبعض یرفن کالدی فی الریط والمذہب المصون

ریط سے مراد ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہیں اور المذہب المصون سے زریں نقش و نگار رکھنے والے ملبوس اسی طرح کے ہزاروں اشعار عہد جاہلیت کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہاں کی عورتوں کی رنگینی طبع و تزئین و تجمل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت یورپ میں خاص تقریبات کے وقت امیر گھرانوں کی عورتیں ایسے ملبوس پہنتی ہیں جن کے دامن فرش پر گھسٹتے رہتے ہیں اور غالباً یہی وضع ہے جس کو فارسی میں ”دامن کشاں گزشتن“ سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم عربی عورتیں بھی بالکل اسی طرح کے لباس پہن کر مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھیں جسے ”جر ذہول“ کہتے ہیں اس فیشن کے متعلق مورخین عرب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اس کو جناب ابراہیم کی بیوی ماجرہ نے وضع کیا تاکہ دامن کے گھسٹ کر چلنے سے اُن کے نشان قدم مٹتے جائیں اور اُن کی سوکن سارہ کو پتہ نہ چلے اس کے بعد اور عورتوں نے بھی یہی وضع اختیار کی، چنانچہ عرب عورتوں کے اس طرح ”دامن کشاں“ چلنے کا ذکر کثرت سے وہاں کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ امر القیس لکھتا ہے :-

خرجت بہا امشی تجرد راونا علی اثرینا ذیل مرط مرقل

اس شعر میں شاعر اپنی معشوقہ فاطمہ کا ذکر کرتا ہے کہ جب وہ خلوت گاہ سے نکل کر چلی اور عاشق بھی ساتھ ساتھ چلا تو وہ اپنے ملبوس کا دامن گھسیٹتی ہوئی گزری تاکہ دونوں کے نشان قدم مٹتے جائیں اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

”مرط مرقل“ سے مراد وہ ریشمی کپڑا ہے جس کے اوپر محل کی تصویریں نقش و نقش ہوں۔

یہ وضع عرب عورتوں میں بہت مقبول تھی اور عہد اسلام میں پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ لکھتا ہے :-

کتب القتل والقصال علینا وعلی الخانیات جبر الذیول

یورپ کے عہد وسطیٰ کے بعد بھی عورتوں میں رسم تھی کہ وہ اپنے کولوں کو بڑا دکھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے گدے یا تکیے کر سے

نیچے دونوں طرف باندھ لیتی تھیں۔ اور پھر اس کے اوپر دوسرا ملبوس پہن لیتی تھیں۔

یہ وضع عہد جاہلیت کی عورت نے اختراع کی تھی جسے عظامہ، حشیہ اور رفاعتہ کہتے تھے اور اہل لغت نے اس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ تکیے کی طرح کپڑے کی گدسی ہوتی ہے جس کو باندھ کر عورتیں اپنے کولوں کو بڑا ظاہر کرتی ہیں۔

استعمال زیور میں وہاں کی عورتوں کو بہت شغف تھا اور لباس سے زائد اس طرف توجہ تھی۔ اور ایک ایک حصہ جسم کے لئے متعدد

زیور استعمال کرتی تھیں۔ ناک پر انگوٹھیں، انگلیوں پر انگلیوں، کلائی پر کنگن، بازو میں جوشن اور ہونچے میں دست بند استعمال کرتی تھیں جنکا

نام علی الترتیب خاتم، سوار، دلچ اور جبرہ تھا۔ دست بند استعمال کرنے کی رسم بعد کو تمدن یورپ میں جاری ہوئی اور اس وقت تک پائی باقی رہ۔
انگوٹھیاں وہ دسوں انگلیوں میں پہنتی تھیں اور یہ رسم عہد اسلام میں بھی پائی باقی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ کا ذکر کرتے ہیں صاحب آغانی
لکھتے ہیں کہ:-

”وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ معشوقہ (شریاء) کے پاس گیا اور جب وہ کپڑے اتار کر اس کے پاس آئی تو اس کے دوست کو کھل کر

لوٹ گئی۔ اس نے کہا کہ شرم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ میرا دوست ہے اور اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ

بہنے لگا۔ شریاء کو غصہ معلوم ہوا تو اس نے نکل کر ایسا دو تہڑ مارا کہ دسوں انگوٹھیوں کے نشان اس کی پیشانی پر پڑ گئے۔“

جب ظہور اسلام ہوا تو عورتوں کا یہ ذوق آرائش حد کو پہنچا ہوا تھا، قمیص کا گریبان کھلا رہتا تھا اور دوپٹے پیچھے نکلتا رہتا تھا جس
سے سینہ و گردن دونوں عریاں نظر آتے تھے۔ اسلام نے اس وضع کو فتنہ سے خالی نہ دیکھ کر حکم دیا کہ عورتیں اپنے دوپٹے کا پلو سینہ پر ڈھرا لیں

(ولایدین زنتھن الا لبعولتھن و آباءھن)

اس حکم سے ان کو سخت صدمہ ہوا، لیکن چونکہ دینی روح ان میں پوری طرح چکی تھی اس لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا

مگر کچھ زمانہ بعد ایک اور وضع انھوں نے ایجاد کی جو ان کے گمان میں خلاف مذہب نہ ہو سکتی تھی، یعنی تنگ کپڑا استعمال کرنا شروع کیا جسے

”وضع قباطی“ کہتے تھے۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ قباطی ان تنگ چست کپڑوں کو کہتے ہیں جو جسم کے نشیب و فراز اور اعضاء کے آثار چڑھاؤ کو

نمایاں کر دیتے ہیں، خلیفہ ثانی نے اس وضع کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ اس میں بھی کافی عریانی تھی۔

عرب کی عورتوں کا ملبوس بعض مرتبہ شاعری سے بھی کافی متاثر ہوا ہے اس سلسلہ میں ایک ادبی واقعہ کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

خواتین عرب سیاہ رنگ کا ملبوس اور خاص کر سیاہ دوپٹے پسند کرتی تھیں۔ ایک بار عراق کا کوئی سوداگر مدینہ آیا جس کے پاس مختلف رنگوں

کے دوپٹے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی اس کا تمام مال فروخت ہو گیا لیکن سیاہ دوپٹے کسی نے نہ لیا۔ سوداگر مسکین الدارمی کے پاس گیا جو اپنے زمانہ

کا مشہور رنگین مزاج شاعر تھا اور کچھ دن سے مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہا تھا۔ مسکین کو اس پر رحم آیا اور خرقدہ زہد اتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اباسکی

وہی شان رندی تھی اور وہی ادائے رنگیں۔ اس نے چند شعر لکھ کر اپنے ایک دوست کو جو منہ تھکا دے تاکہ وہ کسی جگہ جا کر انگوٹھا لے۔ وہ اشعار یہ تھے

تل للمیحة فی الحمار الاسود، اذا فعلت براہیب متعب

قد کان شمر للصلاة ثیاب، حتی خرت لہ بباب المسجد

ردی علیہ صلاتہ وصیامہ، لا قلب یحق دین محمد

ان اشعار کا مدینہ میں مشہور ہونا تھا کہ گوشہ گوشہ تک یہ خبر پہنچ گئی کہ دارمی کسی سانولی لڑکی کے عشق میں جو سیاہ دوپٹے اوڑھتی ہے مسجد

لے ان اشعار کا مقہوم ہے:- اس سانولے رنگ کی لڑکی۔ جو سیاہ دوپٹے اوڑھتی ہے جا کر کہو کہ یہ تو نے ایک زاہد شب زندہ دار کا کیا حال کر دیا وہ تو اپنی تمام عمر عبادت و

نیایش کے لئے وقف کر چکا تھا کہ ناگہاں تو نظر آگئی اور نماز روزہ سب خاک میں ملا دیا۔ پھر تجھے اپنے دین و مذہب کا واسطہ سچ بتا کیا تو واقعی اس کو واقعی قتل کر دی گئی

سے باہر لگایا ہے اور مدنیہ کی کوئی بیچ لڑکی ایسی نہ تھی جو سیاہ رنگ کی اور ٹھنی کی طرف مائل نہ ہو گئی ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوداگر نے بہت کافی شفع سے سیاہ رنگ کے دوپٹے فروخت کئے اور اس وقت سے سیاہ دوپٹوں کا رواج شروع ہو گیا۔

سکے بند نہرے رنگ کے دوپٹوں کا رواج ہوا، جیسا کہ قاضی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو دارمی کے رنگ میں لکھے گئے تھے:-

قل للمیحة فی الخمار المذهب افسدت نسک فی التقی المترہب
نور الخمار و نور وجہک تحسہ عجباً لوجہک کیف لم یتہرب
وجعت بین المذہبین فلم ین للحسن عن ذہبہما من مذہب
واذا ات عین لتشرق نظرة قال الشعاع اذہبی لا تذہبی

بالوں کی آرائش کے سلسلہ میں وہاں منابرہ کا بھی رواج تھا جو عہد جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا اور عہد اسلام میں بھی عرصہ تک

باقی رہا۔ منابرہ کی صورت یہ تھی کہ بالوں کی مینڈھیاں گوندھ کر سر کے اوپر اس طرح باندھ لیتی تھیں کہ خراسانی اونٹ کی دو کوبالوں کی طرح وہ حصہ دو جگہ سے بند نظر آتا تھا۔ رسول اللہ نے اس سے بھی عورتوں کو باز رکھا کیونکہ اس وضع میں پہلے سر پر دوپٹہ وغیرہ پیشانی تک پٹیا جاتا تھا اور اس سے صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

بالوں کی ایک وضع جناب سکینہ بنت حسین کے نام پر ”طرہ سکینہ“ کے نام سے رائج ہوئی۔ جناب سکینہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ بالوں کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کی نہایت مشہور خاتون تھیں۔ آپ کو تزیین و آرائش کا خاص ذوق فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور بالوں کی زیبائش میں آپ نے ایک خاص اختراع کی جسے ”طرہ سکینہ“ کہتے ہیں۔ یہ وضع خواتین عرب میں بہت مقبول ہوئی یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے نہایت سختی سے اسے روکا۔

ایک وضع خلیفہ مہدی کی بیٹی علیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نہایت حسین و جمیل تھی اور فن شعر و موسیقی کی بھی بڑی ماہر تھی، لیکن پیشانی پر نمائی کی حد تک وسیع و کشادہ پائی تھی، اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جڑاؤ سر بند وضع کیا جس سے پیشانی ڈھک جاتی تھی۔ یہ وضع اتنی مقبول ہوئی کہ جس عورت کو دیکھئے سر بند سے پیشانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

بالکل اسی طرح فرانس کی ایک مشہور امیرزادی نے کیا جس کا نام (La Belle Froniere) تھا۔ اس کے وسط پیشانی میں آگ سے جل جانے کا داغ تھا۔ اس کو چھپانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ داغ کی جگہ ہیرا رکھ کر دونوں طرف ریشمی دھاگے سے باندھ کر سر میں لپیٹ لیا۔ اسپین کی ایک امیرزادی کی رائیں بہت موٹی تھیں اس نے ایک خاص لباس ایجاد کیا جس سے یہ عیب چھپا رہتا تھا، اسی طرح لونی نہم شاہ فرانس کی ایک لڑکی کے پاؤں بہت بھدے تھے اور ان کے چھپانے کے لئے اس نے لانسباگون اختراع کیا جس کا دامن زمین تک لٹکتا رہتا تھا اور پاؤں کو چھپائے رکھتا تھا۔ بعد کو یہ اوضاع تمام ملک میں رائج ہو گئیں۔

دور عباسیہ ترقی تمدن اور تہذیب مجلس و معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا عہد میں کہلاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں

اس قسم کی اختراعیں کثرت سے ہوئیں اور عورتوں کو اپنی تجبیل و تحسین کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ علی ابن ہشام کی ایک کینز (ریتیم) تھی جو بے انتہا خوبصورت و وضعدار تھی۔ اس نے سر کی ٹوپی میں فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تاکہ سر کے نہیں۔ اور پھر یہ کہ وضع عام ہوگئی یہ کینز ابن ہشام (اپنے مالک) کے قتل کا بھی باعث ہوئی، کیونکہ خلیفہ مامون نے یہ لونڈی علی ابن ہشام سے طلب کی تھی اور اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

عہد بنی امیہ میں دستی پنکھوں میں اشعار لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن عہد عباسیہ میں کپڑوں پر بھی عمدہ عمدہ فقرے اور اشعار لکھے جاتے تھے کمر اور سر کی وضع پیٹیوں قمیص کے دامنوں اور ٹوپوں وغیرہ پر بھی سونے کے ورق لگا کر اشعار نمایاں کئے جاتے تھے اور یہ ایجاد بھی عورتوں ہی نے کی تھی پھر یہ وضع صرف طبقہ امراء ہی تک محدود نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی کنواریاں بھی اپنی چادرول، پیٹیوں اور ملبوسوں میں اشعار منقوش کراتی تھیں۔ چنانچہ و شاعر لکھتا ہے کہ میں نے کلیسائے مریم میں ایک کنواری کو دیکھا کہ چاند کی طرح ہیکل سے باہر نکلی۔ اس کی کمر میں وضع پیٹی تھی اور اس پر یہ اشعار منقوش تھے:-

زار ہا فی خنر ہا لطر سب و ریجہا من طیبہا طیب
و وجہہا حسن من غلیہا و لونہا من لونہا اعجب

وضع کی ایجاد پر حوادث سیاسی اور اکتشافات اثری بھی متاثر ہوا کرتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی عورتیں ہر تاریخی واقعہ کی یادگار اپنے کپڑوں پر منقوش کر لیا کرتی تھیں۔ جب آٹھویں ہجری میں سنگ مرمر کے دو ستون (عہد فاطمی کے) دریافت ہوئے تو عورتوں نے اپنے ملبوس کی تراش میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو طول میں دو ستونوں سے مشابہ تھی۔ بعد کو یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس کا نام جبر العمود پڑ گیا۔

مصر کی عورتوں نے ایک اور وضع قمیص کی ایجاد کی جس کو بہطلہ کہتے تھے اور چونکہ اس میں بہت زیادہ صرف ہوتا تھا اس لئے حکومت نے مشکل تمام اس سے عورتوں کو باز رکھا۔ مقررہ نری کا بیان ہے کہ عورتیں اتنی بڑی بڑی قمیص بناتی تھیں کہ زمین تک لٹکتی رہتی تھی اور آستین تین تین گز کی ہوتی تھیں، ایک ایک ہزار درہم ایک قمیص پر صرف ہو جاتے تھے، پاجامہ یا ازار کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ وزیر منجک نے نہایت سختی سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ان کی آستینیں کاٹ کاٹ دیں، انکے کپڑے پھاڑ پھاڑ ڈالے اور بعض کو تو اس نے قتل بھی کر دیا جب کہیں جا کر یہ رسم وہاں سے اٹھی لیکن اس کے مرنے پر چند دن بعد پھر اس کا رواج ہو گیا چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ۹۲ھ میں بڑی آستین والی قمیصوں کے خلاف پھر احکام جاری کئے گئے۔ یہ آستینیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ہاتھ اٹھانے سے تمام گردن و شانہ، بلکہ سینہ اور پیٹ تک نظر آنے لگتا تھا۔

عرب شعراء کا اثر جمہوریہ

مکہ کی ایک نوجوان لڑکی مدینہ آتی ہے اور سنتی ہے کہ ”عمر بن ابی ربیعہ“ کا انتقال ہو گیا۔ واضح رہے کہ جرمنی کے شاعر ”شیلر“ کی طرح ”عمر بن ابی ربیعہ“ بھی صرف عورتوں کا شاعر کہلاتا تھا، اس نے اپنی ساری عمر اس جمیل و نازک جنس کی مدح و توصیف میں بسر کر دی تھی اور عرب کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے شعر کی دیوانہ نہ ہو۔ ہاں، تو جب اس لڑکی کو ابن ربیعہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو بری طرح رونے پٹنے لگی اور عربوں کی رسم کے مطابق اپنے نالہ و شیون سے گویا اس نے صفت ماتم بچھا دی، وہ روتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ کہ اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن و جمال کا راگ گائے گا۔ وہ سینہ کو پی کرتی تھی۔ اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی کہ اب کون ہے جو ہمارے صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کرے گا۔

لوگ جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ ”اس قدر غم نہ کر، عثمان بن عفان کا ایک پوتا موجود ہے۔ جو ابن ابی ربیعہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے وہ اس کی کو پورا کرے گا۔“ لڑکی نے یہ سن کر لوگوں سے کہا کہ ”اس کا کوئی شعر تو مجھے سناؤ“ جب لوگوں نے اس کے اشعار سنائے تو اس نے آنکھیں پونچھیں اور مسکرا کر بولی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی یادگار قائم کئے بغیر اس دنیا سے نہیں گیا۔“

جہاں بیتہ اور افاضل اسلام میں عورت و مرد دونوں آزادی سے باہم ملتے جلتے تھے، محافل و مجالس میں دونوں شرکت کرتے تھے تبادلوں کے ساتھ، تبادلوں جذبات و خیالات میں بھی آزاد تھے۔ اور ان کی قومی فطرت، ملکی افتاد اور معاشری خصوصیت کے لحاظ سے پمیل چل خطہ سے خانی ہوا کرتا۔ یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے۔ اور طواف میں بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا۔ جب ان میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ امارت و خودداری، غیرت اخلاق و تفریق مراتب کا جذبہ پیدا ہوا تو خلفاء و امراء نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا۔ لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے۔

سلیمان بن عبد الملک اموی کے خلافت کا زمانہ ہے، خالد بن عبد اللہ القسری مکہ کا سردار ہے کہ اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یا شعرا پہنچتے

یا حبذا موسم من موقت و حبذا الکعبۃ من مسجد

و حبذا الاتی یزاحمننا عندا استلام الحجر الاسود

(کیسا پیارا ہے یہ موسم، کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں یہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں)

خالد نے یہ اشعار سن کر کہا کہ خیر اب آئندہ سے وہ تم کو نہیں گھیریں گی۔ اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کر دیجائے اور سپاہی متعین کر دے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علیحدہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ جدائی جو اس وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے اور مرد و عورت دونوں ساتھ مل کر یہ فریضہ حج ادا نہیں کر سکتے۔

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہیں اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے بھی اچھے اعتناء نہیں۔ گھر میں اتنا سرمہ نہیں کہ سب کو بیٹھ کر کھلائے، شوہر ملتے نہیں کہ ان کے سپرد کر کے اس مصیبت سے نجات پائے۔ مگر وہ ایک شاعر (اشقی) کے پاس جاتا ہے اور اپنی داستان غم سناتا ہے۔ یہ فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوق عکاظ میں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سناتا ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ
الیٰ ضور نار بالبقاع تحرق

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ ختم بھی نہیں کر چکا کہ تینوں لڑکیاں شوہر حاصل کر لیتی ہیں۔

ایک طرف ان کی مدح و توصیف کا یہ اثر ہے اور دوسری طرف ان کی بھج و مذمت کا وہ رعب کہ خلیفہ وقت بھی ہزار درہم دے کر ایک شاعر سے اس کی بھج خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب فروخت کر دیتا ہے، صرف سیاہ نقاب باقی رہ جاتے ہیں۔ جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں زانو نشین ہو گیا تھا۔ مسکین الدارمی نے کہا میں کیا تیری مدد کر سکتا ہوں۔ تاجر نے کہا کہ ”جس طرح ممکن ہو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالنے والے میرا تمام مال پڑا رہے گا اور مجھے سخت نقصان ہوگا۔“ مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر اپنے لباس زرد و تقویٰ اتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی اسی حال میں وہ مسجد سے باہر آگیا اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو باکر سنا دو:-

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود
ماذا فعلت براہب متعبد
قد کان شمر للصلاة شیابہ
حتى خمرت له باب المسجد
ردی علیہ صلاتہ وصیامہ
لا تقلیہ بحق دین محمد

اُس معشوقہ بلج رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہہ دو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لئے ایک گوشہ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ دفعتاً سامنے آگئی اور نماز و روزہ سب غارت کر کے رکھ دیا پھر ہلے حسینہ تجھے واسطہ ہے دین محمد کا، کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اس کو قتل کر دے۔

جس وقت یہ اشعار مدینہ کے گلی کوچوں میں پہنچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر آ گیا ہے اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہ گئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب اس وقت کے فیشن میں داخل ہو گیا۔

ہشام بن عبد الملک کی خلافت کا زمانہ ہے۔ اور خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم ہے، اس وقت تک عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے۔ اور ان پر کھڑے ہو کر موزن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہنچ گئے:

لِتَنِي فِي الْمَوْزِنِ حَيَاتِي انْهَمِ بِصُرُونِ مَنْ فِي السُّطُوحِ

فَيْشِيرُونَ أَوْ تَشِيرُ إِلَيْهِمْ بِالْهَوَى كُلِّ ذَاتِ دَلِّيلِيحِ

(کاش میں بھی ان موزنوں میں سے ہوتا جو اونچے مناروں پر کھڑے ہو کر آس پاس کے چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشق و ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں)

ان اشعار کے سننے کے بعد ہی خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دئے جائیں۔

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ٹھیک اس وقت ابن الاطناہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہنچتا ہے:-

أَبْتَ لِي عَفْتِي وَابْنِي بِلَائِي وَافْتَدَى الْحَمْدُ بِالْقَتْلِ الرِّجِ

اور وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ حملہ کر کے دشمن کو شکست دیتے ہیں۔

رشید کو جس چیز نے نفور ملک روم کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صرف یہ شعر تھا:-

عَذْرُ الَّذِي أَعْطَاكَ نَفْصُور فَعَلِيهِ دَائِرَةُ الْبُورِ تَدُورُ

خلیفہ سفاح ستر امراء بنی امیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا، کھانے کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعۃً ایک شاعر اندر آتا ہے اور منظم بنی امیہ کا ذکر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے:-

أَذْكَرُ وَأَمْرَعُ الْحَمِينَ وَزَيْدَا

وَقَتِيلَا بَجَانِبِ الْمَهْرِ اس

سفاح یہ سنتے ہی برہم ہو جاتا ہے اور تمام امراء بنی امیہ کو قتل کرا دیتا ہے۔

ایکبار اسی خلیفہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام اموی بیٹھا ہوتا ہے۔ کہ سداقیق شاعر آتا ہے اور کہتا ہے:-

لا یغترک ماتری من رجال، ان تحت الضلوع دار دوتیا

نضع السیف وارفع اسوحتی لاتری فوق ظہرہا امویا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفاح فوراً سلیمان کو قتل کر دیتا ہے۔

رشید مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ جس وقت جلاد اس کو قتل کے لئے سامنے لاتا ہے اور گردن جھکا دیتا

ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ اشعار نکلتے ہیں:-

اری الموت بین لقطع والسیف کائناً یلا حظنی من حیثما اتلفت

وما بی من خوف اموت واننی لا علم ان الموت شی موقت

ولکن خو فی صبیۃ قد ترکتہم واکبا دہم من حمرۃ تفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ”میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا“

عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قبیلہ کے افراد نہایت فخرور سے اپنی نسبت اس قبیلہ سے

ظاہر کرتے تھے، لیکن جب شاعر جریر نے اس قبیلہ کی بھومیں یہ شعر کہا کہ:-

فغض الطرف انک من نمیر فلا کعبا بلخت ولا کلا با

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو وہ نمیر کا نام چھوڑ کر کئی اور پر کی شبتوں

کے نام بتاتا یہاں تک کہ آخر کار اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا۔

بر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ہر قوم کی سیاسیات کا مخصوص اقتضا ہوتا ہے اور ہر سرزمین اپنی معیشت و معاشرت

کے احوال کے لحاظ سے ذہن انسانی کی تربیت کرتی ہے۔ ہندوستان جو ہمیشہ سے غیر الکی تانت کا مرکز بنا رہا یقیناً یہاں کے لوگوں میں

کوئی جذبہ حماست پیدا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے شاعری کا یہ قہرمانی عنصر جو دنیا میں انسان کو سکندر و تہنی بال بنانے میں مدد دیتا

ہے یوں ختم ہو گیا، لیکن مظلومیت و مظلومیت سے جو کیفیت پیدا ہو سکتی تھی وہ ضرور انتہا کو پہنچ گئی۔ اور یہ نکبت و ذلت، انحطاط

و ادب و قوی زندگی کا ایک ضرور جزو ہو کر رہ گیا حتیٰ کہ یہاں کا بہترین قہرمان وہی مانا گیا جس میں سب سے زیادہ یاس و حراں کا اظہار

تھا۔ چنانچہ تیر کو خدا نے مغزیں کہنے کی علت یہی ہے کہ ان سے زیادہ کسی نے اپنی بیکاسی و بیچارگی، محرومی و مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔

یہاں کی حماسی شاعری کا بڑا سرا یہ مرثیہ کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن آپ کسی بہترین مرثیہ گو کلام اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا

کہ اس کا قابل ذکر حصہ وہی ہے جہاں اس نے فریاد و شہوان سے کام لیا ہے۔ ورنہ جہاں اس نے جوش مردانہ سے کام لینے کی کوشش

کی وہیں وہ منہ کے بل آ رہا۔ یہاں تک کہ اگر وہ تلوار واسپ کی تعریف کرتا ہے تو اس طرح گویا کسی عروس کا حال بیان ہو رہا ہے اور جب وہ حرب و دفاع کا بیان کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے، بیڑوں کی پالی کا ذکر ہو رہا ہے۔

آپ مراٹی کا تمام ذخیرہ ڈھونڈ ڈالئے۔ لیکن آپ کو عربی کے اس ایک شعر کا بھی جواب کہیں نہ ملے گا۔

کان مشار النقع فوق رؤسنا واسیا قنائل سقاوی کوالبہ

(یعنی میدان جنگ میں جو گردوغبار سروں پر اٹ کر رہ گیا تھا تو اس میں تلواروں کی چمک ایسی نظر آتی تھی جیسے رات کو ستارے

ٹوٹ رہے ہیں)

اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جنگ کی حقیقت سے واقف تھے، قبائلی غیرت و خودداری ان کو ہمیشہ حرب و دفاع کے لئے آمادہ رکھتی تھی اور یہ وہاں روز کا منظر تھا کہ اگر کوئی خاتون و بالغہ آہ کہ کر ایک بار پیچ پڑی، تو سارا قبیلہ تلواریں سوت سوت کر باہر آگیا اور

جب تک انتقام نہیں لے لیا واپس نہیں گئے۔ پھر یہی وہ حقیقت تھی جو ان سے یہ شعر کہلوا دیتی تھی کہ

قابوا بالرمح مکسرات وابنا بالیسوت قد انحننا

(وہ لوگ واپس گئے اس طرح کہ ان کے نیزے ٹوٹے ہوئے تھے اور ہم واپس ہوئے اس حال میں کہ ہماری تلواریں

خم ہو گئی تھیں)

اور اسی حقیقت کا فقدان تھا جو ہندوستان میں حماسی شاعری پیدا نہ کر سکا۔

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیل انسانیت

”من ویزوال“

مولانا نیاز فتحپوری کی۔ ہم سالہ در تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے

تمام نوع انسانی کو ”انسانیت کبریٰ“ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور صحابیات مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور

نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند افشار اور پُر زور خطیبانہ افکار میں یکگئی ہے۔ خدمات ۱۹۷۲ء، صفحات ۱۰۰۔ مجلد قیمت مروجہ علاوہ محمول

گرد و پیش آگین مینبر نگار ہلال کبشی لکھنؤ کاغذ سفید و دبیر

عہد اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے اور اس کی ابتداء کا سراغ اس وقت سے چلتا ہے۔ جب دو افراد انسانی میں سے ایک نے اپنے کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ مغلوب و کمزور پر حکومت کرے، اس کو ستائے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اس سے اپنی قوت کا اعتراف کراتا رہے۔

اس لئے دنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ جب اول اول انسان میں قبائلی زندگی کا آغاز ہوا اور سرداران قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی اس لئے دنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیران جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے، البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کو یہ رواج اس قدر وسیع ہوا کہ زلمانوں، صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا۔ جہاں یہ رسم قائم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہل اشوریا، ہندوؤں، چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قائم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔

اہل عرب عہد جاہلیت میں اسیران جنگ کو بھی غلام بناتے تھے۔ اور ان کو بھی جنہیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش وغیرہ کی طرف سے لوٹتی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے۔ اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت وہ اسی طرح کرتے تھے جیسی دوسری چیزوں کی، چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جعدان عہد جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد اول) وہاں غلام بطور ہدیہ کے بھی دئے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی

شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح رستی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف لابن قتیبة ص ۱۱۲) قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابولہب اور عاصی بن ہشام نے آپس میں

جُو اُکھیللا اور شرطیہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابو لہب جیتا اور اُس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر اونٹ چرانے کی خدمت اس سے لی (الافغانی ص ۱۰۰ ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا۔ اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے دفعۃً نہیں مٹایا جاسکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے اس لئے اسلام فوراً اس کو بند تو نہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے بعض اصول و قوانین ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مذموم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا رونا ہونا لازم تھا۔ چنانچہ بردہ فروشی کے دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیران جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا، اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعہ آرک کے بعد ایک ایک درہم میں نوٹدی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر و غیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کو شش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:-

”من کانت لہا جاریۃ فلعلمہا و احسن الیہا و تزوجہا و کان لہا اجر ان

اجر بالزواج و بالتعلیم و اجر بالعق

یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کرے گا تو اس کے لئے

دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی۔ کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

نوٹریوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی۔ اور عربوں کے حالات و افتاد طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیل کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ نوٹریوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں کتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کس قدر کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا۔

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا حق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی، البتہ

سلطنت اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کر دیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیاست کی اور بہت سی ناجائز خواہشات کی طرح بدستور قائم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی و دماغی و معاشرتی حالت میں بہت ترقی ہوئی۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہتی تھی۔ جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت عمران و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قائم ہوا گویا کہ وہ بھی زر و جواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ کسی امیر کو صنعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صنائع کنیز پیش کی جاتی تھی اور اگر جمال و غنا کی طرف کوئی خلیفہ مایل ہوتا تھا تو انہیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈ بھی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہو گیا۔ اور عہد بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے۔ کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء عہد نکاح کر لیتے تھے تو انہیں آزاد کر دیتے تھے اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۱۰۰ کنیزیں تھیں (المسعودی ص ۲۴۹ ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰ جن میں سے ۱۰۰ باب نشاۃ میں شامل تھیں، اور گائے بجانے کی ماہر تھیں (الاغانی ص ۸۸ ج ۲) محض زینت و آرائش اور نمائش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور ام جعفر برکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف اس لئے تھیں کہ ان سے نشان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلاد ترک و صقلیہ، ہند، آرمینیا، روم اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لئے یہاں بڑے بڑے بازار قائم تھے، جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت، نہایت کثرت سے ہوتی تھی بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا۔ اور اس کا نام ”سوق الرقیق“ یا ”سوق النخاسین“ تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمرو رنگ، زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علحدہ علحدہ رکھی جاتی تھیں۔ یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلیہ، ایران، ارمینیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طایف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کر دی جاتی تھیں یہ بالکل عربی حالت میں لائی جاتی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے اور زینت و آرائش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبعی حسن جو صنعت آرایش سے علحدہ ہو۔ ہر شخص کو معلوم ہو سکے، بڑے بڑے

اجزان کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کر کے مختلف دامنوں میں خرید لیتے تھے۔ اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے انکو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر کے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ عہد اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست دان عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو ان کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نوگرفارہر فی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد مکلف لباس سے آراستہ، اور فن و لہجہ کی گھاتوں سے واقف ہو کر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمہ شیریں، نگاہوں میں دلربا یاد افسوں اور جسم میں حرکات رقص کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقہ امرا میں تہلکہ مچ جاتا اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتی تھی۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اہل عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے۔ وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا تھا بلکہ ان کو ہند و شائستہ بنانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں جس قدر وحشی و نا تراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں۔ ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں۔ اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام، اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالا مال ہیں۔

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے فروخت کی جاتی تھیں۔ یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہو جاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہو جاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے:-

”یا تجار، یا ارباب الاموال، ہا کل مدور جوڑة، وکل مستطيلة موزة ولاکل حمراء لحمہ
ولاکل بیضاء شحمہ، ولاکل صہبا و خمرہ ولاکل سمراء قمرہ، یا تجار، ہذہ الدرہ
الیتیتمہ اللتی راقضی الاموال لھا بقیمتہ کم تفتخون باب الشمن۔“

(اے تاجرو! اے دولتمندو! ہر گول چیز خریدو، ہر مستطیل چیز کیلا ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں کھلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر مدور چیز کچور۔ اے تاجرو! یہ ایک بے بہا موقی ہے کہ نہ خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بناؤ کہ تم کیا قیمت اس کی نکالتے ہو)۔

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار کسی طرف سے

لے ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے۔ صاحب آغانی نے چار ہزار گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے۔ جن کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے:- ”من کان لھا، لھا“ (یعنی جو ہمارا ہے ہم اس کے ہیں) ”وضع الخلد للصدوی عز“ (شرط محبت سے گال پر گال رکھ دینا کس قدر پیاری بات ہے)

چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ قریبے بہا پاجاتا اور اپنے گھر کو چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہل رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آکر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہل عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد دکتا میں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں، اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، اور کمر بن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے ضلالت ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ ”التجارة في الرقيق احمقہ“ (یعنی بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو کپڑا کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہل لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہل روم کا دستور تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہین قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے، ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے اور پھر بازار میں لاکر سو کے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طائف وغیرہ کی کنیزیں) کہ ان کی گرائی کی تو کوئی اتہان نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ درہم ادا کی (ابن خلکان ص ۱۰۲ ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبد الملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفہ کی قیمت ستر ہزار درہم ادا کی (الطبری ص ۱۳۳ ج ۱۲)۔

جعفر برکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خریدی (العقد الفریۃ ص ۳۰۳ - ج ۳) ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے غدر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بہت المالی کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۵۰ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا۔ یہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بجا صرف کیا تھا۔ ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید لیا جائے۔ جعفر نے انکار کیا۔ تو امین نے برہم ہو کر دوسرا حکم دیا کہ سوئے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اور ۲ کروڑ درہم ادا کئے گئے۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا تھا۔ اور اتنا زبردست اثر ان کا خلفاء پر قائم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی۔

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے، سب پر ظاہر ہے۔ رشید کی ماں خیر زان خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ التریکیہ لونڈی تھی۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔

انقرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء ان کے غلام تھے۔

”نگار“ کے خاص نمبر

ریاض نمبر	=	۱	صحیفی نمبر	=	۱
قرآن نمبر	=	۲	تفسیر نمبر	=	۳
انتقادیات نمبر (دو حصے)	=	۴	غزل گو شعراء نمبر	=	۵
ماجدولین نمبر	=	۶	انتقاد نمبر	=	۷

نگار ہیکل ایسی ہی لکھنؤ

پیشبردن کے لطایف

مذہبان نبوت تین طرح کے ہوئے ہیں، ایک وہ جو واقعی ملک قوم کی اصلاح کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور باوجود موافق کے انہوں نے اپنے مشن کی تبلیغ کی اور آخر کار وہ کسی نہ کسی طرح اس میں کامیاب ہوئے۔

دوسری قسم میں وہ ہیں جنہوں نے صرف اس لئے دعوائے نبوت کیا کہ وہ دنیاوی جاہ و حشم اور دولت و ثروت کے خواہشمند تھے اور اپنی قوم یا قبیلہ میں خاص مرتبہ رکھنے کی وجہ سے انہوں نے کچھ دن نبوت کا بھی مزہ اٹھایا، تیسری قسم ان مذہبان نبوت کی تھی جو محض لطف و تمسخر کی بنا پر نبی بن بیٹھے اور ان کی نبوت ایک لطیفہ بن کر رہ گئی۔

قسم اول کے انبیاء کا ذکر اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور نہ اس میں کسی لطایف کا گزر۔ قسم دوم میں طلحہ اسودعی کے علاوہ میلہ اور سجاد بنت حارث نے کافی شہرت حاصل کی، اور اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ ان دونوں نے ایک ہی وقت میں نبوت کا دعویٰ کیا اور بالآخر دونوں کی مواصلت پر یہ کیلین ختم ہو گیا۔

مردوں میں تو خیر متعدد نام ایسے گنائے جاسکتے ہیں، جو نبوت کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن عورتوں میں غالباً ایک سجاد ہی ایسی تھی جس نے نبیہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اخیر عمر میں اسلام لائی۔

تیسری قسم انبیاء کی بہت پُر لطف تھی اور انہیں کے لطایف آج ہم بیان کرتے ہیں جو مولانا شرر کے ایک مقالہ سے لئے گئے ہیں۔

دو عباسیہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسلامی حکومت کا بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ علم و فضل اور تہذیب و شائستگی کا کوئی پہلو اور جاہ و امارت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو انتہائی عروج تک نہ پہنچا ہو۔ اور جب کسی قوم کا تمدن اتنا وسیع و بلند ہو جاتا ہے تو اس میں اُپچے کی بھی کمی نہیں ہوتی، چنانچہ ایک خاص اُپچے لوگوں میں یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نبوت کا دعویٰ کرنے لگے ملک میں مشہور ہو جائیں اور اس طرح دربار عباسیہ تک ان کی رسائی ہو جائے۔

ماموں رشید کا زمانہ ہے اور ایک نہ دو، اکٹھے دس مذہبان نبوت شاہی حراست میں قصر شاہی تک جا رہے ہیں، راستہ میں تماشا میوں کا ہجوم ہے اور بہت کم لوگ واقف ہیں کہ یہ اچھے خاصے مہذب و شایستہ بڑھے لکھے انسان شاہی باڈی گارڈ کے ساتھ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔

انہیں تماشائیوں میں سے ایک شخص یہ سمجھ کر کہ غالباً یہ لوگ کہیں دعوت میں جا رہے ہیں خود بھی ان کے غول میں شریک ہو گیا۔ امون الرشید کے سامنے جب یہ لوگ پیش کئے گئے اور ان کا شمار ہوا تو یہ بجائے دس کے گیارہ نکلے۔ اس پر رب کو حیرت ہوئی لیکن کوئی زیادہ کاوش اس باب میں نہ کی گئی اور ان سب کے قتل کا حکم صادر کیا گیا۔

اب یہ شخص بہت گھبرایا اور بولا کہ ”آپ مجھے کیوں قتل کرتے ہیں“ ماموں نے پوچھا ”کیوں، کیا تم نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا؟“ وہ بولا: ”جی، کہاں کی نبوت، اور کیسی رسالت، میں تو یہ سمجھ کے ان کے ساتھ ہو لیا تھا کہ یہ کہیں دعوت میں جا رہے ہیں، مجھے دعوائے نبوت سے کیا واسطہ؟“ یہ سن کر ماموں ہنستے ہنستے بیتاب ہو گیا۔

خلیفہ مہدی عباسی کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جب گرفتار ہو کر خلیفہ کے سامنے لایا گیا تو پوچھا گیا ”تم نبی ہو؟“ بولا: ”جی ہاں۔“ پھر سوال کیا گیا کہ: ”تم کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو؟“ بولا کہ: ”تم نے کسی کے پاس مجھے جانے ہی نہیں دیا، نام لوں، تو کس کا، ادھر میں نے دعویٰ کیا اور ادھر تم نے مجھے پکڑ کر قید خانہ بھیج دیا۔“

ایک بار کسی شخص نے بصرہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہاں کا حاکم اس وقت سلیمان بن علی تھا۔ جب یہ شخص گرفتار ہو کر حاکم بصرہ کے سامنے لایا گیا تو اس سے سلیمان نے پوچھا: ”کیا تم خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو؟“ اس نے جواب دیا: ”جی، اس وقت تو قیدی ہوں۔“

سلیمان: ”مکنت تجھے کس نے نبی بنایا؟“

—: ”کیا پیغمبروں سے ایسی ہی گفتگو کی جاتی ہے، کیا کروں مجبور ہوں کہ اس وقت قید میں ہوں، ورنہ جبرئیل کو حکم دیتا کہ تم سب کو ہلاک کر ڈالیں۔“

سلیمان: ”کیا قیدی کی دعا قبول نہیں ہوتی؟“

—: ”جی اور کیا، خصوصاً انبیاء کی دعا تو قید کی حالت میں اوپر جاتی ہی نہیں۔“

سلیمان نے ہنس کر کہا: ”اچھا میں تمہیں چھوڑے دیتا ہوں، آزاد ہونے کے بعد جبرئیل کو حکم دو اور اگر انھوں نے تمہارا حکم مانا تو ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے۔“ وہ یہ سن کر بولا: ”خدا پر فرماتا ہے: ”فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب لایم“ (یعنی جب تک عذاب کو دیکھ نہ لیں گے ایمان نہ لائیں گے)۔

سلیمان یہ جواب سن کر ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

مامون الرشید کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا۔ جب یہ گرفتار ہو کر سامنے لایا گیا تو ثمامہ بن اشرس نے کہا اگر اجازت ہو تو میں اس شخص سے گفتگو کروں۔ مامون نے اجازت دی۔
ثمامہ: ”تم اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتے ہو، لیکن ان کے پاس تو نبوت کی دلیلیں تھیں، تمہارے پاس کوئی دلیل ہے۔“
”ابراہیم کے پاس کوئی دلیلیں تھیں۔“

ثمامہ: ”وہ آگ میں ڈالے گئے اور آگ انھیں نہ جلا سکی، ہم تمہارے لئے بھی آگ روشن کراتے ہیں اور اس میں تمہیں ڈالتے ہیں اگر تم نہ جلتے تو بیشک یہ تمہاری نبوت کی دلیل ہوگی۔“

یہ سن کر وہ بولا کہ: ”یہ تو بہت مشکل ہے، کوئی اور آسان صورت تجویز کرو۔“

ثمامہ: ”اچھا تو پھر کوئی ویسی ہی دلیل پیش کرو جیسی حضرت موسیٰ نے پیش کی تھی۔“

اس نے پوچھا: ”موسیٰ کے دلائل کیا تھے۔“ ثمامہ نے جواب دیا کہ: ”ان کے پاس ایک عصا تھی جو زمین پر ڈالنے سے اثر دیا بن جاتا تھا۔“ یسکر بولا کہ ”یہ بھی مشکل ہے، اس سے زیادہ کوئی آسان صورت بتاؤ۔“

ثمامہ: ”تو پھر حضرت عیسیٰ کی سنی نشانی پیش کرو۔“

اس نے پوچھا: ”ان کی نشانیاں کیا تھیں۔“

ثمامہ: ”وہ اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے اور مردہ کو زندہ۔“

یسکر وہ بولا کہ ”واہ، یہ تو اور زیادہ مشکل بات ہے، میں آسان صورتیں پوچھتا ہوں اور تم انھیں اور زیادہ مشکل کرتے جاتے ہو۔“

ثمامہ: ”تو پھر تمہیں کوئی صورت بتاؤ، تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو کوئی ثبوت دینا ہی پڑے گا۔“

اس نے کہا: ”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، میں نے جبریل سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے شیلانوں کے پاس بھیجے ہو تو کوئی دلیل بھی دو، لیکن وہ اس پر بگڑ گئے، بہر حال میں مجبور ہوں، اس لئے اگر بغیر کسی دلیل کے مجھے نبی مانتے ہو تو مانو، ورنہ جانے دو۔“
جھگڑا ہی کیا ہے؟

خلیفہ مہدی منہس پڑا اور اسے رہا کر دیا۔

خلیفہ مہدی کے پاس ایک اور شخص اسی طرح کالایا گیا۔ مہدی نے پوچھا: ”تم کب مبعوث ہوئے؟“ بولا: ”آپ کو اس سے کیا بحث کہ میں کب مبعوث ہوا۔ کیا نبوت تاریخ کی پابند ہوتی ہے۔“

مہدی نے پھر سوال کیا کہ ”تمہیں کہاں نبوت ملی۔“ بولا: ”خدا کی قسم یہاں تو ایسی باتیں پوچھی جا رہی ہیں، جن کا ثبوت سے کوئی تعلق ہی نہیں، سنئے، اگر آپ میری نبوت مانتے ہیں تو مانئے ورنہ اپنے گھر خوش رہئے، لیجئے یہ ہیں چلا۔“

ایک دن عبداللہ بن عازم، دجلہ کے پُل کے پاس اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ لوگ ایک شخص کو پکڑ کر لائے اور کہا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

عبداللہ نے پوچھا ”تم پیغمبر ہو“ بولا ”جی ہاں“ پوچھا ”کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو“ بولا ”کسی پر ہوا ہوں تمہیں کیا، میں شیطان پر مبعوث ہوا ہوں۔“ یہ سنکر عبداللہ سنہنس پڑے اور کہا کہ ”اسے چھوڑ دو، شیطان کے پاس جائے۔“

نمامہ بن امیر کہتے ہیں کہ میں قید میں تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مہذب و شایستہ انسان قید خانے میں لایا گیا اسوقت میرے ہاتھ میں شربت کا پیالہ تھا، اسے دیکھ کر میں اس قدر متحیر ہوا کہ پیالہ منہ سے لگانا بھول گیا اور اس سے پوچھا: ”آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ کو کس جرم میں مقید کیا گیا؟“

بولا: ”یہ بد معاش مجھے پکڑ لائے ہیں اور محض اس قصور پر کہ میں نے سچی بات ظاہر کی، میں نبی مُرسل ہوں۔“

یہ سنکر میں متعجب ہوا اور بولا ”کوئی معجزہ بھی آپ کے پاس ہے؟“ اس نے جواب دیا کہ ”جی ہاں میرے پاس سب سے بڑا معجزہ ہے“ پوچھا ”کیا“ بولا کہ ”کسی حسین عورت کو لایا، میری دعا سے وہ جائے گی اور اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو میری نبوت کی تصدیق کرے گا۔“

نمامہ یہ سنکر مشکل سے منہ ہی ضبط کر سکے اور کہا ”صلی اللہ علیہ وسلم اور پیالہ پیش کر کے کہو: ”لیجئے اسے نوش فرمائیے۔“

محمد بن عتاب کا بیان ہے کہ میں نے ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک روز شہر رقہ میں دیکھا کہ لوگ ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہیں جو صورت سے بہت مہذب معلوم ہوتا تھا، پوچھا ”اسے کیوں گھیرے ہوئے ہو“ لوگوں نے کہا ”یہ پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے“ میں نے کہا ”تم غلط کہتے ہو، ایسے شخص سے ایسا فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ یہ سن کر اس نے بگڑ کر مجھ سے کہا: ”تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں“ میں نے کہا ”تو کیا تم نبی ہو“ بولا ”بیشک“ میں نے کہا ”اس کی دلیل؟“ بولا ”دلیل یہ ہے کہ تم واد الزنا ہو۔“ میں نے ضبط کر کے کہا کہ ”بھلا پاکدامن عورتوں پر زنا کا اتہام لگانا پیغمبروں کا کام ہے؟“ بولا ”ہاں تو اسی فریض سے نبوت ہوا ہوں۔“ میں نے کہا ”تو مجھے تمہاری نبوت سے انکار ہے“ بولا ”انکار ہے تو اپنے گھر خوش رہو۔“ اس نے کسی نے اسے چند سنگر فریے کھینچ مارے جن سے وہ زخمی ہو گیا اور بولا ”یہ فعل ناص ابن زنا ہے کاسہ“ اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہنے لگا۔ ”تم نے اچھا نہ کیا جو ان جاہلوں کے ہاتھ میں مجھے دے دیا۔“

مامون کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مامون نے قاضی یحییٰ بن اہتم کو ساتھ لیا اور کہا ”چلو، اس شخص سے جھگڑ کر میں اور دیکھیں کیا کہتا ہے۔“

چنانچہ دونوں بھیس بدل کر اس کے پاس پہنچے اور کہا کہ ”ہم دونوں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کے ہاتھ پر ایمان لائیں۔“ اس نے کہا ”تو آؤ بیٹھو۔“ اجازت پا کر ماموں اس کے داہنے ہاتھ اور قاضی کی بی بی بائیں ہاتھ بیٹھ گئے۔ ماموں نے پوچھا ”آپ کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔“ بولا ”ساری دنیا کے لئے۔“ پوچھا ”تو کیا آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، یا القا ہوتا ہے، یا فرشتہ آکر آپ سے گفتگو کرتا ہے۔“ بولا ”فرشتہ گفتگو کرتا ہے۔“ پوچھا ”کون فرشتہ آتا ہے۔“ بولا ”جبریل۔“ پوچھا ”اس سے پہلے کب آئے تھے۔“ کہا ”ابھی ابھی تمہارے آسنے سے پہلے وہ موجود تھے۔“ پوچھا ”تو تم پر اس وقت کیا وحی آئی۔“ بولا ”یہی کہ انقریب میرے پاس دو شخص آئیں گے ایک میرے داہنے طرف بیٹھے گا، دوسرا بائیں طرف اور جو بائیں ہاتھ بیٹھے گا وہ دنیا کا سب سے بڑا لوطی ہوگا۔“ (قاضی صاحب اس باب میں بدنام تھے) ماموں پکڑ کر ہنسی ضبط نہ کر سکا اور کہا ”اشہد انک رسول اللہ“ (میں تمہاری رسالت پر ایمان لاتا ہوں)

کوڈ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک دن میرے ایک دوست آئے اور کہا ”تم نے کچھ اور بھی سنا، یہاں ایک پیغمبر صاحب پیدا ہوئے ہیں، چلو ذرا ان سے ملے دیکھیں، وہ کیا کہتے ہیں۔“ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں اس نبی کے مکان پر پہنچے۔ یہ ایک نہایت ہی بد صورت خراسانی بڑھا تھا اور بھنگا بھی تھا، میرے دوست کاٹے تھے، انھوں نے کہا ”تم چپ رہو، میں گفتگو کرتا ہوں۔“ میں نے کہا ”بہتر“ اب اس سے ان دوست نے پوچھا ”جناب کا کیا دعویٰ ہے۔“ بولا ”میں نبی ہوں۔“ پوچھا ”دلیل۔“ بولا ”دلیل یہ کہ تم کاٹے ہو، اگر اپنی دوسری آنکھ نکال کے اندھے ہو جاؤ، تو میں اسی وقت دعا کر کے تمھیں اچھا کر دوں گا۔“ میں نے ہنسی روک کر کہا کہ ”پیغمبر صاحب آپ نے بات معقول کہی، لیکن یہ مانے گا نہیں۔“ میرے دوست نے مجھ سے کہا ”تو تمھیں اپنی آنکھیں پھوڑ کے کیوں نہیں امتحان لیتے۔“ اس کے بعد ہم دونوں ہنستے ہوئے گھر چلے آئے۔

ایک بار ماموں کے پاس کسی مدعی نبوت کو پیش کیا گیا، پوچھا ”تمہارے پاس کوئی معجزہ بھی ہے۔“ بولا ”جی ہاں، میں آپ کے دل کی بات بتا سکتا ہوں۔“ ماموں نے کہا ”اچھا بتاؤ، اس وقت میرے دل میں کیا ہے۔“ بولا ”اس وقت آپ کے دل میں یہ ہے کہ یہ شخص بڑا جھوٹا ہے۔“

ماموں نے کہا ”یہ تو تم نے سچ بتایا“ اور اسے قید خانہ بھیج دیا۔ چند روز بعد پھر بلوایا اور پوچھا ”اس درمیان میں کوئی وحی تم پر نازل ہوئی یا نہیں۔“ بولا ”نہیں۔“ پوچھا ”کیوں۔“ کہا ”اس لئے کہ قید خانے میں فرشتے نہیں آتے۔“

مامون منہس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

مامون کے پاس آذربائیجان سے ایک مدعی نبوت گرفتار کر کے لایا گیا۔ مامون نے اپنے محل کے داروغہ ثامہ کو حکم دیا کہ اس سے باتیں کرے۔

ثامہ نے پوچھا کہ :- ”متخاری نبوت کی کیا دلیل ہے؟“ بولا :- ”تم اپنی چورو کو میرے پاس بھیجو، اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو گہوارہ ہی میں میری نبوت کی تصدیق کرے گا۔“

ثامہ نے کہا :- ”جناب میں بغیر کسی دلیل کے آپ کو نبی مانتا ہوں، اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنْكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ مامون نے کہا :- ”تم تو چھوٹے ہی ایمان لے آئے۔“ ثامہ نے عرض کیا ”امیر المؤمنین کا تو کچھ بگڑے گا نہیں، اور میں بے آبرو ہو جاؤں گا، جسے اپنی بیوی سے دست بردار ہونا ہو، وہ ان کی نبوت میں شک کرے۔“

مامون منہس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ایک بار ہارون الرشید کے دربار میں ایک مدعی نبوت پیش کیا گیا۔ رشید نے پوچھا تو بولا ”جی ہاں، میں نبی کریم ہوں“ پوچھا :- ”دلیل“ بولا :- ”آپ جو فرمائیں“

رشید نے کہا :- ”میں چاہتا ہوں کہ یہاں جتنے بے ریش و بیروت غلام کھڑے ہیں، ان سب کے اسی وقت داڑھیاں نکل آئیں“ جواب دیا :- ”بھلا، اس میں کیا خوبی ہے کہ ان کے خوبصورت چہرے داڑھی نکال کے خراب کئے جائیں، ہاں یہ معجزہ دکھا سکتا ہوں کہ یہاں جتنے داڑھی والے اس وقت موجود ہیں، ان سب کی داڑھیاں غائب کر دوں۔“ یہ سنکر رشید بہت ہنسا اور اسے انعام دے کر رخصت کر دیا۔

ایک اور مدعی نبوت کو مامون کے سامنے لایا گیا اور جب اس سے معجزہ طلب کیا گیا تو کہا ”میں سنگرنیزے پانی میں ڈالتا ہوں، اگر گھل جائیں تو جانتے میں سچا نبی ہوں۔“

مامون نے کہا :- ”منظور“۔ اس نے ایک گٹورے میں پانی بھر کر سب کے سامنے سنگرنیزے ڈالے تو وہ گھل گئے۔ مامون نے کہا :- ”اصلی سنگرنیزے نہ تھے، ہم جو سنگرنیزے دیں، انہیں گھلا دو تو جائیں۔“ بولا :- ”نہ تم فرعون سے بڑے ہو اور نہ میں موسیٰ سے۔ فرعون نے موسیٰ سے کب کہا تھا کہ تمہارے عصا کی سنہ نہیں، ہم جو عصا دیتے ہیں اسے اڑدینا تو جانتے ہیں۔“ مامون اس لطیفہ پر بہت ہنسا اور اسے انعام دے کر رخصت کر دیا۔

خلیفہ معتمد باللہ کے پاس ایک مدعی نبوت گرفتار کر کے لایا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا: ”تم کس کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو؟“ بولا: ”آپ کی ہدایت کے لئے“۔ معتمد بولا: ”تو میں گواہی دیتا ہوں کہ تم کینے اور احمق ہو۔“ بولا: ”جی ہاں“۔ یہ قواعد ہی ہے کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی پیغمبروں کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔
یہ جواب سنکر معتمد ہنس پڑا اور اسے رہا کر دیا۔

ماموں کے پاس ایک مدعی نبوت لایا گیا، تو ماموں نے کہا کہ ”اگر تم نبی ہو، تو اسی وقت ایک خر بڑہ لا کر پیش کرو۔“ اس نے کہا: ”تین دن کی مہلت دیجئے“۔
ماموں نے کہا: ”مہلت نہ دیجئے گی۔“ بولا: ”یہ کوٹنا انصاف ہے کہ خدا تو کم از کم چھ مہینے میں خر بڑہ پیدا کرتا ہے اور میں اسی وقت پیدا کروں۔“

خلیفہ مستوکل کے زمانہ میں ایک عورت پکڑ کر لائی گئی پیغمبر ہونے کی مدعی تھی۔
مستوکل نے پوچھا: ”تو نبیہ ہے؟“ بولی ”جی ہاں“ پوچھا ”تو محمد کو بھی رسول مانتی ہے یا نہیں؟“ بولی ”کیوں نہیں؟“
مستوکل نے کہا: ”جب تو انھیں مانتی ہے، تو ان کے اس قول کو بھی مانتی ہوگی کہ لائبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)۔“ بولی کہ: ”میں ان کے ہر قول کو مانتی ہوں، لیکن انھوں نے یہ تو نہیں فرمایا کہ لائبیہ بعدی (میرے بعد کوئی نبیہ نہ ہوگی)۔“
مستوکل ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ایک فانی کتاب فروخت ہو رہا ہے

جس میں بعض نہایت نادر کتا ہیں ہیں۔

ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے:

ام۔ عبد الحمید نعمانی

پوسٹ بکس ۴۹ - راولپنڈی

علمی جواہرات پکے ہیں

ایک انگریزی اردو کتابوں کی لائبریری فروخت کرتا ہے

جس میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار کتابیں بہت مفید

ایک ادبیٹر کے استفادہ کی ہیں۔ فہرست سے مزید

حالات معلوم کیجئے۔ یاد رکھنے کے بعد اسے قائم کیجئے۔

عثمان حمیدی - قاضی محلہ - بدایوں